اشفاق احمد
زاویہ ۳

زاویہ

(۳)

اشفاق احمد

فہرست

”سب دا بھلا، سب دی خیر“

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ہم زاویہ کے اپنے پروگراموں میں اس سے پہلے بھی ”دُعا“ کے حوالے سے گفتگو کرتے رہے ہیں۔ یہ اتنا طویل موضوع ہے کہ اختتام پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے قبل جب ایک پروگرام میں ”دُعا“ کے حوالے سے بات ہوئی تو اس کے بعد بہت سے لوگ اس موضوع پر بحث مباحثہ کرتے رہے اور مجھ سے بھی بار بار پوچھا گیا۔

میں اس کا کوئی ایسا ماہر تو نہیں ہوں اور یہی دُعا کے حقیقی اسرار سے مجھے آشنائی ہے لیکن ایک عام شخص کے بطور مجھے یہ تو معلوم ہے ہی کہ دُعا کی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے اگر اچانک بیٹھے بیٹھے یا راہ چلتے ہم پر کوئی افتاد آن پڑے تو اس سے پہلے کہ ہم کوئی تدبیر یا اس کے حل کے لیے ترکیب لڑائیں، مارے مُنہ سے فوراً دُعا نکلتی ہے کہ ”اے اللہ ایسا کر دے۔“

خواتین وحضرات میں سمجھتا ہوں کہ یہ انداز بھی کوئی غلط نہیں ہے۔ خدا سے محبّت اور اس پر یقین کا یہ بھی ایک انداز ہے کہ ہم ناگہانی صورتحال میں اسے ہی یاد کرتے ہیں، چاہے خوشی یا خوشحالی میں نہ یاد کریں۔

فرض کریں کہ ہم نے شیشہ پکڑا ہوا ہو اور ہمارے ہاتھ سے اچانک گرنے لگے تو جو بھی پاس کھڑا ہوا ہو گا وہ ضرور کہے گا "اللہ خیر۔"

اس کے بعد ڈانٹ ڈپٹ کرے گا کہ اندھا ہے، سنبھال کر اور مضبوطی سے کیوں نہیں پکڑتا۔ ہماری بڑی بوڑھیوں میں یہ بات بڑی تھی کہ ہر وقت خدا سے خیر طلب کرتی رہتی تھیں۔ یہ بھی دُعا کا ایک اپنا رنگ اور نرالا انداز ہے۔ گزشتہ پروگرام میں مَیں نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ دُعا کو بجائے اس کے ہم زبانی مانگیں، کسی کاغذ پر لکھ لیا جائے اور اسے ایک عرضی کی صورت میں لکھ کر رکھ لیا جائے تو بھی ایک اچھا انداز ہے۔ میرے سوچنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ پوری نماز میں یا عبادت میں ہم جب دُعا کے مقام پر پہنچتے ہیں تو ہم بہت تیزی میں ہوتے ہیں اور بڑے اُتاولے (جلد باز) ہو کر دُعا مانگتے ہیں۔ ایک پاؤں جوتے میں ہوتا ہے اور ایک زمین پر۔ ہم دُعا مانگ کر چلتے بنتے ہیں۔ اس طرح وہ تعلّق اور رشتہ جو خُدا اور انسان کا دُعا سے قائم ہوتا ہے وہ قائم نہیں ہو پاتا۔

ہمارے ایک بابا نے یہ ترکیب سوچی تھی کہ دُعا مانگتے وقت آدمی پورے خشوع و خضوع کے ساتھ، پوری توجّہ اور مکمل توجّہ کے ساتھ دُعا کی طرف توجّہ دے اور جو اس کا نفسِ مضمون ہو اُس کو زبان میں اُتار کر اسے تکلّم میں ڈھال کر آگے چلائے اور اس طرح سے اس بارگاہ میں عاجزی سے دُعا مانگے کہ انسان کے اپنے دل کو بھی علم ہو کہ وہ واقعی دُعا مانگ رہا ہے۔ دُعا اور انسان کا آپس میں بڑا پُرانا اور گہرا تعلّق ہے۔ میرے ایک دوست ہیں، انہوں نے مجھے بتایا کہ اس نے دُعا کاغذ پر لکھنے کی بجائے ایک اور کام کیا۔

میرے اُس دوست کا نام فضل صاحب ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ایک رجسٹر بنالیا ہے جس پر وہ اپنی دُعا بڑی توجّہ کے ساتھ لکھتے ہیں، ساتھ تاریخ کا اندراج کرتے ہیں۔ جتنی دُعا زیادہ جلدی قبول کروانا درکار ہوتی ہے اس کو اتنی ہی تفصیل سے اس رجسٹر پر درج کرتے ہیں اور دُعا کو مختلف رنگوں میں دیدہ زیب انداز میں لکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اس دُعا کو لکھتے وقت اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کریں جو اُس ہستی کو بھا جائے جس سے دُعا کی جا رہی ہے۔ فضل صاحب کے اس رجسٹر بنانے کا بڑا فائدہ تھا اور اُن کا تعلّق اپنی ذات اپنے اللہ کے ساتھ بڑا جُڑا ہوا تھا۔ اکثر و بیشتر ہم شکایت کرتے ہیں کہ جی بڑی دُعائیں

مانگی تھیں، قبول نہیں ہوئیں۔ اوجی ہماری تو دُعائیں پوری نہیں ہوتی ہیں۔

خواتین و حضرات! دُعا کا طریقہ بھی ایسے ہی ہے جیسے نلکا "گیڑ" کر پانی نکالنے کا ہے، جو ہینڈ پمپ یا نلکا چلتا رہے اور بار بار "گڑتا" رہے، اُس میں سے تو بڑی جلدی پانی نکل آتا ہے لیکن جو ہینڈ پمپ سوکھا ہوا ہو اور اس پر "گیڑے" جانے والی کیفیت بھی نہ گزری ہو تو چاہے آپ اس پر کتنا بھی زور لگا لیں اس میں سے پانی نہیں نکلتا۔ اس لیے دُعا کے سلسلے میں آپ کو ہر وقت اس کی حد کے اندر داخل رہنے کی ضرورت ہے کہ آپ ہر وقت دُعا مانگتے چلے جائیں اور مانگیں توجّہ کے ساتھ۔ جس طرح ہم نے کسی سے ادھار لینا ہو یا کسی نے ہم سے، تو ادھار لینے والے کو قرض خواہ بڑا یاد ہوتا ہے۔ اس کی صحت و سلامی اور وعدے پر پکا رہنے کے لیے دُعائیں کرتا ہے۔ دُعا کا طریقہ بھی اسی طرح کا ہونا چاہیے کہ ہم دُعا کو ہر وقت دل کے نہاں خانے میں رکھیں اور اپنے اللہ، اپنے پروردگار کے پیچھے پڑے رہیں کہ "یا اللہ ہمیں یہ چیز چاہیے اور بس.....!" اللہ میاں سے بضد رہیں اور خود کو اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیں۔

ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ "دُعاؤں کے دائرے سے کبھی نہ نکلا کرو۔ اگر اپنے لیے دُعا نہیں کر رہے اور آپ پر خدا کی بڑی مہربانیاں ہیں تو خدا کے لیے

دوسروں کے لیے دُعا کرتے رہا کریں۔"

بابے کہتے ہیں کہ "جو شخص کسی کو دھوکہ دیتا ہے حقیقت میں خود کو دھوکہ دے رہا ہوتا ہے لیکن وہ خیال کرتا ہے کہ وہ کسی اور کو دھوکہ دے رہا ہے اور جو کسی کی خیر اور بھلائی مانگ رہا ہوتا ہے وہ حقیقت میں اپنی بھلائی چاہ رہا ہوتا ہے۔" کیونکہ دُعائے خیر کرنے والا یا دھوکہ کرنے والا بھی اس دنیا سے جُڑا ہوا ہے۔

خواتین و حضرات! دُعا خط و کتابت نہیں ہے۔ ایک چٹھّی نہیں ہے۔ عرضی خُدا کے حضور ڈال کر مطمئن ہو کر بیٹھنے کا اور اس ذات پر اعتماد اور بھروسے کا نام ہے۔

کچھ ہماری دُعائیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اگر قول ہو جائیں تو ہمیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن ہم خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ آپ نے ہماری دُعا قبول نہیں کی۔ بلکہ آپ جب بھی دُعا کریں، اس میں یہ جملہ ضرور شامل کریں کہ "اے اللہ ہمیں وہ عطا فرما جو ہمارے حق میں بہتر ہے۔"

ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا ہمیں پھولوں سے بھرا ٹوکرا عطا کرنے کے موڈ میں ہوتا ہے اور ہم صرف ایک پھول کی ضد لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔

آپ نے گلی میں شام کو گزرنے والے ان فقیروں کو صدا لگاتے ضرور سُنا ہو گا کہ "کُل عالم دا بھلا، کُل عالم دی خیر۔" یہ اندازِ دُعا ہے جو سب سے بھلا ہے کیونکہ کُل عالم میں آپ بھی شامل ہیں۔ ہم بھی ایسے ہیں کہ پھولوں کے ٹوکرے کو ٹھوکر مار رہے ہوتے ہیں اور ایک پھول کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ اپنی دُعا میں اللہ تعالی کی رحمت کی شمولیت کا تقاضا ضرور کریں۔ دُعا کریں کہ اے اللہ میرا کچھ تقاضا بشری ہے، مجھے فلاں چیز چاہیے لیکن اس میں آپ کی رحمت بھی شاملِ حال ہونی چاہیے اور دُعا کی قبولیت اس انداز میں ہو کہ وہ آس پاس کے لوگوں کو بھی پسند آئے۔

اگر آپ خدا سے دُعا کریں کہ اے اللہ جو چاہتا ہے ہمیں عطا کر، وہی ٹھیک ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ آپ کو فقیری عطا کر دے جبکہ آپ کی سی ایس ایس افسر بننے یا بڑا افسر بننے کی خواہش ہے۔ آپ ڈپٹی کمشنر کی جگہ ٹاؤن ہال میں کلرک لگ جائیں۔ اللہ سے یہ دُعا کریں کہ اے اللہ مجھے ڈپٹی کمشنر بھی بنا دے اور پھر ویسا نیک بھی رکھ کہ رہتی دنیا تک لوگ مجھے یاد کریں کہ باوصف کی اس کو ایک بڑی مشکل درپیش تھی، بڑے

اختیارات حاصل تھے لیکن وہ نیک اور دیانت دار ضلع ناظم تھا اور وہ اپنے منصب

پر پورا اُترتا ہے۔ ایک بات آپ ہمیشہ ذہن میں رکھیں اور مجھے یہ بات میرے بابوں نے بتائی ہے۔ میں تو اس بات پر اس طرح سے یقین نہیں کر پایا لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ پڑھے لکھے اور خدا کی ذات پر بھروسہ کرنے والے بچّے ہیں۔ آپ ضرور اس پر یقینِ کامل رکھیں گے کہ "دُعا بذاتِ خود ایک بڑی نعمت اور دولت ہے۔ یہ معمولی سا لفظ اپنے اندر بڑی وسعتیں سموئے ہوئے ہے۔"

خواتین و حضرات! دُعائیں ایک مناسب اور ٹھیک وقت پر قبول کی جاتی ہیں۔ آپ دُعا کو خدا کے لیے کبھی معمولی نہ سمجھیں۔ یہ پروردگار سے رابطے کا ایک سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

میں اور ممتاز مفتی ایک بار ایک ایسے سفر پر گئے جب ہمیں ایک صحرا سے گزرنا پڑا۔ ہمیں وہاں بڑی مشکل ہو گئی۔ نہ پانی تھا، نہ کھانے کو کچھ اور۔۔۔۔ ممتاز مفتی مجھے کوسنے لگا اور میں ان سے کہنے لگا کہ میں نے نہ کہا تھا کہ یہ راستہ اختیار نہ کرو۔ بہرحال ہم چلتے گئے اور اس جانب چلے جس طرف دُور ایک جھونپڑی سی بنی دکھائی پڑتی تھی۔ ہم تھکے ہارے اس جھونپڑی میں پہنچے تو وہاں ایک سندھی ٹوپی پہنے کندھوں پر شال ڈالے ایک بڑی عُمر کے شخص بیٹھے تھے۔ اُن کی خستہ حالی تو ہم پر عیاں ہو رہی تھی لیکن اُن میں ایک عجیب طرح کا اعتماد تھا۔ ہمیں

دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دبا دبا کر گلے ملے۔ کنستر سے پانی کا لوٹا بھرا ہمارے مُنہ ہاتھ دُھلائے۔ اُن کی جھونپڑی میں ایک صف سی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ہمیں ایسے بٹھایا کہ جیسے ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔ ہم نے اُن سے کہا کہ بڑے میاں آپ اس بیابان میں کیسے رہ رہے ہیں؟

وہ بولے کہ "کیا خدا نے اپنی مخلوق سے رزق کا وعدہ نہیں کر رکھا؟"

ہم نے یک زبان ہو کر کہا کہ "ہاں کر رکھا ہے۔"

ہم نے اس سے دریافت کیا کہ "آپ کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟"

وہ کہنے لگا کہ "اس کے خیال میں اس کا ذریعۂ معاش ایک دوسرا آدمی ہے۔ میں ہر نماز کے وقت اُٹھتے بیٹھتے اپنے پروردگار سے یہ دُعا کرتا ہوں کہ اے میرے رب مجھے کبھی اس کیفیّت میں نہ رکھنا کہ میں اکیلا کسی وقت کھانا کھاؤں۔ آپ مجھ پر اپنی رحمت کرنا اور جب بھی کھانے کا وقت ہو تو دوسرا تیسرا بندہ بھی ہو جس کے ساتھ بیٹھ کر میں کھانا کھاؤں۔"

اس نے بتایا کہ اسے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی اس نے اکیلے کھانا کھایا ہو۔ کھانے کے وقت کوئی نہ کوئی انسان ضرور آجاتا ہے۔ آج کھانے کا وقت نکلا جا رہا تھا اور میں

پریشان تھا کہ آج میں اکیلا کیسے کھانا کروں گا۔ اس نے دو تین سوکھی روٹیاں نکالیں۔ گھڑے کا پانی لایا اور کھانا شروع کر دیا۔ میں نے ممتاز مفتی کو کہنی ماری کہ "سودا نکالو۔"

ہم نے چلتے وقت بھُنے ہوئے چنے رکھ لیے تھے کہ وہ بوقتِ ضرورت کام آئیں۔ اس نے روٹیاں نکالیں۔ ہم نے چنے نکالے اور سب نے مزے سے باتیں کرتے ہوئے کھانا کھایا۔

خواتین و حضرات! آپ یقین کریں کہ اس کھانے میں ایک روٹی بچ گئی اور ہمارے چنے بھی کافی سارے بچ گئے اور ہم سیر شکم ہو گئے۔ اس شخص نے بتایا کہ یہاں سے شہر زیادہ دور نہیں ہے۔ چند کوس کے فاصلے پر ہے۔ یہاں سے اُونٹ چرانے والوں کے قافلے گزرتے ہیں۔ آپ اُن کے ساتھ شہر چلے جایئے گا۔ ہم نے اپنے باقی چنے وہیں چھوڑ دیئے اور ایک قافلے کے ساتھ شہر پہنچ گئے۔

بچّو! یہ بھی دُعا تھی، ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے کے رزق کے باعث اس شخص کو بھی کھانا میسّر ہوتا ہو۔ ممتاز مفتی مجھ سے کہنے لگا کہ یہ شخص بڑا سیانا ہے۔ کسی کے لیے دُعا مانگتا ہے اور کھانا خود مزے سے کھاتا ہے اور ہم بس اپنے لیے دُعا

کرتے ہیں پھر بھی بھوکے مرتے ہیں (مُسکراتے ہوئے)۔

خواتین و حضرات! دُعا کے حوالے سے ہم اپنے آئندہ پروگراموں میں بھی بات کرتے رہیں گے جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ بڑا طویل موضوع ہے اور ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اب مجھے اُمّید

ہے کہ آپ بھی "سب دا بھلا سب دی خیر" کے فارمولے پر کاربند رہیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

ناشُکری کا عارضہ

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

کچھ عرصے سے میرے دل پر ایک عجیب طرح کا بار ہے جو کم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ اس کے لیے میں نے بڑی تدبیریں کیں، خیال کو زبان سے جھٹکا لیکن وہ خیال، یا آپ اسے مرض کہ لیں، ایسا ہے کہ دامن گیر ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میرا وہم اور دکھ یہ ہے کہ ہم ناشُکرے کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔

ہماری زندگی پر ناشُکرا پن کا غلبہ کیوں ہوتا جا رہا ہے۔

جس کے پاس گاڑی ہے، وہ بڑی گاڑی یا ہیلی کاپٹر کی تمنّا میں پریشان ہے۔ سائیکل وال اسکوٹر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ غرض کہ کچّی سڑک پر چلنے والا پکّی سڑک پر چلنے کی خواہش میں آہیں بھرتا ہے۔ کسی زمانے میں جب ہم جوان تھے اور سکول یا کالج میں پڑھا کرتے تھے، ایسی صورتحال نہیں تھی۔ اس پریشانی کو اور اسے میں تو روح کی بیماری کہوں گا، جسے ہم نے خود ہی بڑھا رکھا

ہے اور ہم صبح سویرے نہار مُنہ اس بیماری کو باقاعدگی سے پانی دیتے ہیں اور اس کی پرداخت کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ "جی ناشُکرے تو نہیں ہیں لیکن اگر گھر میں سوزوکی کی جگہ سِوک آ جائے یا ہنڈا اکارڈ آن کھڑی ہو تو زیادہ اچھا ہے۔" ہم یہ کبھی نہیں کہتے کہ سوزوکی آئی، یہ ہماری خوش قسمتی ٹھہری کیونکہ ہم سائیکل اور موٹر سائیکل والوں سے تو زیادہ ٹھاٹھ میں ہیں۔

میں یا میری عُمر کے بُڈھے جو کسی زمانے میں شکر گزاری سے وابستہ تھے اور خوش تھے اب دیکھا دیکھی اس بیماری کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگر دورانِ سفر (اور سفر جو مجھے آئے روز کرنے پڑتے ہیں اور میرے من پسند ہیں) کبھی گاڑی خراب ہو جائے تو میں مُنہ میں جانے کیا سے کیا کچھ کہہ جاتا ہوں اور پھر جب خیال آتا ہے کہ کیا کہہ بیٹھا، فوراً کہتا ہوں "یا اللہ یہ تو میں ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ حالانکہ میں دل سے تیرا شکر گزار بندہ ہوں۔"

یہ بیماری ایسی ہے جو ہماری روحوں اور وجودوں پر بُری طرح سے اثر انداز ہو رہی ہے اور ہمارے آگے بڑھنے کے راستے مسدود کر رہی ہے۔

میرا ایک دوست ہے۔ وہ اچھا خاصا افسر ہے۔ گھر میں دنیا کی ہر آسائش میسّر ہے

پھر بھی قسمت پر نالاں رہتا ہے اور کہتا ہے کہ بس اشفاق صاحب کیا کریں۔ آج کل کے دَور میں تو زندہ رہنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ بڑے مسائل ہیں۔ میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ کیا مسائل ہیں؟ تو جواب دیتے ہیں کہ اگر آپ کو گنوانا شروع کر دیں تو ایک وقت لگ جائے۔ لیکن آج تک انہوں نے بتایا نہیں کہ انہیں کیا مسئلہ درپیش ہے۔

اس کے برعکس ہمارا ایک دوست ہوا کرتا تھا۔ وہ مہنگی اور خوبصورت گاڑیوں کی تلاش کرتا رہتا۔ اُسے جیسے ہی کوئی مہنگی گاڑی کھڑی نظر آتی وہ اس کے قریب چلا جاتا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اسے محبّت سے ہاتھ لگاتا اور کہتا "کیا خوبصورت گاڑی ہے، اس پر بیٹھنے والا کتنا خوبصورت لگتا ہو گا۔"

یہ تو اُس کے سوچنے کا انداز تھا۔ اس ناشکرے پن سے یاد آیا۔ ہم ایک اور Problem سے بھی دوچار ہیں۔

آپ کی بات نہیں کرتا۔ مجھے ہی لے لیں، میں نہ گرمی سے مطمئن ہوتا ہوں، نہ سردی مجھے بھلی لگتی ہے۔ گرمی ہو تو ہر وقت کہا جا رہا ہوتا ہے کہ جی اس بار تو گرمی نے کڑاکے نکال دیئے۔ پریشان کر رکھا ہے۔ سردی ہو تو کہا جاتا ہے کہ

جی اتنی سخت سردی میں غریبوں کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ بڑی جان لیوا ہے۔ اس سے تو گرمی ہی بھلی۔ کچھ لوگ بارش سے بھی نالاں رہتے ہیں۔ کہیں گے یہاں کیا ضرورت تھی۔ بارش فصلوں پر پڑے، وہاں اِس کی ضرورت ہے۔ شہروں میں تو سوائے کیچڑ کے اس کا کوئی کام نہیں۔

ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ بارش تو بس پوش علاقوں کے لیے ہے۔ بارش ہوئی گھر دُھلے اور سارا پانی آن کی آن میں بہہ گیا۔ ایک بار بارش کے لیے وہی صاحب دُعا مانگ رہے

تھے جو بارش کے خلاف کوسنے دیا کرتے تھے۔

میں نے اُن سے کہا، یار آج کیا بات ہے، تو کھسیانے ہو کر کہنے لگے "جب بارش اچھی نہیں لگتی تو کہتا ہوں نہیں ہونی چاہیے۔ آج اچھی لگ رہی ہے تو اس کے لیے دُعا مانگ رہا ہوں۔"

خواتین و حضرات! یہ ساری ناشکری کی باتیں ہیں۔

میں اپنے اس گاؤں میں جہاں میں نے بچپن گزارا تھا، وہاں کی ایک بات میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ وہ بھی شاید ناشکری کے ہی زمرے میں آتی ہے لیکن جب

میں بچّہ تھا تو تب محظوظ ہوا کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک کراڑ ہوتا تھا۔ یہ کراڑ ایک ذات ہے۔ اس کے پاس ایک بھینس تھی اور بھینس کا چھوٹا سا ننھا بچّہ۔ جب وہ بچّہ پیدا ہوا تو ہم سب بچّے بڑے چاؤ سے اسے دیکھنے گئے۔ اب وہ کراڑ کیا کرتا کہ جب اُس نے بھینس کا دُودھ دوہنا ہوتا یا دُودھ دوہنے کا وقت ہوتا تو وہ اس کے بچّے کی رسّی کھول دیتا۔ وہ بچّہ جھٹ سے اپنی ماں (بھینس) کے تھنوں سے ٹکریں مارنے لگتا اور ڈھونڈ ڈھانڈ کے تھن مُنہ میں ڈال کر دُودھ پینے لگتا۔ اب جیسے ہی وہ کراڑ دیکھتا کہ بھینس کے تھنوں میں دُودھ بھر گیا ہے تو وہ اُس کے بچّے کو زبردستی کھینچ کر پھر باندھ دیتا اور خود برتن جسے "ڈوہنی" کہتے ہیں اس میں دُودھ دوہنے لگتا۔

اس وقت تو ہم اس Situation کو دیکھ کر انجوائے کرتے تھے کہ کس طرح بچّے اور کراڑ میں مقابلہ ہو رہا ہے لیکن آج جب میں کچھ بڑا ہو گیا ہوں۔ میں وہ سارا واقعہ یاد کر کے دُکھی ہو جاتا ہوں۔

خواتین و حضرات! اس کراڑ کا وہ عمل بے شک ناشُکری اور ظلم پر مبنی تھا۔ وہ بھینس کے بچّے سے اُس کے حصّے کا بھی دُودھ چھین لیتا تھا۔ وہ خدا کی اِس مہربانی پر شکر ادا نہیں کرتا تھا کہ اسے ایک دُودھ دینے والی بھینس کا مالک بنایا ہے بلکہ وہ

بھینس کے بچّے کے حصّے کے دُودھ پر بھی قبضہ کر لیتا تھا اور یہ ناشکری والا فعل تھا۔

جو قومیں تباہ و برباد ہوئیں وہ متکبّر تھیں۔ اپنی اچھائیوں پر بھی اِترتی تھیں اور برائیوں پر بھی فخر کرتی تھیں۔ خدا کی نعمتوں کو اپنی محنت کا صلہ قرار دیتی تھیں۔ یہ بات کرنے کا مقصد کسی کو ڈرانا مقصود نہیں، بلکہ آپ کو اپنے آپ کو تنبیہ کرنا مقصد ہے۔

آپ صرف اللہ کی مہربانیوں کا شکر ادا کیا کریں بلکہ جو آپ پر کوئی احسان کرے اس کا شکریہ ادا کیا کریں۔ اس سے معاشرے کے کئی بگاڑ ختم ہو سکتے ہیں۔

اگر بس میں آپ کو کوئی سیٹ دے تو آپ بجائے یہ سوچنے کہ ہو سکتا ہے اِس شخص نے میری شخصیت سے مرعوب ہو کر سیٹ چھوڑ دی ہے یا اِس وجہ سے راستہ چھوڑ دیا ہے کہ جی اشفاق صاحب بہت بڑے دانشور اور رائٹر ہیں۔ یہ سوچ کر خیال کریں کہ یہ اُس کی مہربانی اور بندہ نوازی ہے کہ اُس شخص نے سیٹ چھوڑ دی یا راستہ دے دیا اور اس پر شکریہ ادا کریں۔

پیارے بچّو! اگر یہ روایت ڈال دی جائے، نہ صرف محبّت کے سلسلے پروان

چڑھیں بلکہ کئی

ایک مسائل ختم ہو جائیں۔ ہم سارے موسموں سے اس لیے پیار کرنا شروع کر دیں کہ گرمی سے گندم پکتی ہے۔ چونسا اور لنگڑا پک کر آتا ہے۔ یہ کس قدر مہربان موسم ہے۔ سردی میں مونگ پھلی کے نظارے ہیں۔ بادام، چلغوزہ تیار ہو گا۔ بارش برسے گی تو دریاؤں، نہروں میں پانی آئے گا۔ کھیت سرسبز ہوں گے۔ خوشحالی آئے گی، کہیں کہ خزاں کتنی اچھی ہے، بہار کی نوید لاتی ہے۔

ہم بجائے کسی بات کو نیگیٹو لینے کے پازیٹو لینا شروع کر دیں اور آدھے خالی دریا کو آدھا بھرا دریا کہنا شروع کر دیں تو جو بہتری ممکن ہے ہمارے کئی منصوبوں اور سکیموں سے بھی ناممکن ہے۔

جب میں اٹلی میں درس و تدریس کے لیے گیا ہوا تھا تو وہاں میرے ایک Colleague نے مجھے ایک بڑی خوبصورت بات کہی۔ وہاں ہم لائبریری میں بیٹھے انہی پازیٹو اور نیگیٹو رجحانات پر بات کر رہے تھے۔ کہنے لگا اشفاق صاحب ہمارا اندازِ فکر ٹھیک نہیں ہے۔ ہر اچھی بھلی چیز کو بھی بُری بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ اس حوالے سے مجھے London Born شاعر John Milton کا یہ مصرعہ

Quote کرنے لگا کہ واہ واہ کیا بات ہے۔ اور اس نے وہ لائن پڑھی:

Better to reign in hell than serve in heaven

(جنّت میں غلامی سے دوزخ کی سرداری بہتر ہے)

اُس نے کہا کہ ہم سے شیطان کی Approach زیادہ بہتر ہے اور وہ ایک انتہائی منفی بات کو بھی مثبت انداز میں سوچتا ہے۔

(یہ لائن برطانوی شاعر جان مِلٹن کی مشہورِ زمانہ کتاب Paradise Lost کی ہے۔ جو شیطان سے منسوب کی گئی ہے)

ایک روز ہم ڈیرے پر بیٹھے ہوئے تھے اور میں نے باباجی سے پوچھا کہ شُکر کیا ہوتا ہے۔ مُسکرائے اور کہنے لگے:

"شُکر وہ ہے جو نہیں کیا جاتا ہے۔" کہنے لگے:

کبھی اپنی بُوتھیاں (شکلیں) دیکھی ہیں۔ تم سے کئی ریڑھی والے، پھل فروش اور مزدور خوبصورت اور قوّی جسم کے مالک ہوں گے، لیکن اس کے باوجود تم ان سے بہتر ماحول میں رہتے ہو۔ اچھا کھاتے ہو، پہنتے ہو۔

یہ شُکر والی بات ہے لیکن اس سب کے باوجود شُکر نہیں کیا جاتا۔

فرمانے لگے (اُس دن باباجی کچھ زیادہ ہی موج میں تھے)

مومن وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میلے اور گندے ہوں اور اس کا دل صاف اور شفاف ہو۔ وہ ہر حال میں اللہ کا تہہِ دل سے شُکر گزار ہو۔

خواتین و حضرات! باباجی کی وہ بات سُن کر جب میں نے اپنے گریباں میں جھانکا تو سوائے خداوند تعالیٰ سے شکووں کے کچھ نہ تھا۔ شُکر گزاری نام کی کوئی چیز دُور دُور تک نہ تھی۔ میں اپنی دانش، عقل اور پڑھائی کے زُعم میں ہی کُبڑا ہوا جا رہا تھا۔ سجدۂ شُکر کے لیے میری کمر میں خم نہیں تھا۔

میں نے تہیّہ کیا کہ اب تو میں اللہ کا شُکر گزار بندہ بن کر ہی رہوں گا لیکن بچّو! یہ ممکن نہیں ہو سکا اور یہ خواہش میرے دل کے اندر ہی اندر سے باہر نکل کر عملی شکل اختیار نہیں کر پائی اور میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب میں نے بس اللہ کا شُکر گزار بندہ بن جانا ہے۔ اچانک لائٹ چلی گئی اور میں اپنے آپ سے کیا ہوا سارے کا سارا وعدہ بھول گیا اور میرے ذہن میں یہ شکوہ آیا کہ واپڈا والوں کو سوائے بجلی بند کرنے کے کوئی کام نہیں۔ اتنی گرمی ہے اور ایسے میں بجلی بند

کرنے کا کیا جواز بنتا ہے۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ بجلی کی اچانک بندش کسی انسان کے لیے باعثِ رحمت بنی ہو اور کسی کے جسم کو کرنٹ نے چھوا ہو اور بجلی کی اچانک بندش نے وہ خوبصورت زندگی بچادی ہو اور ہو سکتا ہے وہ بچنے والا شخص پورے خاندان کا واحد کفیل ہو اور کتنا خُدا ترس ہو۔

لیکن ناشُکری کی بیماری ہمارے وجود میں ایسے سرایت کر چکی ہے اور اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ ہم انہیں کاٹنے سے عاجز ہیں۔

شکریے میں وہ مغرب والے جن کو میں مثال کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہتا، وہ ہم سے آگے نکل گئے ہیں۔ آپ کسی فلم میں یا اُن سے مل کر دیکھ لیں، وہ آپ کو اتنی بار Thank You کہیں گے کہ آپ خوشی سے سرشار ہو جائیں گے۔ راہ چلتے ان کا کندھا ذرا بھی آپ سے ٹکرا جائے تو باقاعدہ Sorry کہیں گے اور معمولی سی مہربانی پر فوراً Thank You کہیں گے۔

یہ اچھا انداز ہے۔ اُمّید ہے آج کے بعد آپ اور میں تھوڑی سی کوشش ضرور کریں گے کہ شُکر گزار بندوں کی لِسٹ میں شامل ہو جائیں۔ اگر زیادہ نہیں تو تھوڑے ہی۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

بابا قُطبہ

جو لوگ شمالی علاقہ جات میں جاتے رہتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ وہاں صبح کس قدر خوبصورت ہوتی ہے۔ آپ میں سے اکثر مری اور نتھیا گلی کو ضرور گئے ہوں گے۔ بارش سے پہاڑوں کی چوٹیاں دُھلی ہوئی ہوتی ہیں اور صبح کی کرنیں جب اُن پر پڑتی ہیں تو سبز درختوں کے صاف سُتھرے پتّے ایسے لگتے ہیں جیسے ابھی ابھی انہیں ٹہنیوں پر خوبصورتی سے جوڑا گیا ہے۔ شمالی علاقہ جات میں جانے کا شوق ہمیں کب چڑھا اس کا تو علم نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ہمارے دوست ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، اور دیگر احباب جب بھی دنیا کے کاموں سے اُکتا جاتے اُدھر ہی کا رُخ کرتے۔ وہاں کے لوگ بڑے

معصوم ہیں۔ پیار کرنے والے اور محبّتیں بانٹنے والے۔ ہمیں اُن لوگوں نے اس قدر پیار دیا ہے کہ لوٹانا ناممکن ہے۔ جہاں ہمیں پیار ے انتا حد تک ملا وہاں خوبانیاں سیب بھی مفت ہی مل جایا کرتے تھے۔ مجھے شمالی علاقہ جات کی

خوبصورت وادیوں اور صبح کی یاد اس بات سے آئی کہ گذشتہ دِنوں لاہور میں خوب بارش ہوئی اور ایک دن جب میں فجر کی نماز پڑھ چکا اور صبح سیر کا ارادہ کرنے لگا تھا کہ بارش کی ننھی مُنّی پھوار پھر سے پڑنے لگی۔ میں تھوڑی دیر برآمدے میں کھڑا اُس سے لطف اندوز ہوتا رہا اور نے تھوڑی تھوڑی بھیگنے کی کوشش بھی کی اور بار بار پیچھے مُڑ مُڑ کر بھی دیکھتا رہا کہ بانو (بانو قدسیہ) نہ دیکھ لے کیونکہ اس طرح سے اسے اپنا بھاشن سُنانے کا موقع مل جائے گا اور اس حالت میں دیکھ کر فوراً کہے گی کہ آپ کو کیا ہو گیا۔ اپنی صحت کا تھوڑا تو خیال رکھا کریں۔ خیر میں واپس کمرے میں آ گیا۔

اپنی بلّی کنبر کو پیار کرتا رہا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ محلّے میں شادی ہے اور مجھے وہاں ضرور جانا ہے۔ اب تھوڑی تھوڑی صبح روشن ہو رہی تھی اور وہ مجھے اونچی، پُر شکوہ چوٹیوں والے نرالے برف پوش چوٹیوں والے پہاڑوں کے علاقے کی صبح کی یاد دِلا رہی تھی۔

خواتین و حضرات! جب میں شادی میں گیا تو مُوڈ بڑا اچھا تھا اور میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح تیّاری شیاری کر کے گیا تھا۔ شادی کی اس تقریب میں کئی مانگنے والے اور جُگتیں لگا کر پیسے لینے والے بھی آئے ہوئے تھے جنہیں ہم عام زبان

میں ’’بھنڈ‘‘ کہتے ہیں۔ آج کل تو ہمارے ہاں ان کا رواج ذرا کم ہو گیا ہے اور لوگ شادی ہالوں میں شادی کی تقریبات کرتے ہیں اور انہیں ہالوں کے اندر گھسنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

پہلے ایسا ہوتا تھا کہ ان کے بغیر شادی کی خوشیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں۔ یہ اپنے مخصوص انداز میں ویلیں کہا کرتے تھے۔ ’’ویل ویل سہرے گانے والے دی ویل‘‘ ویل وہ پیسے ہوتے تھے جو لوگ دولہے کے سر پر وار کر اُنہیں دیتے تھے۔ پھر جب بارات وغیرہ کھانا کھا لیتی تو ان بھنڈوں وغیرہ کو بھی کھانا ملتا اور یہ بارات کے کھانا کھانے کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

جب یہ لوگ باہر بیٹھے انتظار کر رہے تھے تو میں اُٹھ کر اُن کے قریب بیٹھ گیا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ مجھ میں ذرا تجسس کی حِس موجود ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ لوگ کب سے یہ کام کر رہے ہو۔

ایک بھنڈ نے بتایا کہ ’’ان کا کام جدّی پُشتی (باپ دادا کا) ہے۔‘‘

اس نے جواب دیا کہ ’’صاحب دال روٹی چل جاتی ہے۔‘‘

میں نے کہا کہ ’’تمہاری عُمر کافی ہے۔ بال بھی سفید آ چکے ہیں لیکن میں دیکھ رہا

ہوں کہ تم کافی لوگوں کی نسبت خوش خوش ہو۔ تمہارے چہرے سے نہیں لگتا کہ تم زندگی سے مایوس ہو۔ کیا یہ مصنوعی ہے۔"

وہ بولا "صاحب جی ہنس کر یا رو کر زندگی تو گزرانی ہے۔ اگر روئیں گے تب بھی گزرے گی، ہنسیں گے تب بھی۔ اگر اس نے اپنی مرضی سے ہی گزرنا ہے تو پھر رونا کس بات کا۔"

خواتین و حضرات اُس کی بات سُن کر مجھے لگا کہ یہ میرے سمیت ان لاکھوں لوگوں سے خوش قسمت ہے جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ملنے کا روگ لیے بیٹھے رہتے ہیں۔

اب مجھے وہ پہلے سے زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔ میں نے کہا کہ "تمہارے کتنے بچّے ہیں۔"

وہ کہنے لگا "صاحب اللہ جنّت نصیب کرے، بیوی فوت ہو چکی ہے۔ دو بیٹے ہیں۔ اُن کی شادی ہو چکی ہے اور وہ بھی اسی پیشے سے منسلک ہیں۔ ایک بیٹی جوان ہے لیکن اس کی شادی نہیں کی۔"

میں نے کہا کہ "یہ تو تمہارا فرض ہے کہ اس کی شادی کرو (اب میں اپنی دانست

میں کچھ زیادہ ہی دانا اور سیانا بن رہا تھا)۔"

وہ گویا ہوا۔

صاحب جی ! بیٹی کی شادی پیسوں سے ہوتی ہے۔ چاہے کوئی خود کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو اُس سے جہیز مانگا جاتا ہے لیکن صاحب جی میں پھر بھی خدا کے گھر سے مایوس نہیں۔ اس کی شادی بھی خدا نے چاہا تو ہو ہی جائے گی۔ میرا خدا پر بھروسہ ہے۔

میں اس کی بات سُن کر روہانسا سا ہو گیا اور اپنے ہی آپ پر کُڑھنے لگا کہ وہ شخص جو نہ ایم اے پاس تھا اور نہ ہی اس نے کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری لے رکھی تھی۔ اس کا اپنے خدا پر کس قدر ایمان اور یقین پختہ تھا اور میں جو ہوں، دنیا جہاں کی کتابیں پڑھ کر بھی اس سے انتہائی پست درجے پر ہوں۔ اس کی ذمّہ داری مجھ سے زیادہ اس خدا پر ہے جس نے مجھے اسے اور سب کو پیدا کیا ہے۔ میں کبھی زیادہ متفکّر نہیں ہوا۔

میں نے زندگی بھر بڑی شادیاں دیکھی ہیں اور میرے دل سے ہمیشہ کوئی دُلہن دیکھ کر اس کے نصیبوں کے اچھے ہونے کی دُعا نکلی ہے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ میری اس بیٹی کے نصیب اچھے نہ ہوں۔

جب ہم آزاد کشمیر ریڈیو میں کام کیا کرتے تھے، وہاں ہمارے پاس ایک ملازم قطب دین ہوتا تھا۔ اُس کی عمر کوئی ۶۰ کے قریب تھی۔ ہم اسے بابا قُطبہ کہا کرتے تھے۔ وہ بڑا اچھا بابا تھا۔ ہمارا بڑا خیال رکھتا۔ ہمارے لیے پانی گرم کرتا اور چائے پانی کا بڑا خیال رکھتا۔ کھلے آستینوں کا کُرتا پہنتا تھا جو شاید اس کے پاس واحد تھا یا پھر کوئی شاید دوسرا بھی ہو گا۔ وہ اپنی موج میں مست رہتا۔ بات بہت کم کیا کرتا تھا لیکن جب کرتا تھا تو ہم سب کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ اس نے کبھی ہم سے رقم وغیرہ کا تقاضا نہیں کیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ شاید وہ پیسے وغیرہ مانگنے سے شرماتا ہے یا اس کے دل میں یہ بات ہے کہ اگر اُس نے تنخواہ سے بڑھ کر رقم کا تقاضا کیا تو ہم ناراض ہو جائیں گے۔ اس لیے ہم جب بھی لاہور آتے یا مارکیٹ جاتے تو اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی چیز لے لیتے اور یہ ذہن میں ہوتا کہ وہ خوش ہو جائے گا اور ہماری خدمت کا بار محسوس نہیں کرے گا۔ ایک عید پر جب ہم واپس آنے لگے تو ہم نے سوچا بابے قُطبے کو اپنی روانگی بارے بتا دیتے ہیں اور اُسے دفتر کی چابیاں وغیرہ بھی دے دیتے ہیں۔ گو کچھ ضروری سٹاف نے تو وہاں رہنا تھا لیکن زیادہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ ابھی ہم یہ سوچ رہے تھے کہ

اسے کیا گیا ہدایت دینی ہے تو بابا قُطبہ دوڑتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور اس نے کہا" مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ چلے ہی نہ گئے ہوں۔ "اُس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ اس نے وہ ہماری طرف بڑھایا اور کہنے لگا" صاحب جی ناراض نہ ہونا یہ تھوڑی سی چیزیں ہیں، یہ آپ میری طرف سے ساتھ لے جایئے گا اور آپ لوگوں کے بچّوں کے لیے ہیں۔"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا" بابا یہ ساری چیزیں تو کہاں سے لایا۔"

وہ کہنے لگا" میں سال بھر اپنی تنخواہ سے تھوڑا تھوڑا بچاتا رہا۔ اس سے کچھ پیسے بن گئے تو سب کے لیے کچھ نہ کچھ لے آیا۔ آپ ساتھ لے جائیں گے تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

آپ لوگ یقین کریں ہمیں وہ عام سا کام کرنے والا بابا قُطبہ ہم سب سے بڑا لگا۔ دل کے حوالے سے، جذبات اور محبّت کے حوالے سے، اسے شاید خدا نے ہم سب سے بڑے دل اور مرتبے سے نوازا تھا اور وہ لطیف قلبی میں ساتویں آسمان پر تھا۔ عید چھوٹی ہو یا بڑی ہم سب اسے اپنے ملنے ملانے والوں تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ خاص کر بڑی عید پر تو گوشت سے سال بھر کے لیے ٹھنڈی مشینیں

(فریج) بھر لی جاتی ہیں اور یہ رواج بڑا عام ہے کہ گوشت انہیں کے گھر بھیجنا ہے جہاں سے آیا ہے۔ حالانکہ حکم یہ ہے کہ قربانی کے گوشت کے باقاعدہ حصّے کیے جائیں۔ ایک حصّہ رشتہ داروں اور احباب، دوسرا غربا مساکین اور ایک مقدار اپنے لیے رکھی جائے لیکن اس طرح نہیں ہوتا۔ ہمارے گھروں میں عورتیں کہتی ہیں "اسیں اوہناں نوں گوشت کیوں دیہے، اوہناں کیہڑا سانوں بھے جیا اے۔" گھر کے ساتھ گھر میں ہمسائے اور محلّے اور قرب وجوار میں ایسے بے شمار لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے قربانی نہیں کی ہوتی لیکن پتہ ہونے کے باوجود انہیں حصّہ نہیں دیا جاتا۔

ایسے تو نہیں ہوئی نا قربانی!

بڑی عید پر تو باقاعدہ مقابلہ ہوتا ہے کہ بھئی ساتھ والے جیسا بکرا لے کر آتے ہیں۔ اس سے بڑا ہم لے کر آئیں گے نہیں تو ناک کٹ جائے گی۔

خواتین و حضرات! ہم کس سمت میں چل پڑے ہیں، جو ہمیں احکامات دیئے گئے ہیں کیا ہم اُن کی پیروی کر رہے ہیں۔ مجھے صومالیہ میں پڑنے والے قحط کا خیال آ رہا ہے جس سے لاکھوں لوگ متاثر ہوئے تھے۔ ہزاروں بھوک پیاس سے

نڈھال ہو گئے۔ جیتے جاگتے انسان ہڈیوں کے ڈھانچے بن گئے تھے۔ وہاں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ پیارے پیاروں کے ہاتھوں میں جان دے رہے تھے اور دنیا خاموش تھی۔

ساری دنیا میں معمول کے مطابق کھیل تماشے جاری تھے۔ ویسے ہی ٹریفک چلتی، مارکیٹیں کھلتی تھیں اور دنگے فساد ہوتے تھے۔ صومالیہ میں بھوکے پیاسے لوگ جیتے جی ''ممیوں'' کی شکل اختیار کر گئے۔ وہ قحط نہیں تھا ہمارا امتحان تھا۔ انسانیت کا۔ ہمارے مزاجوں کا۔ وہاں امداد تب پہنچنی شروع ہوئی جب وہاں اِکا دُکا جیتے انسان بچّے تھے لیکن آپ نے دیکھا کہ جسے آپ لوگ سُپر پاور کہتے ہیں اس نے ایک ایسے ملک پر یہ کہہ کر لشکر کشی کر دی کہ وہاں مہلک ہتھیار ہیں حالانکہ ساری دنیا جانتی تھی کہ وہاں مہلک ہتھیار نہیں وہ تو پہلے ہی اپنے قیمتی اثاثے تیل کے بدلے خوراک کھا کر زندہ ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صومالیہ کی طرف دنیا فوری رجوع کرتی لیکن توجّہ زیادہ ہلاکتوں کی طرف ہوئی۔ ہم سے تو یہی ہوا اور موسم ہی اچھے ہیں جو وقت پر آتے ہیں۔ گرمیوں کو پتہ ہے کہ اب اس کے جانے اور سردی کے آنے کی باری ہے۔ وہ ذرا ضد نہیں کرتی۔ ہوا مسلسل اپنی ذمّہ داری نبھا رہی ہے اور ہم جہاں

بھی ہوں ہم تک پہنچتی ہے لیکن ہم انسان اپنے فرائض سے غافل ہیں۔

پیارے بچّو! آپ کا بہت وقت لے لیا۔ خدا آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور اس بھنڈ جیسا تقویٰ اور توکّل موسموں جیسی ذمّہ داری اور بابے قُطبے جیسی محبّت اور نرم خوئی عطا فرمائے اور اسے تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

روّیوں کی تبدیلی

آپ سب کو ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے سلام پہنچے۔

آج جب میں ٹی وی اسٹیشن ریکارڈنگ کے لیے آ رہا تھا تو میرے ذہن میں کئی ایک موضوعات تھے اور کئی ایک ایسے سلسلے تھے جو میں آپ سے ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ آپ سے شیئر کرنا چاہتا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ کچھ سوچ کر گھر سے نکلتے ہیں کہ آج اپنے دفتر میں اپنے افسر سے فلاں بہانہ کروں گا اور چھٹی کی عرضی پیش کروں گا۔ آپ بھی اس طرح کرتے ہوں گے کہ ابّو سے یہ بہانہ کر کے فلاں چیز مانگوں گا یا دوستوں کے ساتھ مری جانے کی اجازت لے لوں گا۔ میں بھی آپ سے اس طرح کا بہانہ کر کے یا اپنے جذبات واحساسات شیئر کر کے زاویہ سے اپنی طویل غیر حاضری کی معافی چاہنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ میں اپنی گاڑی میں ایک اشارے پر رُکا ہوا تھا تو وہ کوئی گاڑیوں کی ریپیئرنگ کی مارکیٹ تھی یا دکانیں تھیں، وہاں ایک لڑکے کو دُکان

کے مالک یا اُس کے اُستاد نے کان پکڑوا کر مُرغا بنا رکھا تھا۔ وہ بے چارا دوہائی کر رہا تھا اور رو رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ کسی انتہائی غریب گھر کا بچّہ ہو گا۔ میلے کچیلے کپڑوں میں تھا۔ اُس کا اُستاد اُس کے ساتھ بیٹھا ایک ہاتھ سے چائے کا کپ لیے چائے پی رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں وہ کوئی رینچ یا پلاس جیسی چیز پکڑے ہوئے کسی چیز کے قابلے وغیرہ کَس رہا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مگن تھا اور وہاں یہ نہیں کہ کوئی دیکھنے والا نہیں تھا یا کوئی اور نہیں تھا کہ لوگوں کا جمِ غفیر تھا جس طرح عام طور پر مارکیٹوں میں ہوتا ہے۔

خواتین و حضرات! کبھی کبھی تو دکانوں میں لوگوں کا رش دیکھ کر لگتا ہے کہ کوئی چیز مفت بانٹی جا رہی ہے، حالانکہ وہ بڑی بڑی دکانیں ہوتی ہیں اور ان کے ریٹس بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ اشارہ سبز ہوا اور گاڑی چل پڑی لیکن میرا ذہن اب بھی اپنی قوم کے اس چھوٹے سے معصوم بچّے کی طرف ہی تھا اور میں نے کئی بار ذہن سے اُس کا خیال جھٹکا بھی لیکن وہ جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی عُمر بالکل ہماری اس عُمر کی طرح سے تھی جب ہم اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مِل کر بستہ تختی ہاتھ میں لیے سکول جایا کرتے تھے اور میری ماں میرے بستے میں ایک روٹی کے اوپر رات کا بچا ہوا میری پسند کا سالن اور

مکھن کا پیڑا رکھ کر دیا کرتی تھی تا کہ میں اور اسے آدھی چھُٹّی کے وقت کھا لوں۔

اس کی عُمر بالکل اتنی ہی تھی۔ جب ہم سب بچّے جمعرات کے دن آدھی چھُٹّی ساری کے بعد واپس گھر آتے تھے اور راستے میں پٹھّو گرم کھیلا کرتے تھے۔

خواتین و حضرات! ہمارے وقتوں میں چھُٹّی سے پہلے ماسٹر صاحبان بچّوں کو پہاڑے کہلوایا کرتے تھے۔

اک دونی دونی

چو چونی چار

ہم سب اس کے انداز میں پہاڑے یاد کیا کرتے تھے۔ تختیوں پر خوش خطی کا مقابلہ بھی ہمارا من پسند ہوا کرتا تھا اور سکول سے ہفتہ وار چھُٹّی کے دن محلّے کی تائی کے گھر جانا ہمارے لیے ایسے ہی تھا جیسے ہم لوگ اب لندن، امریکہ جانے کی تمنّا کرتے ہیں۔ تب ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ اقتصادی بوجھ کس قدر بھاری ہوتا ہے جو انسان کے جواں اور توانا ہونے کے باوجود اسے جھُکا دیتا ہے اور کمر دُوہری کر دیتا ہے۔

اس بچّے کو دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ میری تختی اور بستہ چھین کر مجھے وہاں مُرغا بنایا گیاہے اور میں نے سوچا کہ آپ سے مل کر اپنی معافی کی بات کرنے کی بجائے آج میں آپ سے اس موضوع پر بات کروں گا شاید ایسا کرنے سے میرے دل کا تازہ تازہ بوجھ ہلکاہو جائے۔

پیارے بچّو! Tension اس بات کی نہیں تھی کہ اُس لڑکے کو اُس کے مستری اُستاد نے مُرغا کیوں بنایاہے۔ ظاہر ہے اس نے کوئی غلطی کی ہو گی یاکام سیکھنے میں کوئی کوتاہی کی ہو گی۔ مجھے یا میرے ذہن میں مسئلہ یہ تھا کہ کوئی اور بزرگ یا دوسری دُکان کا اُستاد اس کے اُستاد کو کیوں نہیں آکر کہتا کہ اِسے آج چھوڑ دو۔ اِسے معاف کر دو۔ یہ آئندہ غلطی نہیں کرے گا۔ میرا دل کہتاہے کہ اگر کوئی اُسے معافی دِلوادیتا تو لڑکا دوبارہ غلطی نہ کرتا جس پر اُسے سزا ملی تھی۔

ہم آئے روز چائلڈ لیبر کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں سیمینار منعقد کرتے ہیں۔ وہاں لمبی لمبی تقاریر ہوتی ہیں۔ چائلڈ لیبر کے خلاف جنگ یا جہاد میں فنڈز لیے جاتے ہیں لیکن وہ فنڈز خرچ کہاں ہوتے ہیں وہ نظر نہیں آتے۔ ہمارے رویّے بہت بدل گئے ہیں۔ ہم معاشی تنگ نظری کی زیادتی اور عزّتِ نفس کی دستیابی کے فقدان کے باعث کچھ تشدّد پسند ہوتے جارہے

ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ آپ پر یا مجھ پر اقتصادی بار نہیں ہے یا میرے پیارے وطن پاکستان کے عوام کو وہ عزّت مِل گئی ہے جس کا انہیں نہ صرف وعدہ کیا گیا تھا بلکہ یقین دلایا گیا تھا اور وہ بھولے بھالے لوگ اپنے آپ کو لُٹاپُٹا کر گھر بار عزیز و اقارب چھوڑ کر ایک ایسے وطن میں آ گئے تھے جہاں انہیں محبّت، انصاف اور عزّت ملنا تھی جو پہلے سے حاصل نہیں۔ اُن سے ہم نے بھی وعدے کیے۔ ہم اس وقت اسٹوڈنٹ تھے اور گھر گھر جا کر تحریکِ پاکستان کی حمایت کے لیے لوگوں کو تبلیغ کیا کرتے تھے اور آج جب کسی کوچوان کو کوئی کانسٹیبل کالر سے پکڑ کر مار رہا ہوتا ہے تو مجھے یاد آتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے مقروض ہیں جن سے ہم نے عزّتِ نفس کی بحالی کے وعدے کیے تھے۔

آئے روز لوگ شکایت کرتے ہیں کہ جی پولیس والے بڑا تنگ کرتے ہیں۔ مزدور آجر کے رویّے سے نالاں ہے۔ اینٹیں لگانے والا ٹھیکیدار سے پریشان ہے۔ اپنی جگہ پر سب ہی ناخوش ہیں لیکن جو بات سوچنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہم خود ٹھیک ہیں۔ اگر کوئی ہمارا ماتحت یا ہم سے کم تر کوئی غلطی کرے گا تو کیا ہم اسے معاف کر دیں گے۔

کیا سراج دین چپراسی میری لٹھے کی سفید قمیض پر اپنے ہاتھوں سے چائے گرا دیتا

ہے تو کیا میں اسے کہوں گا کہ ”بابا سراج کوئی گل نہیں تو جا یہ قمیض فیر ٹھیک ہو جائے گی۔ جے تینوں میری کِسے گل دا بُرا لگیا تے اوہ کدی نہیں دُھلنا۔“

خواتین و حضرات! یہ سوچنے کی بات ہے، ہم اتنے متشدّد کیوں ہیں۔ ہم انسان ہو کر کسی پولیس والے سے تعلقات بنا کر یا اُسے کوئی پیسے ویسے دے کر کسی انسان کو اُلٹا لٹکوا دیتے ہیں۔

ہم نے معاف کرنے کی اپنی عظیم مثالیں کیوں بھُلا دی ہیں۔ ہمیں وہ خداوند کریم کا فرمان

کیوں بھول گیا ہے۔

ترجمہ: ”تم میں سب سے اچھا مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔“ ہم نے ان تعلیمات سے فراغت کیوں پا لی ہے۔ ایک بڑا ملک چھوٹے ملک کو نگلنے کے چکر میں کیوں پڑ گیا ہے۔ ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ اگر خوش رہنا ہے تو دوسروں کو خوش کرنا سیکھو۔

ایک بار ہم نے اپنے باباجی سے کہا کہ سائیں ہم تو بہت کوشش کرتے ہیں کہ ہم دوسروں کو خوش رکھیں۔ اپنے ماتحتوں سے بھی حُسنِ سلوک کرتے ہیں۔ کبھی

کبھی کسی فقیر کو بھی دو چار آنے دے دیتے ہیں لیکن ہم خوش نہیں ہوتے۔
ہمیں خوشی میسّر نہیں آتی۔ اس پر باباجی کہنے لگے۔

نوٹ۔ (جب انہوں نے کوئی خاص بات کرنی ہوتی تو "نوٹ" کہا کرتے تھے جس پر ہم چوکنا ہو جاتے تھے کہ اب کوئی اہم بات ہونے والی ہے) خوشی ایسے میسّر نہیں آتی کہ فقیر کو دو چار آنے دے دیئے۔ خوشی تب ملتی ہے جب آپ اپنی خوشیوں کے وقت سے وقت نکال کر انہیں دیتے ہیں جو دکھی ہوتے ہیں اور کل کو آپ کو، ان دکھی لوگوں سے کوئی دنیاوی مطلب بھی نہیں ہوتا۔ آپ اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ کر جب پریشان حالوں کی مدد کرتے ہیں تو خوشی خود بخود آپ کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ کوئی چیز آپ کو اتنی خوشی نہیں دے سکتی جو خوشی آپ کو روتے ہوئے کی مُسکراہٹ دے سکتی ہے۔

خواتین و حضرات! آپ کو حضرت عُمر کی خلافت کا وہ زمانہ یاد ہو گا جب وہ اپنی نیند چھوڑ کر ضرورت مندوں کی خبر گیری کو نکل پڑتے تھے اور آپ سوچ کر اندازہ لگائیں کہ جب خدا کا ایک جلیل القدر بندہ خلیفۂ وقت اور ایک بہت بڑی فوج کا کمانڈر درد مندوں کے دکھ بانٹنے کے لیے مدینے کی گلیوں میں پھر رہا ہے اور سارے سو رہے ہیں۔

میں نے بھی ساری زندگی کوشش کی لیکن اس عُمر میں پہنچنے کے باوجود وہ خوشی حاصل نہ کر پایا جس کی بابت بابے کہا کرتے ہیں۔ ''بس خواہش ہی رہی۔''

لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی خوشی کی تلاش میں ضرور نکلیں گے اور پہلے کی نسبت اپنے رویّوں کو نرم خوئی کی طرف ڈھالیں گے۔ اپنی سمتیں درست کرنے کا وقت ہے۔ رویّے درست کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اسی ڈگر پر چلتے رہے جس پر میں چلتا رہا ہوں تو پھر تشدّد بڑھتا جائے گا۔ ہر کسی کو انفرادی طور پر ٹھیک ہونا پڑے گا۔ میں اپنے ان معصوم بچّوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہوں جو ٹی وی پر انگریز پہلوانوں کی لڑائی جسے ریسلنگ کہتے ہیں دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ بچّے ہی نہیں ہم سب ایکشن فلموں کو پسند کرتے ہیں۔ ایسے ڈرامے اور فلمیں پسند کی جاتی ہیں جن میں ایک ہی شخص بڑی سی گن سے کئی دشمنوں کو ''پھڑکا'' رہا ہوتا ہے۔ جو بندے مار رہا ہو اسے ہیرو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح

آج کا ہیرو امریکہ بنا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ ہی تو زیادہ بندے مار رہا ہے اور اس کے پاس بندے مارنے کے لیے بڑے سے بڑا اسلحہ اور توپیں ہیں۔

ہم ایسے کیوں ہو گئے ہیں؟

ہمیں سوچنا ہی پڑے گا۔ طبیعت میں دھیما پن لانا ہی پڑے گا۔ ہمیں ایسا ہونا ہو گا جو مفکّرِ پاکستان کہہ گئے ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

لیکن ہم تو حلقۂ یاراں میں فولاد سے زیادہ سخت بننے کے لیے کوشاں ہیں۔ آپ آئندہ پروگرام میں مجھے سوچ کر بتایئے گا اور میری Help کیجئے گا کہ ہمیں بریشم بننے کے لیے کیا لائحۂ عمل اپنانا ہو گا اور اُستادوں کو چھوٹوں سے کس طرح کا سلوک روا رکھنا چاہیے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہمیں اپنے رویّوں میں محبّت اور نرم خوئی، شفقت لانے کے لیے خود سے ہی ریسلنگ کرنی پڑے گی اور اپنے وجود کے اندر ہی ڈبلیو ڈبلیو ایف جیسی صورتحال پیدا کرنی پڑے گی۔ اپنی خواہشوں سے اپنے وجود اور روح کے اندر ہی ریسلنگ کرنا پڑے گی پھر کہیں جا کر ہمارے وجود اور چہرے پُر سکون ہو پائیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

لچھّے والا

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

صورتحال اس وقت بڑی دلچسپ اور عجیب و غریب ہو جاتی ہے جب ایک بڑا پڑھا لکھا شخص، بڑا ذہین اور دانا شخص کسی کم فہم یا اللہ لوک بندے کو کچھ سمجھانا چاہ رہا ہو اور اس بے چارے کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ اس صورتحال میں So Called دانا شخص جس طرح سے مُٹھّیاں بھینچ رہا ہوتا ہے اور غصّے سے نِچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹ رہا ہوتا ہے، وہ منظر دیدنی ہوتا ہے۔ ایسی مثالیں ہماری روزمرّہ کی زندگی میں اکثر ملتی ہیں۔ چائے کے ہوٹلوں، ریل کے ڈبّوں، ڈیروں یا تھڑوں پر بیٹھے لوگوں کو آپ نے عموماً دیکھا ہو گا کہ وہ کسی ایسے فضول سے موضوع پر بحث کر رہے ہوں گے اور ہر کوئی اس بحث کو جیتنے کے چکر میں ہو گا۔ تاویلیں پیش کی جائیں گی اور گھنٹوں صرف کیے جائیں گے۔ حالانکہ ان کا اس بحث سے لینا دینا کچھ نہیں ہوتا۔ بس ٹائم پاس کرنا مطلوب ہوتا ہے اور ایک

وجہ دوسرے کو نیچا دکھانے کی ہوتی ہے۔

ایک دوسرے پر یہ ثابت کرنا چاہ رہا ہوتا ہے کہ میں تم سے ذہانت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوں۔ زیادہ معلومات رکھتا ہوں اور تم تو بس ایسے ہی ہو اور تمہارا کوئی کھاتہ نہیں ہے۔ افسر ماتحت پر اس رُعب کو جمانے کے چکر میں ہوتا ہے اور ہماری طرح کے بوڑھے نوجوانوں پر بڑائی اور دانائی کا عکس ڈالنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

میرا ایک ملنے والا ہے۔ بڑے اعلیٰ کاروبار کا مالک، بڑی ذہانت اور بڑی شان خدا نے اسے دے رکھی ہے۔ وہ Self Made قسم کا آدمی ہے۔ اُس کی ایک عادت ہے کہ جب بھی اس کا کوئی ملازم کوئی غلطی کرے تو اُس کے سب سے پہلے الفاظ جو وہ غصّے کی حالت میں بولتا ہے وہ یہ ہوتے ہیں کہ "تمہیں کِس گدھے نے ملازم رکھا ہے۔"

خواتین و حضرات! حالانکہ وہ صاحب یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ اُس کے دستخط یا منظوری کے بغیر اُس کے دفتر میں کوئی ملازم رکھا نہیں جا سکتا۔

ایسی اکثر مثالیں آپ کی زندگی میں بھی آتی رہتی ہوں گی اور آپ نوٹ کرتے

رہتے ہوں گے۔ یہ پڑھائی کا زعم ہمیں منزل سے دُور کر دیتا ہے اور عقلِ کُل کا خود کو مالک سمجھنا ایسی ہی ایک بڑی برائی ہے جیسی تہمت، چغلی اور اس طرح کی دوسری برائیاں ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے پیارے وطن کو جتنا نقصان ہم پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے اَن پڑھوں یا جنہیں ہم حقارت سے گنوار کہتے ہیں انہوں نے نہیں پہنچایا ہے۔ جتنی بڑی کرپشن ہو بس اتنا ہی زیادہ پڑھا لکھا ہو گا۔ ملاوٹ وہ زیادہ بہتر اور خوبصورت انداز میں کر سکے گا جو خود کو دوسروں سے زیادہ دانا اور عقلمند اور پڑھا لکھا خیال کرتا ہو گا۔ ایک ان پڑھ یا گنوار تو اس تکنیک سے ملاوٹ نہیں کر سکتا جیسے کہ ایک ذہین اور پڑھا لکھا کر سکتا ہے۔

خواتین و حضرات! مِرچ مصالحے میں تو ملاوٹ کی باتیں آپ نے سُنی ہوں گی۔ آج کل تو قصائی گوشت میں بھی پانی کی ملاوٹ کرنے لگے ہیں۔ یہ اس Technical انداز میں گوشت میں سیروں پانی مِکس کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

میں نے اپنے ایک دوست، جو کہ مستقبل کے افسروں کے انٹرویو لیتا تھا اس سے پوچھا کہ تم انٹرویو میں کیا دیکھتے ہو۔ وہ صاحب فرمانے لگے کہ ہم افسر بننے کے اُمّید وار کی شخصیت ذہن کو پرکھتے ہیں، جائزہ لیتے ہیں، اُس کی حاضر دماغی کو

جانچتے ہیں اور پھر اسے افسر بننے کا اہل قرار دیتے ہیں۔

میں نے اس سے کہا کہ اس طرح تو قوم کی جو کریم ہوتی ہے یا جو ذہین ترین نوجوان ہوتے ہیں صرف انہیں ہی منتخب کرتے ہیں۔

وہ کہنے لگے "بالکل۔"

میں نے کہا کہ "یار اس طرح تو آپ ملک کے تمام اہم اور بڑے ناموں میں ذہین ترین افراد کو بٹھا دیتے ہو۔ وہ دوسری ساری قوم سے عقلمند ہوتے ہیں اور زیادہ چالاک ہوتے ہیں اور پھر تو ساری قوم انہیں کے فیصلوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔"

وہ کہنے لگے کہ "وہ چُنے ہوئے اور بہتر صحت اور دماغ والے افراد ہوتے ہیں لہٰذا ان کے فیصلے قومی مفاد میں ہوتے ہیں۔"

میں نے پھر پوچھا کہ "میاں اگر وہ بہترین لوگ ہیں تو جو لوگ لوگوں کا پیسہ اور وسائل ڈکار کر باہر کے ملکوں میں بھاگ جاتے ہیں یا غلط فیصلوں سے قوم کو نقصان پہنچاتے ہیں وہ کیا عام ان پڑھ گنوار اور کم عقل طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔"

اس پر وہ کھسیانے سے ہو کر کہنے لگے۔ ”چھڈو اشفاق صاحب تسیں کیہڑی بحث لے بیٹھے ہو۔“

خواتین و حضرات! میرے وطن میں جو گنا کاشت کر کے شوگر ملوں میں بھیج رہا ہے جو عام کھڈی پر چادریں بُن رہا ہے یا مزدور ”گو“ پر کھڑ گارا لگا رہا ہے، وہ بھی اس ملک کی تعمیر و ترقّی میں اتنا ہی برابر کا شریک اور اتنی ہی عزّت کا حقدار ہے جتنا ایک لمبی اور جھنڈے والی کار میں بیٹھنے والا کوئی صاحب بہادر ہوتا ہے۔ ملک و ملّت اور دین سے جتنا لگاؤ ایک ان پڑھ دیہاتی کو ہوتا ہے اتنا شاید تم پڑھے لکھوں میں نہیں ہوتا۔

آپ کبھی فجر کی نماز کے بعد کسی ان پڑھ عام سے کپڑے پہنے کسی دیہاتی کو جسے وضو اور غسل کے فرائض سے بھی پوری طرح شاید واقفیت نہ ہو، وہ جب نماز کے بعد قرآن پاک پڑھنے کے لیے کھولے گا تو قرآن پاک کا غلاف کھولنے سے پہلے پہلے اُسے دو بار آنکھوں سے لگائے گا اور چُومے گا۔ اُس کی اِس پاک کتاب سے عقیدت اور محبّت دیدنی ہوتی ہے۔ وہ قرآن پاک میں کسی عربی کی آیات کے معانی سے واقف نہیں ہوتا لیکن وہ جس محبّت سے اُسے پڑھ رہا ہوتا ہے وہ قابلِ رشک ہوتا ہے۔

ہم تو صرف ہدایت کرنے والے اور دوسروں کو اپنی عقلمندی کے قائل کرنے کی کوشش کرنے والے ہیں۔ جبکہ وہ دیہاتی، جنہیں ہم گنوار کہتے ہیں وہ میری نظر میں ہدایت پانے والے لوگ

ہیں۔ خدا عاجزی کو پسند کرتا ہے۔ اور تکبّر اور غم کے ماروں سے اسے کوئی غرض نہیں۔ وہ تو اس کی طرف قدم بڑھاتا ہے جو اسے پیار سے یاد کرتا ہے، سوچتا ہے اور محبّت رکھتا ہے۔

وہ تو ایسی نمازوں کو بھی مُنہ پر دے مارے گا جو پڑھنے کے بعد زعم پیدا کرتی ہوں کہ ہم تو بڑے پرہیز گار ہو گئے ہیں اور ہم نے کوئی بڑا معرکہ مار لیا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے جو مجھے کسی دوست نے سُنایا تھا۔ اب ذہن میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کون صاحب تھے۔ خیر آگے چل کر ذہن میں اُن کا نام آیا تو بتاؤں گا۔

وہ بتاتے ہیں کہ اُن کے گاؤں میں ایک سادہ لوح سا شخص رہا کرتا تھا، عام طور پر راتوں کو وہ چوکیدار کا کام کرتا اور لوگ سال چھ ماہ کے بعد اُسے کچھ دانے یا پیسے اس کام کے عوض دیتے تھے۔ وہ بڑا نمازی تھا۔ اذان سے پہلے ہی مسجد جا بیٹھتا۔

روزے باقاعدگی سے رکھتا لیکن اسے دین کے حوالے سے زیادہ سُوجھ بُوجھ نہیں۔ بس اتنا پتہ تھا کہ مولوی کے پیچھے نماز پڑھنے سے ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ روزہ رکھتے ہوئے جب اذان ہو جائے تو پھر نہیں کھانا۔

اس نے کہیں سے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ اگر روزے ہوں اور سحری کے لیے وقت پر نہ اُٹھا جا سکے اور جب آنکھ کھُلے تو ابھی دن کی روشنی نہ ہو تو بھی مجبوری میں سحری کی جا سکتی ہے۔ اتفاق یہ تھا کہ امام مسجد یا مولوی صاحب کا گھر اس کے گھر کے راستے میں پڑتا تھا۔ ایک دن اُسے اُٹھنے میں تاخیر ہوئی اور اِدھر سے اذان کا بھی وقت ہو گیا اور وہ سحری کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ ”چل بھلئے لوکے جلدی چولہا چاڑھ، مولوی صاحب بانگ دین والے ہون گے۔“

اتنے میں اُسے گھر کے سامنے سے مولوی صاحب جاتے دکھائی دیئے۔

پھر کیا تھا اس نے مولوی صاحب کی منّت سماجت شروع کر دی کہ ”مولوی صاحب تسیں تھوڑی دیر لئی رُک جاؤ۔ اسال اجے روزہ نہیں رکھیا۔“

اب وہ سمجھ رہا تھا کہ جب تک مولوی صاحب اذان نہیں دیں گے تب تک

سحری کا وقت شاید ختم نہیں ہو گا۔ اسی طرح میرے دوست نے بتایا کہ جب بھی وہ لیٹ ہو جاتا تو اچھی طرح سے دروازہ بند کر لیتا تا کہ اُسے روشنی نظر نہ آئے اور جلدی جلدی سحری کر کے پھر کہیں جا کر دروازہ کھولتا۔

خواتین و حضرات! ہمیں ایسے لوگوں کے بارے میں Comments پاس نہیں کرنے۔ ان لوگوں کا معاملہ ڈائریکٹ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے بابا جی نور والے کہا کرتے تھے جس انسان کو ایسی حالت میں دیکھو کہ وہ عام لوگوں کی طرح کا ذہن نہیں رکھتا یا کُند ذہن ہے تو اسے کبھی بھول کر بھی پاگل نہ کہو، اگر اس کی مدد نہیں کر سکتے یا اُس کے ساتھ نیکی نہیں کر سکتے تو اس کے سامنے مت آؤ۔ ایسے لوگوں سے ہمیشہ صلہ رحمی سے پیش آؤ۔ یہ لوگ خدا کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ ہم پڑھے لکھوں نے لوگوں کی ہلاکتوں کے لیے کیا کیا سامان پیدا کیے ہیں۔ ایٹم بم سے ہم چشمِ زدن میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کو موت کے مُنہ میں لے جا سکتے ہیں۔ انسانوں کو مارنے کے لیے کلاشنکوف اور نئ نئ مہلک زہریں تیّار کی ہیں۔ زہریلی گیسوں کو بنا کر ہم اِتراتے پھرتے ہیں۔ کیا کبھی ایسا سامان کسی ان پڑھ یا عام سادہ لوح دیہاتی نے بھی بنایا ہے۔ ہم آج جسے سُپر پاور کہتے ہیں اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے

کہ یہ ملک باقی ساری دنیا سے زیادہ بندے مارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جب ہم سکول میں پڑھتے تھے تو ایک ادھیڑ عمر شخص جس کا رنگ گندی اور ماتھے پر بڑھاپے اور پریشانی سے لکیریں پڑی ہوئی تھیں، وہ سکول میں لچھے بیچنے آیا کرتا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے رنگ برنگ کے لچھے ہم سب کے مَن پسند تھے۔ وہ ہمیں اِن چینی کے بنے فومی لچھوں کے طوطے، بطخیں اور طرح طرح کے جانور بھی بنا کر دیت۔ ہم اس ست آنے آنے کے لچھے کھاتے اور وہ بڑے ہی پیار سے ہم سے پیش آتا تھا۔ مجھے اب بھی اس کی بات یاد ہے اور جب ایک سُپر پاور نے افغانستان پر حملہ کیا تو بڑی شدّت سے یاد آئی حالانکہ میں اُسے کب کا بھول چکا تھا۔ ہم سب بچّوں سے وہ لچھے والا کہنے لگا ''کاکا تسیں وڈھے ہو کے کیہہ بنو گے۔''

ہم سب نے یک آواز ہو کر کہا کہ ''ہم بڑے افسر بنیں گے۔'' کسی بچّے نے کہا ''میں فوجی بنوں گا۔''

وہ ہم سے پیار کرتے ہوئے بولا ''پتر جو وی بنو بندے مارنے والے نہ بننا۔ بندے مارن نالوں بہتر اے تسیں لچھے ویچن لگ پینا پر بندے مارن والے کدی نہ بننا۔''

میں تب تو اس کی وہ بات نہ سمجھ سکا لیکن لچھے والے کی یہ بات آج بڑی شدّت سے میرے ذہن میں آ رہی ہے کہ اس ان پڑھ سے اور عام سے آدمی نے ہم سے کتنی بڑی اور اعلیٰ بات کی تھی۔

پیارے بچّو! میں اپنی نسل سے ذرا بھی مایوس نہیں ہوں۔ بہت پُر اُمّید ہوں کہ یہ قوم ایسی قوم ہے جو بڑی سے بڑی مشکلوں میں بھی حوصلہ نہیں ہارتی۔ اگر اس نے ایٹم بم بنایا ہے تو اس نے دنیا کے بہترین اور خوشنما پھول بھی لگائے ہیں۔ یہ غیرت مند قوم ہے۔ اس پاک سر زمین پر بسنے والے تسلیم و رضا کے بندے ہیں۔ یہ انسانوں کو ان کی عزّت دینے والے ہیں۔ محبّت اور خوشیاں بانٹنے والے ہیں۔ یہ تو خود اپنے ایک بھائی سے کٹ کر پریشان ہیں۔ اب یہ سیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے نظرِ بد والی آنکھ سے بچ کر باہمی اختلافات ختم کر کے محبّتیں پروان چڑھانی ہیں اور جہاں یہ غیرت مند ہیں وہاں انہیں علم ہے کہ اس لچھے بیچنے والے نے جو بات کہی تھی وہ کتنی خوبصورت تھی۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

پناہ گاہیں

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

دنیا میں بڑی پناہ گاہیں ہیں۔ کچھ لوگ جنگلوں کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کچھ پہاڑوں اور کچھ لق و دق صحراؤں میں پناہ لیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ افریقہ کے جنگل بڑے مشہور ہیں۔ وہ اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ اگر انسان اِن میں راستہ بھٹک جائے تو راستہ تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بڑے نامی گرامی چور، ڈاکو اور جرائم کی دنیا سے تعلّق رکھنے والے اِن جنگلوں اور بیابانوں کو پناہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے بھارت کے ڈاکو ویراپن کا نام تو سُنا ہی ہو گا۔ وہ ساری زندگی جنگل میں چھپا رہا اور اُسے تلاش کرنے کے لیے پولیس وغیرہ نے بڑے بڑے منصوبے بنائے، مہموں پر نکلے لیکن وہ تلاش نہ ہو سکا۔ اس نے تو باقاعدہ ایک گینگ بھی بنا رکھا ہے اور وہ کاروائیاں ڈال کر واپس جنگلوں میں چھُپ جاتے ہیں۔

(یہ پروگرام اشفاق احمد کے انتقال کے بعد ترتیب دیا گیا اور اس وقت تک ویراپن ڈاکو کو

تلاش کرنے کی مہم کے دوران ایک مقابلے کے بعد ہلاک کر دیا گیا)

خواتین و حضرات! پناہ گاہ سے مراد ایسی جگہ یا مقام ہوتا ہے جس میں کوئی انسان جانور یا کوئی ذی روح خود کو محفوظ خیال کرے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب ہم کسی سانپ وغیرہ کے پیچھے پڑ جائیں تو کسی نہ کسی بِل میں سر دے کر اسے بطور پناہ گاہ استعمال کرتا ہے۔

پناہ گاہ کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہوتی ہے لیکن میں بڑھاپے تک پہنچنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ ماں کی آغوش سے بڑی دنیا میں کوئی پناہ گاہ نہیں ہے اور یقیناً نہ بن پائے گی۔ ماں کی بانہوں کا حصار ہمیں کسی بڑے مضبوط پہاڑ سے کم نہیں لگتا۔

ایک چھوٹا بچّہ جب رات کو سوتے ہوئے ڈر جاتا ہے اور جب اُس کی ماں اسے محبّت سے سینے سے لگاتی ہے تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر یوں سکون سے اور ماں کے سینے سے چمٹ کر سو جاتا ہے جیسے ایک فوجی محاذِ جنگ میں اپنے ساتھیوں

کے ساتھ مورچے میں خود کو محفوظ پاتا ہے۔ آپ نے نیشنل جیوگرافک چینل پر کنگرو کے بچّے کو کسی انجانے ڈر سے بھاگ کر اپنی ماں کی مخصوص تھیلی، جو قدرت کا ایک عظیم شاہکار ہے، اُس میں دُبکتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ وہ نظارہ بڑا ہی قابلِ دید ہوتا ہے۔ بلّی جب اپنے معصوم سے ان کھلی آنکھوں والے بچّے کو اپنی باچھوں میں اُٹھا کر لے جا رہی ہوتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ مامتا کیا ہوتی ہے۔ اس نے اپنے بچّے کو اپنے مُنہ میں اسے گردن سے دبوچا ہوتا ہے لیکن وہ بچّہ کوئی پریشانی محسوس نہیں کر رہا ہوتا بلکہ Comfort Feel کر رہا ہوتا ہے۔ ماں کی اس پناہ گاہ کی تعریف کے لیے زبان ان لفظوں کی محتاج ہے جو اس کی عکاسی کر پائیں۔ لیکن یہ ممکن ہے ہی نہیں۔ میں بھی ان خوش نصیب انسانوں میں سے ہوں جسے ماں کی آغوش اور پناہ گاہ نصیب ہوئی۔

پیارے بچّو! صرف ماں ہی نہیں باپ اور ہم جنہیں والدین بھی کہہ سکتے ہیں جو ایک بڑی اور محفوظ پناہ گاہ ہوتے ہیں، اُن کا کوئی متبادل نہیں ہوتا۔ والدین کے بعد جو بڑی پناہ گاہ ہے وہ گھر ہے۔ گھر چاہے غریب کا ہو، امیر کا، وہ جھونپڑی کی صورت ہو یا محل کے انداز میں، وہ بڑی پناہ گاہ ہوتا ہے۔

دفاتر سے چھُٹّی کے وقت اور سکولوں کالجوں میں چھُٹّی کے بعد لوگ اور بچّے

گھروں کی جانب اس تیزی سے گامزن ہوتے ہیں کہ جیسے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے یا کوئی بڑی اُفتاد پڑنے والی ہے جو ہر کوئی گھر میں جلد سے جلد پہنچنے کی فکر میں ہوتا ہے۔

اِس جلدی میں بعض لوگ تو سُرخ بتّی کی بھی پروا نہیں کرتے۔

بس، ہوائی جہاز یا کسی سائیکل سوار سے پوچھیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں تو اکثریت کے

الفاظ یہی ہوتے ہیں کہ ہمیں گھر پہنچنا ہے۔

ہر شخص بہت جلدی میں ہوتا ہے۔ میں اسلام آباد سے لاہور آ رہا تھا۔ ایک صاحب بے چین اور مُضطرب تھے۔ میں کافی دیر تو انہیں دیکھتا رہا اور حسبِ عادت مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا کہ جناب آپ بڑے پریشان دکھائی دیتے ہیں، خیریت تو ہے۔

کہنے لگے مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔ میں نے پوچھا کیا وہاں کوئی ضروری کام ہے جو آپ جا کر کرنا چاہتے ہیں۔ فرمانے لگے نہیں۔

میں نے کہا کہ پھر کوئی بات نہیں آرام سے بیٹھے رہیں۔ آخر تو پہنچ ہی جانا ہے۔ وہ پھر بولے۔

یہ ڈرائیور ہی بڑا ہی سُست ہے، اتنی دیر میں تو ہم آدھا سفر طے کر چکے ہوتے اور جلد گھر پہنچ جاتے لیکن اس نے تو حد ہی کر دی۔

خواتین و حضرات! یہ ایسی مثالیں ہیں جنہیں ہم روزمرّہ کی زندگی میں نوٹ کر سکتے ہیں۔

میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں۔ گھر جاتے ہوئے بار بار گھڑی دیکھتا ہوں، حالانکہ جانا تو

گھر ہے۔ چند منٹ تاخیر بھی ہوئی تو کونسی مُشکل پڑ جائے گی۔

ایک بار ڈیرے پر ہم نے بابا جی سے پوچھا کہ سرکار انسان کو پناہ کہاں ملتی ہے۔ تو فرمانے لگے۔

ماں کی آغوش میں۔ اگر وہ میسّر نہ ہو تو والدین کی دُعاؤں میں۔ اگر وہ بھی بد قسمتی سے نہ ملے تو پھر علم میں۔

وہ علم کتابی یا حساب الجبرے کا ہی نہیں۔ ایسا علم جس سے آپ کی ذات، روح اور دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ وہ خدا کی مخلوق کے لیے زحمت نہ بنے۔ جب میں یہ سوچ رہا ہوتا ہوں میرے دل میں آیا کہ اگر علمِ نافع بڑی پناہ گاہ ہے تو پھر ایک اُستاد کا کیا مقام ہو گا۔

میں اپنے معاشرے یا مزاجوں پر تنقید نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی ایسی کوئی جنگ شروع کرنا چاہتا ہوں جس سے کسی کی دل آزاری ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ یا تو ہم نے اپنے اُستادوں کو وہ مقام دینا بند کر دیا ہے وہ جس کے مستحق ہیں یا پھر ہم اُستادوں میں کوئی ایسی کمی واقع ہوئی ہے جس کے باعث ہم اپنا وہ احترام کھو بیٹھے ہیں۔ کوئی بتائے کہ اُس نے فلاں فلاں ڈگریاں لے رکھی ہیں اور وہ اپنی اس فیلڈ میں ماہر ہو کر پڑھا رہا ہے تو کیا جاتا ہے۔

ہائے ہائے یہ بھی کوئی کام ہوا۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہو جاتا۔ بڑی پرانی بات ہے۔ ایک پسماندہ سے گاؤں کا کوئی لڑکا جو بڑا ہی ہونہار تھا۔ اُس نے پی ایچ ڈی کی اور وہ پروفیسر بن گیا۔ اُس نے اپنے اِس پیشے سے متعلق بیرونِ ملک سے بھی کئی ڈگریاں لیں۔ وہ اپنے اس پیشے میں بہت ہی طاق تھا۔ ایک دن اپنے گاؤں واپس گیا تو ایک بڑی سی عمر کے بابے نے اُس سے

پوچھا: ”پتر کیہہ بن گیا ایں۔“

اس نے جواب دیا: ”بابا جی اُستاد۔“

وہ بابا بڑا حیران و پریشان ہوا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس نوجوان نے پوچھا کہ بابا جی آپ خوش ہونے کے بجائے میری طرف ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ تو وہ معمّر شخص انتہائی دکھی انداز میں بولا ”پُتر اینے سال گھروں دور رہ کے تو ماسٹر ہی بنناسی۔ ایس توں چنگا سی تو پٹواری یاں فیر پُلس والا بن جاندا۔ تو وال وی چِٹّے کیتے تے کٹھیا وی کُج نا۔“

(بیٹا اتنے سال تو گھر والوں سے دور رہا اور صرف ماسٹر ہی بن سکا۔ اِس سے تو بہتر تھا تو پٹواری یا پولیس کانسٹیبل بن جاتا۔ تو نے پڑھ پڑھ کے بال بھی سفید کر لیے اور حاصل بھی کچھ نہ کر سکا)۔

اس میں ان ایکشن لیا جاتا

گاؤں میں پٹواری کی بڑی بات ہوتی ہے اور وہ بڑا افسر مانا جاتا ہے یا پھر ڈنڈا پڑے پولیس کانسٹیبل کا رُعب و دبدبا ہوتا ہے۔

خواتین وحضرات! سقراط کھنڈروں میں ننگے پاؤں کھڑا ہو کر بات کرتا تھا لیکن اس کا احترام کیا جاتا تھا، حالانکہ وہ کوئی امیر کبیر آدمی نہیں تھا۔ کسی زمانے میں لوگ تھڑوں پر اہلِ دانش کا لیکچر سُننے دُور دُور سے آیا کرتے تھے۔

یہ تو باہمی کوتاہیاں ہیں جن کے باعث علم دینے والے اور ایک پناہ گاہ کا نمونہ نہ رہ سکے۔

میرا ایک دوست مجھ سے بات کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گیا اور کہنے لگا۔ "یار اشفاق! غضب ہو گیا؟"

میں نے پوچھا "ایسی کیا بات ہو گی۔"

کہنے لگا "سوچتا ہوں لیکچرار نہ بنتا۔ کسی کورٹ کچہری میں چپڑاسی بن جاتا۔ پولیس میں سپاہی بھرتی ہو جاتا تو آج میری جو Disgrace ہوئی ہے وہ نہ ہوتی۔" اور پھر اس نے مجھے وہ پورا واقعہ سُنایا تو میں بھی اُس کے ساتھ غمزدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے بتایا کہ وہ پتّو کی کالج سے بطور اُستاد پڑھا کر بذریعہ بس واپس لاہور آ رہا تھا تو راستے میں ایک پولیس کانسٹیبل کو اس کے دیگر پٹی بند ساتھیوں نے اُسی بس پر

سوار کرایا اور کنڈیکٹ کو ہدایت کی کہ اِسے بیٹھنے کے لیے جگہ دے دے۔

اتفاق سے اس دن اس بس میں یا تو خواتین تھیں اور یا پھر زیادہ عُمر کے لوگ تھے۔ ایک دو نوجوان تھے۔ وہ اپنی سیٹوں پر سوئے ہوئے تھے۔ اس صورتحال میں کنڈیکٹر نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ مجھے اُٹھا کر اِس پولیس کانسٹیبل کو بٹھا دے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ اگر تھوڑی دیر اس سیٹ سے اُٹھ جائیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔

اس ملازم (پولیس والا) کو بٹھانا ہماری مجبوری ہے۔ روز یہاں سے گزرنا ہوتا ہے۔ بات نہ مانیں تو بلاوجّہ روک کر تنگ کرتے ہیں۔

میں نے اس سے کہا کہ میں اس کانسٹیبل سے کم از کم دس پندرہ گریڈ اوپر ہوں اور ویسے بھی میں پہلے بیٹھا ہوا تھا۔

لیکن وہ منّت سماجت کرنے لگا کہ آپ اُٹھ جائیں اور مجھے تنگ آ کر بالآخر اُٹھنا پڑا۔ ہمارے قریب کھڑا وہ پولیس کا سپاہی ہماری باتیں سُن بھی رہا تھا اور اسے بھی معلوم تھا کہ میں ایک اُستاد ہوں۔

ایسے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔ بات وہیں آ کر رُکتی ہے کہ کمی دونوں

اطراف سے ہے۔ اِس کی وجہ کسی ایک کی غلطی نہیں بلکہ اُستاد اور معاشرہ دونوں برابر کے ذمّہ دار ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہماری اقتصادی ضروریات یا مالی مجبوریاں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ ہم اپنی معاشرتی اقدار کو پس انداز کیے جا رہے ہیں۔

جب ہم سکولوں میں پڑھا کرتے تھے اس وقت اگر کوئی اُستاد سامنے آتا دکھائی دیتا تو ہم راستہ چھوڑ دیتے۔ یہ خوف نہیں ہوتا تھا بلکہ احترام کی ہی ایک قسم تھی۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ اُستاد اور شاگرد موٹر سائیکل پر اکٹھے گھومتے ہیں۔ میں اس طرح کے میل جول کے خلاف نہیں لیکن ایک Limit بہت ضروری ہے۔ اُستاد اور شاگردوں کے درمیان علمی بحث اور اس سے Related دوسری سرگرمیاں بجا ہیں لیکن بلاضرورت Frankness ٹھیک نہیں۔ والدین کے بعد دوسری پناہ گاہ اُستاد ہیں۔ اُن کا بڑا مقام ہے اور بڑا رشتہ ہے لیکن نہ تو ہم علم کو پناہ گاہ تسلیم کرنے کو تیّار ہیں اور نہ ہی علم دینے والے کو پناہ گاہ ماننے کا حوصلہ ہم میں ہے۔ مادی تقاضے اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ یہ اقتدار ہمیں بے معنی سی لگتی ہیں۔ یہ ہماری اصل پناہ گاہیں ہیں جن سے ہم فرار حاصل کر رہے ہیں۔ لوگ پناہ گاہوں کو تلاش کرتے ہیں اور ہم اپنی ان قلعہ نُما مضبوط پناہ گاہوں سے

معذرت چاہ رہے ہیں۔ ایک بڑے ہی جنگجو اور سخت دل سپہ سالار کہ جس نے کئی انسانوں کو تہہ و تیغ کر دیا تھا ایک دن زار و قطار رو رہا تھا۔ لوگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ تو سخت دل انسان ہے۔ بڑا ظالم ہے۔ کیوں رو رہا ہے۔ جب اُس سے اُس کے رونے کی وجہ دریافت کی گئی تو کہنے لگا آج اس کی ماں مر گئی ہے۔

پہلے تو وہ ہر کام یہ سوچ کر کرتا تھا کہ اس کی کوتاہی اور غلطی کی معافی اُس کی ماں کی دُعاؤں کی بدولت ممکن ہو جاتی تھی اور ملنے والے مصائب و آلام سے بچانے کا سبب اس کی ماں کی دُعائیں تھیں۔ لیکن اب وہ جو کرے گا اسے بھگتنا ہی ہو گا۔ اب وہ ایک بڑی فوج کا سپہ سالار ہو کر بھی کمزور ہو گیا ہے۔

خواتین و حضرات! دُعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور اپنی خوبصورت پناہ گاہوں سے معذرت کے بجائے اُن کا شرف اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

اصولوں کے ابلیس

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ آج سے کوئی چھ سات برس یا تھوڑا سا اس سے پہلے کی بات ہے۔ میں اپنے دفتر میں آرام سے بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا اور بڑے آرام کی حالت میں تھا کہ میرے دفتر میں دو افراد آئے۔ وہ میاں بیوی تھے۔ وہ دونوں بڑی عُمر کے تھے اور میرے پاس آ کر بڑی خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ آنے والی خاتون کا خاوند تو کچھ خاموش مزاج تھا جبکہ اس کی بیوی بے چین اور مُضطرب تھی۔

وہ کہنے لگی میرا بیٹا نوّیں جماعت میں پڑھتا ہے۔ ان کے School Leaving سرٹیفکیٹ پر یہ بھی لکھ دیا کہ انہیں کسی سکول میں داخلہ نہ دیا جائے کیونکہ انہوں نے ڈسپلن میں سخت رخنہ ڈالا ہے۔ ان میاں بیوی نے مجھے کہا کہ ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ان پرنسپل صاحب سے سفارش کریں کہ وہ مہربانی سے پیش آئیں اور انہیں دوبارہ سکول آنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے جس سکول کا نام لیا ہے اس کے پرنسپل صاحب میرے تو واقف نہیں ہیں لیکن میں اُن سے درخواست ضرور کروں گا کیونکہ یہ ایک بچّے کا معاملہ ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے دفتر سے ہی انہیں ٹیلیفون کیا اور انہیں اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا کہا۔ وہ کہنے لگا، ”اوہ ہو آپ اشفاق صاحب بول رہے ہیں۔ ہم تو آپ کے بڑے فین ہیں۔ اب مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ کام بن جائے گا۔ میں نے کہا کہ جی میں کب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ آپ سے ایک چھوٹا سا کام ہے۔“ وہ کہنے لگا کہ ”نہیں نہیں یہ تو ہمارا Privilege ہے اور ہمارے لیے بڑی سعادت کی بات ہے۔ اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو میرے ساتھ اور بھی دو تین ٹیچرز آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔“

میں نے کہا کہ ”نہیں جناب مجھے آپ سے کام ہے اور آپ مجھے ہی آنے دیجیے۔“

میں نے انہیں ایک واقعہ سُنایا کہ بڑی دیر کی بات ہے یہاں لال بھیم سین سچر ہوتے تھے۔ وہ چیف منسٹر پنجاب تھے اور ان دِنوں رات کے وقت ”ویر بھارت“ اخبار میں تربیت لیا کرتا تھا اور میں رات کو لالہ نارنگ چند داس کی

خدمت میں جا کر وہ تربیت حاصل کیا کرتا تھا۔ ایک دن رات دورانِ کام چیف منسٹر کا ٹیلیفون آ گیا اور میری یہ سُن کر سٹّی گم ہو گی کہ انہیں ایک وزیرِ اعلیٰ کا فون آیا ہے اور میرے ہاتھ کانپنے لگے۔

فون پر لال نارنگ چند نے وزیرِ اعلی سے کہا کہ ”جی مہاراج“

دوسری طرف سے بھی کچھ بات ہوئی ہو گی جس پر لالہ نارنگ چند کہنے لگے کہ ”مہاراج آپسچپت (ہندی کا لفظ مطلب آپس کی بات) بات یہ ہے کہ جب ہم کو آپ سے کوئی کام ہو گا تو ہم آپ کی سیوا میں حاضر ہوں گے اور جب آپ کو ہم سے کوئی کام ہو گا تو آپ ہمارے پاس آئیں گے اور چونکہ اب آپ کو ہم سے کام ہے تو آپ دفتر تشریف لے آیئے۔“

میں یہ سُن کر حیران ہو گیا کہ یا اللہ ایسے بھی ہوا کرتا ہے اور وزیرِ اعلیٰ کو خود آنا پڑا۔ میں نے پرنسپل کو یہ واقعہ سُنا کر کہا کہ اب چونکہ مجھے آپ سے کام ہے لہٰذا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

وہ کہنے لگے آپ بالکل تشریف لایئے۔ مل کر چائے پئیں گے۔

میں نے بچےّ کا نام وام لے کر اور اُن سے دُعا کرنے کا وعدہ لے کر انہیں رخصت

کیا۔ اگلے دن میں پرنسپل صاحب کے حضور حاضر ہوا۔ وہاں اُن کے پاس اور اُستاد بھی بیٹھے تھے۔ وہاں میرے ڈراموں کی بات ہوتی رہی۔ اِدھر اُدھر کی بھی باتیں ہوئیں اور میں دُبکا بیٹھا اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ جیسے ہی موقع ملے اپنے آنے کا مقصد عرض کروں۔ (مُسکراتے ہوئے)

جب ذرا خاموشی ہوئی تو میں نے انہیں کہا کہ میں جس مقصد کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا میں اس کا اظہار کرتے ہوئے آپ سے تھوڑا ڈرتا ہوں لیکن میں اظہار ضرور کروں گا کیونکہ یہ بچّوں کے مستقبل کا معاملہ ہے اور ساری بات سُنائی اور ان کے سخت حکم سے انہیں آگاہ کیا۔

انہوں نے میری بات سُن کر کہا کہ "اشفاق صاحب وہ جو فیصلہ کر چکے وہ کر چکے۔ اب واپس نہیں لیں گے اور آپ سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ اس کی حمایت کریں اور عمل کریں۔"

میں نے کہا کہ "دیکھئے وہ بچّہ ہے اور وہ بہت شرمندہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو دوسرا بچّہ جس کے ساتھ اس نے جھگڑا کیا وہ بھی اپنی جگہ شرمندہ ہو گا۔ آپ ان کو معاف کر دیں۔"

انہوں نے کہا ”نہیں اشفاق صاحب یہ اصول کی بات ہے۔“

میں نے کہا ”دیکھئے کبھی کبھی اصول چھوڑ بھی۔۔۔۔۔۔“

انہوں نے کہا کہ ”نہیں اصول چھوڑنے سے ہمارے ملک کو بڑا نقصان پہنچا ہے لہٰذا اب وہ اصول نہیں چھوڑیں گے۔“

میری بڑی دیر تک اُن سے بحث ہوتی رہی۔ وہاں موجود اُن کے دوسرے ٹیچر بھی کہنے لگے کہ ”اشفاق صاحب آپ تو رائٹر ہیں۔ آپ کو اصول توڑنے پر مصر نہیں ہونا چاہیے۔“

میں نے اُن سے کہا کہ ”آپ سب ٹھیک ہیں اور آپ کی ذمّہ داریاں ہیں لیکن اصول کی بھی کچھ سطحیں ہوتی ہیں۔“

لیکن انہوں نے کہا کہ ”ہم اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔“

جب انہوں نے دو مرتبہ یہی بات دہرائی تو میں نے کہا کہ ”جی یہ فقرہ تو سیاستدان بولتے ہیں۔ آپ تو اُستاد ہیں اور اُستاد کے مُنہ سے یہ فقرہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

اس پر وہ کہنے لگے کہ ''آپ کا کیا مطلب ہے اس بات کا؟ کیا اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جائے؟''

میں نے کہا کہ ''میں یہ بھی نہیں کہتا لیکن اتنا سخت ہونے کا بھی میں اعلان نہیں کر سکتا جیسا کہ آپ کر رہے ہیں۔''

وہ کہنے لگے ''ہر گز وہ اپنے اصول نہیں توڑیں گے۔''

جب وہاں کچھ تلخی بڑھ گئی لیکن مہذّب پن اب بھی قائم تھا۔

وہ کہنے لگے کہ ''دیکھئے کہ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اصول توڑ دیئے جائیں۔ اتنا بڑا Institution جو ہم نے بنایا ہے تو کیا اصولوں قاعدوں کے بغیر ہی چلے گا۔''

میں نے کہا کہ ''سر! اگر آپ بہت زیادہ اصولوں کو ماننے لگے اور بہت زیادہ اصولوں پر کاربند ہو گئے تو زیادہ سے زیادہ آپ ابلیس کے لیول تک جا سکتے ہیں۔ اُس سے اوپر نہیں جا سکتے۔''

(اس پر تمام حاضرین پروگرام زاویہ ہنسنے لگتے ہیں)

''کیونکہ ابلیس نے ڈیکلئر کیا تھا کہ میں اصول پر قائم رہوں گا۔''

اللہ سے اس نے یہی کہا تھا کہ "اے اللہ تعالیٰ میں اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔"

اس پر اُسے اللہ نے کہا کہ تو دفع ہو جا اور یہاں سے نکل جا۔

وہ کہنے لگے کہ "کیا پھر اصولوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔"

میں نے کہا کہ "پرنسپل صاحب اصول کو نہیں ماننا چاہیے اصول ساز کو ماننا چاہیے۔ جب وہ کہہ دے کہ آج سے تمہارا قبلہ یہ نہیں ہے۔ دوسری طرف مُنہ کر لو تو اس کام پر نماز پڑھتے پڑھتے گھوم جانا چاہیے۔"

میری اس بات پر کہنے لگے "نہیں وہ ابلیس کی بات اور تھی۔"

میں نے کہا" دیکھئے آپ ان بچّوں کو معاف کر دیں۔ معاف کرنا ایک کمال کا عمل ہوتا ہے۔"

کہنے لگے "ہم ان کو کیسے معاف کر دیں۔"

میں نے کہا کہ "جیسے آپ نے انہیں سزا دی تھی ویسے ہی معاف کر دیں اور جیسے انہوں نے Prayer کے وقت لڑائی کر کے سزا لی تھی آپ ایسے ہی وقت انہیں

حاضر کریں اور بچّوں کے سامنے کہیں کہ میں نے انہیں سزا دی تھی اب یہ اپنے کیے کی معافی مانگتے ہیں اور شرمندہ ہیں۔ اب ہم ان کو معاف کرتے ہیں۔"

کہنے لگے "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "سر آپ ان کے اُستاد ہیں۔ آپ ان کو اصولوں کی تعلیم دیں گے، آپ ان کو زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائیں گے۔ آپ ان کو Rigid رہنے کا اصول بھی سکھائیں گے۔ معاف کرنے کا اصول بھی آپ ہی بتائیں گے۔ میں یا ان کے والدین تو نہیں بتا سکتے۔ یہ کام تو اُستاد ہی بتائے گا۔"

میں نے کہا "دیکھئے اگر یہ بچّے کسی طرح سے آپ کے ہاتھ سے نکل کر بیرونِ ملک چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے تعلیم حاصل کر لی اور یہاں آ کر سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے شیخوپورہ یا کوہاٹ کا ڈپٹی کمشنر لگ گیا اور اسے تو معاف کرتا آتا ہی نہیں ہو گا اور کسی نے سکھایا ہی نہیں ہو گا تو پھر اب وہ کیا کرے گا اور انسانیت کو معاف کیسے کرے گا؟"

وہ کہنے لگے کہ "اشفاق صاحب آپ کی دلیل تو ٹھیک ہے لیکن ہم ایسا کر نہیں سکتے۔"

میں نے کہا کہ "آپ ان کی تعلیم و تربیت کیسے کرتے ہیں۔"

وہ ایک اُستاد کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ "آپ اشفاق صاحب کو بتائیں۔"

وہ ماسٹر صاحب بتانے لگے کہ "ہماری آٹھویں جماعت کی کتاب میں معاف کرنے کا فلاں فلاں واقعہ ہے۔ کتاب سے اس نے رسول نبی اکرم ﷺ پر کوڑا پھینکنے والی بڑھیا کا واقعہ سُنایا جس میں آپ اس خاتون کے بُرے سلوک پر بغیر اسے کچھ کہے چلے جایا کرتے تھے اور بڑھیا کی بیماری پر حضور کی طرف سے اس کی خبر گیری پر وہ بڑھیا مسلمان ہوئی تھی۔"

اور میں نے کہا "سر یہ تو آپ نے چلیں پڑھا دیا۔ آپ نے بچّوں کو پریکٹیکل کب اور کہاں کرایا کہ بچّو جو معافی حضورِ اکرم ﷺ نے اُس بڑھیا کو دی ہے وہ اس طرح سے تھی۔"

تو وہ اُستاد کہنے لگے کہ "جناب ہم تو بچّوں کو صرف کتابی علم ہی دیتے ہیں، عملی نہیں۔"

وہ پرنسپل تب تو میری بات نہ مانے لیکن اللہ کا شکر کہ انہوں نے گھر جا کر کچھ

سوچا اور تیسرے دن مجھے فون کیا اور کہا کہ "آپ کی باتیں ٹھیک تھیں لیکن میری تربیت ایسی نہیں ہے۔"

میں نے کہا کہ "میں آپ کا احترام کرتا ہوں اور یہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ آپ انہیں معاف کر رہے ہیں۔"

اور وہ مجھے کہنے لگے کہ "اس معافی اور اس بارے دلائل دینے کی بات آپ کے ذہن میں کیسے آئی۔"

تو میں نے ان سے کہا کہ جی یہ باتیں یا خیال میرے ذہن سے نہیں نکلا اور یہ میری بات نہیں ہے۔ ایک دفعہ میرے تھائرائڈ گلینڈ (Thyroid Gland) بڑھ گیا تھا تو سرجن نے کہا کہ اگر اسے چیرا دے کر نہ نکالا گیا تو یہ خطرناک صورتحال اختیار کر سکتا ہے۔ تو جب میں سرجری کروانے کے لیے آپریشن تھیٹر میں لیٹا تو وہاں ایک نرس تھی جو بڑی ہی اچھی، پیاری اور ذہین تھی۔

اس کا نام فرخندہ تھا۔ معلوم نہیں اب کہاں ہو گی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی۔

جب مجھے بے ہوش کرنے کی Dose دی جا رہی تھی تو بجائے اس کے کہ وہ دوسری نرسوں کی طرح ایک دو تین چار پانچ کی گنتی شروع کر دیتی اس نے مجھ

سے میرے Profession کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے اسے کہا کہ تو بڑی چالاک ہے اور میں گیا، گیا، گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جب میں Operate ہونے کے بعد ہوش میں آیا تو میں نے اس سے کہا "فرخندہ تو مجھے یہ بتا کہ تیرا کتنا تجربہ ہو گیا ہے۔" اس نے کہا کہ "بحیثیت ایک نرس مجھے کوئی نو سال ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا کہ "تو نے بڑے عجیب و غریب مریضوں کو اپنے ہاتھوں بے ہوش کیا ہو گا اور ڈیل کیا ہو گا۔"

کہنے لگی کہ "اشفاق صاحب میں نے یہاں آکر یہ دیکھا ہے اور میری زندگی نے مجھے سکھایا ہے کہ زندگی اور موت کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہے۔"

"ایک راستے سے بندہ آتا ہے وہ کھڑا ہو کر کیمرے کو Face کرتا ہے اور ایک بڑے اچھے بنے ہوئے راستے سے گزر جاتا ہے۔"

"میں نے کہا کہ اس بات کو تسلیم کرنے کا ہمارا حوصلہ نہیں پڑتا۔"

اُس نے کہا کہ ”میرے ہاتھوں سے بہت سارے آدمی ایسے گزرے ہیں اور وہ ایک خاص سٹیج پر یا مرحلے پر آکر بڑے خوش و خرم اور پُر سکون ہو جاتے تھے۔ صرف ایک مریضہ ایسی آئی جو کہ مشکل میں مبتلا تھی۔ وہ ایسی مریضہ تھی جس نے اپنی بہن کے ساتھ کوئی زیادتی کی تھی اور اب وہ بڑی شدّت کے ساتھ احساسِ جرم میں مبتلا تھی اور اب اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا تھا اور اس کو مشکل پڑ گئی تھی۔“

فرخندہ کہنے لگی کہ میں نے اس خاتون کی کیفیّت سے یہ نتیجہ نکالا کہ انسان زندگی میں خدا کا گناہ کرے، شوق سے کرے، کوئی بات نہیں۔ بندے کا گناہ کبھی نہ کرے کیونکہ خدا کے کسی حکم کی عدولی کی معافی زندگی کے کسی مقام پر بھی مانگی جا سکتی ہے لیکن بندے کے ساتھ کیا گیا گناہ صرف بندہ ہی معاف کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ اختیار بندے کو بھی دیا ہے کہ آیا وہ اُسے معاف کرے یا نہ کرے۔ اب وہ مریضہ کو روگ یہی تھا کہ وہ اپنی بہن سے اس جرم کی معافی نہیں مانگ سکتی تھی جو جرم اُس نے اپنی بہن کا دل دکھا کر یا اُسے پریشان کر کے یا کسی اور طریقے سے کیا تھا۔ اُس کی بہن موجود نہیں تھی اور وہ معافی بھی نہیں مانگ سکتی تھی۔ اب اُس کا مسئلہ یہی تھا۔ اللہ تو رحیم و کریم ہے۔ معافی مانگنے سے یا

معافی نہ مانگنے پر بھی اپنی رحمت سے کسی انسان کی کوتاہی غلطی معاف کر سکتا ہے اور یہ اختیار وہ رکھتا ہے لیکن خدا فرماتا ہے کہ وہ ایسا کوئی گناہ کبھی معاف نہیں کرے گا جو اختیار کسی انسان کو اس نے دے رکھا ہے اور کسی انسان کا دینے دار خدا سے معافی مانگ کر جان خلاصی نہیں کرا سکتا۔ اس طرح والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی سختی سے ہدایت کی گئی ہے۔ حکم ہے کہ اُن کے آگے اُف نہ کرو، لیکن ہم آئے روز ایسی خبریں پڑھتے ہیں کہ بیٹے نے بوڑھے باپ یا ماں کے ساتھ بدسلوکی کی یا زمین کی خاطر بھائی کو مار ڈالا۔ اس طرح کی تکلیف دہ خبریں ہم عموماً پڑھتے ہیں۔

اب یہ ماں باپ ہوتے ہیں جو نہیں چاہتے کہ ان کا بیٹا یا اولاد نافرمان ہو اور دوزخ کا "بالن" (ایندھن) بن جائے اور وہ پھر بھی دُعائیں ہی دیتے ہیں اور اگر ذرا سی تکلیف پہنچے تو ان کا کلیجہ مُنہ میں آجاتا ہے۔ میں نے آج تک کسی ماں کو اپنے بیٹے کو بددُعا دیتے نہیں سُنا۔ ایسی صلہ رحمی کی ضرورت ہے۔ برداشت کرنے کی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مذہبی منافرت کی وجہ سے واقعہ رونما ہوا۔ مذہب تو کسی قتل و غارت کی اجازت نہیں دیتا۔ دنیا کے کسی مذہب نے نہیں کہا کہ کسی بے گناہ کو یا ایسے شخص کو قتل کر دو جو آپ کے دین پر نہیں ہے۔ دین تو کہتا ہے

کہ خود اتنے اچھے بن جاؤ کہ دوسرے مذاہب کے لوگ آپ کے مذہب کو پسند کرنا شروع کر دیں۔ بات عمل کی ہے۔ اگر ہم نے اپنے اندر سے احساسِ جرم ختم کرنا ہے، محبّتوں کے پھول بانٹتے ہیں تو برداشت کا مادّہ پیدا کرنا ہو گا۔ تعصّب اور حسد ختم کرنا ہو گا۔ بے موقع، بے وجہ، تنقید بند کرنا ہو گی لیکن ہمیں تو سکھایا ہی گیا ہے criticism اور تنقید کرنے پر بھی ڈگری ملتی ہے۔ بچّو! میں اُمّید کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں بھی خود کو صلۂ رحمی کی جانب ڈھالنے کی کوشش کروں گا اور ایسے سخت اصولوں پر کاربند نہیں ہوں گا جو ابلیس کے اصولوں تک لے جاتے ہوں۔ اور آپ بھی خود میں ضرور مثبت تبدیلی پیدا کریں گے اور آپ تو پہلے بھی ایسی کوشش کرتے رہے ہوں گے اور اس میں کامیاب بھی رہے ہوں گے۔ البتہ میں نہیں ہو سکا لیکن میں کوشش ضرور کروں گا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

پندرہ روپے کا نوٹ

اب جبکہ میں عُمر کے اس حصّے میں ہوں جب آدمی کچھ کچھ بچّوں جیسا ہو جاتا ہے۔ وہ بچّوں کی طرح ضد کرتا ہے، خواب دیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ ویسا ہی ہو جیسا وہ چاہتا ہے حالانکہ اسے یہ پتہ ہوتا ہے کہ سب کچھ ویسے ویسے نہیں ہو سکتا جیسا وہ سوچ رہا ہے۔ خیر بچّے کو علم ہی نہیں ہوتا کہ ایسا ہو گا یا نہیں۔ اس نے تو ہر اُس چیز کی طلب کرنی ہوتی ہے جو اسے اچھی لگے۔ ہم بھی جب بچّے تھے یا چھوٹے تھے تو ایسے ہی ضد کیا کرتے تھے اور یہ والدین کا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ بچّوں کی جو ضدیں پوری نہیں کر سکتے بچّوں کو کچھ اور دے دلا کر اور اُن کی توجّہ کسی اور چیز کی جانب مبذول کروا کر جان چھڑوا لیتے ہیں۔

خواتین و حضرات! بوڑھے شخص اور بچّے میں اُتنا ہی فاصلہ ہوتا ہے جتنا ایک گہرے پانی میں ڈوبتے ہوئے شخص کا موت سے۔

ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ وہ شخص جس کے بال عمر سے سفید ہوں اور وہ کم

گو ہو وہ بڑا دانا ہو تا ہے۔ وہ اپنی خاموشی سے خود کو بڑھاپے سے محفوظ رکھتا ہے۔ آپ کو ایسے بوڑھے کم ملیں گے جو زیادہ خاموش رہتے ہوں۔ آپ کو زیادہ بُڈھے تو میری طرح کے ہی ملیں گے جو بس اپنا بھاشن جھاڑتے رہتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ نہ کہا تو شاید دنیا کے کام رُک جائیں گے یا سب کچھ بگڑ جائے گا اور وہ ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑانا ضروری سمجھتے ہیں۔

بچّو! اب ایسا بھی نہیں ہے کہ بولنے والے سارے بوڑھے بابا سے ہی خراب ہیں۔ عمر جیسے ہی گزرے تجربات کراتی ہے۔ ہر گزرا دن آنے والے دن کی نسبت بعض اوقات بہتر نہیں بھی ہوتا اور بعض اوقات بُرا نہیں ہوتا۔ جو قومیں ترقّی کرتی ہیں وہ اپنے ماضی کو ساتھ چمٹائے نہیں رکھتیں بلکہ ماضی کی غلطیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کو سامنے رکھ کر اپنے حال میں اور مستقبل میں داخل ہوتی ہیں۔ نوجوانوں کو بھی غلطیاں کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہم بوڑھوں کو اپنی جوانی میں تھا۔ جب تک انسان غلطی نہیں کرے گا وہ اپنی اصلاح کیسے کرے گا۔

میرے ایک دوست کا بیٹا بضد تھا کہ وہ ایکٹر بنے گا لیکن میرا وہ دوست اسے سختی سے، پیار سے، ہر طریقے سے منع کر چکا تھا۔ تنگ آکر مجھے کہنے لگا کہ اسے یہ پریشانی لاحق ہے اور اس کا بیٹا اس کی بات ماننے سے معذرت خواہ ہے۔

میں نے دوست سے کہا ”یار تو اسے کیوں منع کرتا ہے؟“

کہنے لگا کہ ”میں نے بھی اپنے کالج کے زمانے میں اداکاری کی کوشش کی تھی لہٰذا میں ناکام رہا تھا۔ اس لیے یہ بھی ناکام رہے گا اور اسے یہ فیلڈ یا Profession اختیار نہیں کرنا چاہیے۔“

میں نے کہا کہ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ناکام رہے تھے تو یہ بھی ناکام رہے گا۔“

لیکن وہ بضد تھا کہ وہ جو سمجھتا ہے وہ ہی درست ہے۔

ہمارے ہاں یہ ایک مسئلہ ہے کہ ہم اپنی اولادوں کو وہ بنانے کے لیے متفکّر رہتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں۔ کسی حد تک ٹھیک بھی ہوتا ہے لیکن یہ بالکل ہی ٹھیک نہیں ہوتا۔

مجھے ایک بار ٹرین سے لاہور سے باہر جانے کا اتفاق ہوا۔ میں جس ڈبّے میں سفر کر رہا تھا اس میں ایک بوڑھا بھی بیٹھا تھا۔ اُس کی عمر مجھ سے کافی زیادہ تھی۔ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور بوسیدہ سے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اُس کے جسم سے عجیب سی Smell آ رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ شاید وہ دن بھر جسمانی مشقّت کرتا

رہا ہے اور بار بار کپڑے پسینے میں شرابور ہونے کے باعث اس سے ایسی "ہمک" (بدبُو) آرہی ہے۔

میں حسبِ عادت اس سے باتیں کرنے لگا۔ گو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی لیکن تجسس کی حس بیدار ہوئی اور میں اس سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے کہا "بابا کہاں جانا ہے۔"

اب وہ شخص مُسکرایا اور کہا "گھر۔"

اب میں کچھ تلملایا بھی لیکن مجھے لگا کہ وہ کوئی عام شخص نہیں بلکہ کوئی بابا ہے جو اس نے مجھے اتنا مختصر اور جامع جواب دیا ہے۔

میں اس کے ذرا قریب ہو گیا اور کہا کہ "جوانی اچھی ہوتی ہے یا بڑھاپا؟"

اس نے کہا "جوانوں کے لیے بڑھاپا اور بوڑھوں کے لیے جوانی"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

بولا "بوڑھے اگر جوان ہو جائیں تو وہ اپنی پہلے والی غلطیاں شاید دوبارہ نہ دہرائیں اور اگر جوان بوڑھوں کو تجربے کے طور پر لیں تو ان کی جوانی بے داغ اور بے

عیب گزرے۔"

اس بوسیدہ کپڑوں والے بوڑھے نے اتنی وزنی بات کی تھی کہ بڑے مفکّر اور دانشور ایسی بات نہیں کر سکتے۔

یہ بات اس کے تجربات کا نچوڑ تھی جو اس نے مجھ جیسے کم فہم آدمی سے کر دی۔

خواتین و حضرات! بوڑھوں پر تمام تنقید چھوڑ کر اور ان کی باتوں سے بیزاری کو ایک طرف رکھ دیں اور تھوڑا سوچیں کہ ہمیں بڑوں کے حوالے سے اور ان سے سلوک بارے کیا حکم دیا گیا ہے۔

غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ خداوند کریم نے اپنے نبیوں کو نبوّت عموماً بڑی عُمر میں دی۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی نبوّت کا اعلان چالیس برس کی عُمر میں کیا۔

اور حکم ہے کہ "بچّوں پر شفقت کرو اور بوڑھوں کا احترام کرو۔"

یہ عام بات نہیں ہے۔ اس کے پیچھے بڑے معانی پوشیدہ ہو سکتے ہیں۔

جب کسی معاشرے میں یا ملک میں اولاد والدین سے عاجز آجاتی ہے اور بزرگوں

کولاوارث قرار دے کر Old Homes میں بھرتی کروادیا جاتا ہے تو قوموں کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ میرا یہ بات کرنے کا مقصد آپ کو ڈرانا نہیں ہے بلکہ بتانا ہے کہ اس سے بگاڑ جنم لینے لگتا ہے۔

ایک شخص جو اپنے بوڑھے باپ سے بہت تنگ تھا ایک دن اسے کمر پر لاد کر گھر سے باہر نکلتا ہے اور چلتے چلتے وہ دونوں دریا پر پہنچ جاتے ہیں۔

وہ شخص پانی میں اُترتا ہے اور گہرے پانی میں جانے لگتا ہے۔

اور ایک مقام پر اس کا بوڑھا باپ اپنے بیٹے سے پوچھتا ہے کہ "بیٹا کیا کر رہے ہو؟"

وہ جواب دیتا ہے کہ میں تیری روز روز کی بڑبڑ سے تنگ آکر تجھے دریابرد کرنے آیا ہوں (یا ہو سکتا ہے اس نے اپنے باپ کو کوئی اور جواب دیا ہو) اور سوچ رہا ہوں کہ تجھے ذرا گہرے پانی میں پھینکوں تاکہ تو جلدی ڈوب جائے۔ تو اس کا بوڑھا باپ جواب دیتا ہے "بیٹا جس جگہ تو مجھے پھینک رہا ہے یہاں نہ پھینکنا بلکہ ذرا اور آگے اور گہرے پانی میں پھینکنا۔"

بیٹا پوچھتا ہے کہ "کیوں یہاں کیوں نہ پھینکوں؟"

اس کا باپ کہتا ہے کہ "اس جگہ میں نے تمہارے دادا اور اپنے باپ کو پھینکا تھا۔"

یہ سُن کر اس کا بیٹا اپنے باپ کو واپس گھر لے آتا ہے کیونکہ وہ سوچتا ہے کہ جب وہ بوڑھا ہو گا تو اس کی منزل اس سے بھی گہرا پانی ہو گا جہاں وہ اپنے باپ کو پھینکنے والا تھا۔ ادلے کا بدلہ تو ہونا ہی ہوتا ہے نا!

ایک شخص بہت غریب تھا۔ زندگی اس پر بہت مشکل ہو گئی تھی لیکن اس کے پاس ایک فن تھا۔ وہ یہ کہ وہ نوٹ جسے آپ کرنسی نوٹ کہتے ہیں بنانے کا ماہر تھا۔ اب طبیعت بھی اس کی فقیرانہ قسم کی تھی اور اس وجہ سے وہ بالکل تنگ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نا اسے بیچ ڈالے اور اس پر آسودگی کے دن آجائیں۔ اس نے ایک دن اپنا کل اثاثہ جو فقط زمین کا ہی ٹکرا تھا بیچ ڈالا۔ اس سے دو لاکھ کے کرنسی نوٹ بنا ڈالے اور اس نے اتنی بڑی دولت ہاتھ آجانے پر اسے دھڑ ادھڑ خرچ کرنا بھی شروع کر دیا اور اس کے پاس تمام کے تمام پیسے ختم ہو گئے۔ اب اس کے پاس اتنی ہی سیاہی اور کاغذ رہ گیا کہ وہ اس سے ایک ہی نوٹ بنا سکتا تھا اور ایک مجبوری بھی کہ وہ اس سے کوئی بڑی مالیت کا نوٹ بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ چلیں کوئی

چھوٹا نوٹ ہی بنا لیا جائے اور اس سے کچھ ضروری سامان خرید کر زیادہ نوٹ بنا لیے جائیں۔

اس نے نوٹ بنانے کی کوشش کی۔ وہ چونکہ پریشانی اور کوفت کی اذیّت اور کیفیّت سے گزر رہا تھا، جب اس نے نوٹ بنایا تو وہ پندرہ روپے کا نوٹ تھا۔ اس کے لیے ایک نئی مصیبت یہ کھڑی ہو گئی کہ نوٹ بھی بن گیا ہے لیکن وہ پندرہ روپے کا تھا جو چل ہی نہیں سکتا تھا اور اگر اس نے چلانے کی کوشش کی تو پکڑے جانے کا بھی اندیشہ تھا۔

وہ کئی دن شش و پنج میں رہا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس نوٹ کو ایسے آدمی کے پاس خرچ کرے گا جو یہ نہ جانتا ہو کہ پندرہ روپے کے نوٹ کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور کسی بھولے شخص کے پاس خرچ کر کے کام چلا لیا جائے۔ اس نے ایک بوڑھا اور بھولا قسم کا آدمی تلاش کیا اور کہا کہ "بابا اسے پندرہ روپے کا چینج یا چھُٹا چاہیے۔"

اس بوڑھے نے نوٹ کو غور سے دیکھا اور اس شخص کو دو نوٹ تھما دیئے۔

وہ شخص اپنی ذہانت اور مکّاری پر ناز کرتا اور عقل پر اِتراتا ہوا جلدی جلدی وہاں

سے چل دیا کہ اگر رُکا رہا تو معاملہ ہی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

جب اس نے گھر یا وہاں سے دُور جا کر مُٹھّی کھولی تو اس میں دو ساڑھے سات سات روپے کے نوٹ تھے۔

خواتین و حضرات! اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہم اپنے طور پر بڑی چالاکی سے کچھ کرتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ اُلٹ نکلتا ہے۔ پھر ہم وہ سوچتے ہیں جو نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ میں پہلے پروگراموں میں بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہم "چاہیے" پر بڑی توجّہ دیتے ہیں کہ جی ایسا ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم کوئی کام کر کے کہیں کہ ایسا ہونا چاہیے تھا اور میں نے یہ کر دیا ہے۔ ہماری زندگی پر بڑھتا ہوا بوجھ ہمیں ایسا کچھ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ خواب دیکھنے ضرور چاہئیں لیکن اِن خوابوں کی تعبیر کے لیے جدوجہد اور تگ و دو بھی ضروری ہے۔

میں کئی سالوں سے اس جدوجہد میں ہوں کہ Dieting کروں گا۔ اس کے لیے کبھی دل سے جدوجہد نہیں کی اور یہ عمل نہیں کر سکا۔ اگر کیا بھی ہے تو بہت ہی قلیل عرصے کے لیے اور اب میں نے یہ خیال ہی دل سے نکال دیا ہے کہ مجھے Dieting بھی کرنی چاہیے۔

اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جو بھی ملا ہے جی بھر کے کھانا ہے، بے وقت کھانا ہے اور یہ فکر نہیں کرنی کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ میرے پوتے پوتیاں مجھے کہتے ہیں کہ دادا یہ نہ کھائیں، آپ موٹے ہو جائیں گے۔ جسم میں کولیسٹرول بڑھ جائے گا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر میں خود کو ایسی چیزوں سے مکمل روک نہیں سکتا تو نہیں روکوں گا۔ ساری بدپرہیزی کروں گا۔

میں آپ کو نہیں کہتا کہ آپ خواب نہ دیکھیں یا ڈائٹنگ نہ کریں۔ ضرور کریں، لیکن جس طرح آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا باہر کا جسم خوبصورت ہو، جاذب، نظر ہو، اس طرح کوشش اس بات پر بھی ہونی چاہیے کہ آپ کا اندر بھی اُجلا اور خوبصورت ہو۔ ہماری کئی بیماریاں صرف اس لیے ہیں کہ ہم خوراک بھی اچھی کھاتے ہیں۔ چہرے یا جسم کی خوبصورتی کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں، صبح کی سیر بھی کرتے ہیں۔ پھر بھی بیکار رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بیماری وارد ہو جاتی ہے۔

ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ باہر کے جسم کو بیماریوں سے بچانے کے لیے اپنے اندر کو بیماریوں سے مُبرّا کرنا چاہیے۔

درخت جس کے اندر بیماری ہو اور اس کو گھُن لگا ہوا ہو اور اندر ہی اندر سے وہ

کھوکھلا ہوتا جارہا ہو اور ہم اس کی اصل بیماری کا علاج کرنے کی بجائے اسے باہر سے سپرے کرتے رہیں۔ اس پر روشنیاں یا بلب لگا دیں تو ہم اس سے درخت کے اندر کی بیماری نہیں روک سکتے۔ وہ تب ہی ٹھیک ہو گا جب ہم اس کی جڑوں یا تنوں کی مٹّی کھود کر اس میں چونا ڈالیں گے۔ کیڑے مار ادویات ڈالیں گے اور اسے پانی دیں گے۔ ایسا ہی انسان کا حال ہے۔

اس کے لیے ضرورت ہے کہ آپ اپنے اندر اپنی روح کا احاطہ ضرور کیا کریں اور دن میں کسی بھی وقت اکیلے بیٹھ کر اپنی Self Purgation کا اہتمام ضرور کیا کریں۔ آپ نے بچّوں کو دیکھا

ہو گا۔ بچپن میں لڑکیاں گڈیاں پٹولے بناتی ہیں اور آئے روز اُن کی صفائی ستھرائی کرتی ہیں۔ اپنی گڑیوں کے بال سنوارتی ہیں۔ اگر اُن کی گڑیا کے اندر جمع پرانے کپڑوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں وہ باہر نکل آئیں یا ہاتھ لگ لگ کر خراب ہو جائیں تو اُن کی اس گڑیا کی بیرونی خوبصورتی اور اکڑ پن میں بھی فرق آتا ہے۔ چاہے ان کے اوپر کتنا ہی بناؤ سنگھار نہ کیا جائے۔ جب ہم بچّے تھے تو گُڈّے اور گُڈّی کی شادی پر جب کسی بات پر اُلجھ پڑتے تھے تو ایک سِرے سے ایک گُڈّی کو پکڑ لیتا اور دوسرے سِرے سے دوسرا۔ اس طرح وہ بیچاری گُڈّی

ڈھلک جاتی۔ ہماری زندگی بھی اس گُڈّی اور گُڈّے کی طرح سے ہی ہے۔ اس کے اندر کا بناؤ سنگھار بھی اتنا ہی ضروری ہے جس قدر باہر کا۔

ہمارے بزرگ بھی ایک بڑی نعمت ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں ابھی ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ یہ احترام رہنا ضروری ہے۔ یہ بوڑھے اور بزرگ اسی اثاثے کی طرح سے ہیں جس طرح اس نوٹ بنانے والے کے پاس آخری نوٹ بنانے کا سامان اور بچّوں کے لیے گُڈّی اور گُڈّا اثاثہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم نے بھی پندرہ روپے کا نوٹ بنا ڈالا تو پھر بات نہیں بنے گی۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

”دو بول محبّت کے“

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

یہ زندگی بھی ایک عجیب و غریب شے ہے۔ اس کے مختلف سوالوں کا جواب ہاں میں نکلتا ہے۔ یہ بات ہمیں بابوں کے پاس بیٹھ کر معلوم ہوئی۔ اگر زندگی حساب کا کوئی سوال ہوتی تو پھر ظاہر ہے کہ بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ جاتی۔

یہ جو مرید ہوتے ہیں، اِن میں جو اچھے اور باصفا اور نوجوان مریدین ہوتے ہیں، وہ بڑے طاقتور ہوتے ہیں اور وہ اپنے مرشد، گرو یا اپنے پیر سے بڑے سخت قسم کے سوال پوچھتے ہیں۔

ایک روز ہم ڈیرے پر بیٹھے تھے کہ ایک اچھی پگڑی باندھنے والا، شُستہ قسم کے مرید نے پوچھا کہ بابا جی بات یہ ہے کہ انسان اپنی کوشش اور محنت سے تو کہیں نہیں پہنچتا، اس کے اوپر ایک خاص قسم کا کرم ہوتا ہے اور اسے کوئی چیز عطا کر دی جاتی ہے اور پھر وہ اس اعلیٰ مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔

اس پر بابا جی نے کہا" شاباش تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

وہ شخص بات سُن کر بہت ہی خوش ہوا۔ ایک دوسرا مرید یہ ساری باتیں سُن رہا تھا۔ وہ ذرا تگڑا آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ یہ غلط بات ہے۔ انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے اپنی جدوجہد سے ملتا ہے۔ کچھ پانے کے لیے Effort کرنی پڑتی ہے۔ اسے حکم کو ماننا پڑتا ہے۔ Order کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ اس نے کہا کہ پیغمبروں کو بھی ایک مخصوص Pattern پر چلنا پڑا اور کوشش کرنی پڑی۔ پھر جا کر ایک مقام ملا۔ ایسے ہی مقام نہیں ملا کرتے۔

بابا جی نے اُسے بھی کہا کہ "شاباش، تو بھی ٹھیک کہتا ہے۔"

وہاں پر ایک تیسرا مرید جو لنگر کے برتن صاف کر رہا تھا۔ اُسے یہ سُن کر بہت عجیب سا لگا اور کہنے لگا کہ "بابا جی آپ نے حد کر دی۔ یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے کہ دونوں کی بات ہی ٹھیک ہو۔ کسی ایک کی بات تو غلط ہونی چاہیے۔"

یہ سُن کر بابا جی نے کہا کہ "شاباش تو بھی ٹھیک ہے۔"

یہ زندگی کی بات ہے جو بندے کی پکڑ میں نہیں آتی اور یہ جس کی پکڑ میں آتی ہے وہ اس کی سوچ کوشش اور دانش کے رویّے کے مطابق اس کے ہاتھوں میں

بنتی رہتی ہے۔

ہم ”دانش مند“ اور پڑھے لکھے لوگ یہ کرتے ہیں کہ ایک مفروضہ یا سوال سامنے رکھتے ہیں اور پھر ہم طے کر دیتے ہیں کہ اس کا صرف یہی جواب ہے۔ حالانکہ ایک سوال کے جوابات ہو سکتے ہیں۔ جس زمانے میں ملک اٹلی میں تھا تو وہاں Scandinavian Countries میں خاص طور پر ڈنمارک میں خُودکُشیاں بہت بڑھ گئیں اور خواتین و حضرات! دنیا میں سب سے زیادہ خُودکُشیاں Scandinavian ملکوں میں ہوتی ہیں۔ جتنا ملک Rich ہو گا اُتنی ہی وہاں خُودکُشیوں کی شرح زیادہ ہو گی۔ سب سے اعلیٰ درجے کی امیر ترین اور قیمتی قسم کی خُودکُشی سکینڈے نیوین ملکوں میں اور اس کے بعد جاپان میں ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی بہت امیر ہے۔ خوشی کا امارت کے ساتھ خاص تعلّق ہوتا ہے۔ مجھے وہاں جا کر یہ پتہ چلا کہ خُودکُشی تو امیروں کا کام ہے۔ میں بڑا پریشان تھا کیونکہ میری عقل و دانش کم تھی اور سوچ چھوٹی تھی۔ میں نے اپنے اُستاد یا گائیڈ پروفیسر اونگارتی سے کہا کہ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امیر ملکوں میں خُودکُشی زیادہ ہو۔“

سب کو یہاں کھانے پینے کو اچھا مِل رہا ہے۔ طبّی سہولتیں ہیں۔ تمام تر آسائشیں

میسر ہیں تو جان جیسی پیاری چیز کو کیوں کوئی ضائع کر دیتا ہے اور بالکل Nothingness کے حوالے جان جیسی پیاری وخوبصورت چیز آخر کیوں کر دی جاتی ہے۔

تو وہ کہنے لگے کہ ”آدمی خُودکُشی اُس وقت کرتا ہے جب جس گروہ کے درمیان وہ رہتا ہے وہ گروہ اُس کی بات سُننے سے اپنے کان بند کر لے، انکار کر دے۔ ہر انسان اپنا دکھ درد بیان کرنے اور بات کرنے کی آرزو رکھتا ہے۔“

مغربی ممالک میں ایسے ماہرینِ نفسیات ہیں جو پیسے لے کر لوگوں کی باتیں سُنتے ہیں۔ کسی سے تین سو ڈالر لے لیے اور کہا کہ اب آپ کے پاس ایک گھنٹہ ہے باتیں کرو اور وہ شخص پیسے دے کر بکواس کرتا چلا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے باپ نے مارا، میری امّی ایسی تھی، بڑے ظلم ڈھاتی تھی اور مجھے سوسائٹی کے خلاف بڑا غصّہ ہے۔

وہ ماہرِ نفسیات انہیں اکثر یہ کہتے کہ اگر تمہیں ماں یا باپ کے خلاف غصّہ ہے تو گھر میں ایک پِلّر یا کھمبے پر تکیہ باندھ کر اس پر ماں یا باپ جس کے خلاف بھی غصّہ ہے اس کی تصویر لگاؤ اور اسے خوب ہنٹر مارو تاکہ غصّہ نِکل جائے۔

ماہرینِ نفسیات کے اِن تمام مشوروں کا بھی کچھ زیادہ اثر نہ ہوا کیونکہ جو شخص بات کرنا چاہتا ہے، دکھ بیان کرنا چاہتا ہے، ہنٹر مارنے سے تو غصّہ مزید بڑھے گا ہی نا!

جب بھی کسی معاشرے میں آپ کو خبر ملے کہ وہاں پر لوگ خُودکُشی کرنے لگے ہیں تو مت اس بات کی طرف لوٹ کے جاؤ کہ اُن کے پاس کھانے کے لیے کم ہے۔ وہ تو سب کے پاس ہی کم ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر امیر ملک کے لوگ خُودکُشی کیوں کریں۔

اگر کسی معاشرے میں خُودکُشیاں بڑھیں تو اس کا ذمّہ دار اپنے آپ کو ٹھہرایئے اور جان لیجئے کہ کوئی مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے، اپنا دکھ بیان کرنا چاہتا ہے اور میں اس کا دکھ سُننے کا وقت نہیں رکھتا۔ خُودکُشی اس کی بنیادی وجہ ہے۔

ہمارے ہاں بھی اکثر یہ چرچا رہا ہے کہ فلاں بھوکا تھا اور خُودکُشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اب بھی ایسی باتیں ہوتی ہیں۔

ایسی بات ہرگز نہیں کہ کوئی بھوکا مرتا خُودکُشی کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ کیسوں میں یہ عنصر ہو لیکن مجموعی طور پر اور غالب عنصر یہی ہوتا ہے کہ ہماری

کوتاہیوں کی وجہ سے کوئی موت کو گلے لگاتا ہے۔

ہم اپنے اپنے کاموں اور غرض کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں اور ہمارے پاس کسی دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے اور لوگ اُن کندھوں کو تلاش کرتے پھرتے ہیں جن پر وہ اپنا ماتھا رکھ کر رو سکیں۔ یہ کوتاہی معاشرے کی ہے۔

اگر کسی لڑکی کی شادی زبردستی اُس کی مرضی کے بغیر ہو رہی ہے اور وہ رونا چاہتی ہے، کسی ماما، چاچے، دوست، پروفیسر، اُستاد کو بتانا چاہتی ہے کہ اُسے یہ دکھ ہے لیکن وہ سارے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے، دفع ہو جا۔

اب وہ بیچاری خُودکُشی نہیں کرے گی تو اور کیا کرے گی۔ جب زندگی اور آواز کا پنجرہ اتنا تنگ کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس میں محبوس ہو جاتا ہے اور اس کا سانس گھُٹنے لگتا ہے تو وہ پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں بھی یہ کوتاہی بڑی شدّت سے رونما ہو رہی ہے اور ہمارے لیے یہ بڑا لمحۂ فکریہ ہے۔ اس کی طرف توجّہ دی جانی چاہیے۔ یہ کام حکومتیں نہیں کیا کرتیں۔ حکومتیں تو بے معنی سے کام ہی کرتی ہیں کہ سڑکیں بنالو، پرانی عمارتیں گرالو، فارن ریلیشنز بنانے میں ہی دھکے کھانا اس کا کام ہے۔

انسانوں کو جوڑنا اور انسانوں کے ساتھ تعلّق رکھنا سوسائٹی کا کام ہے۔ وہ سیمینار میں بھی لوگوں کا دکھ سُنتے ہیں اور پیسے لے کر بھی گھنٹوں کے حساب سے لوگوں کی بات اور درد سُنتے ہیں۔ وہ معاشرے جن کی بڑی تعریفیں ہوتی ہیں، انہوں نے خود کو آپس میں جوڑا ہوا ہے۔

یہ بابے تو کچھ نہیں کرتے۔ یہ کوئی معجزے یا کشف کے ماہر نہیں ہوتے۔

یہ چھو کر کچھ ٹھیک کرنے کا ملکہ نہیں رکھتے۔ یہ ایسے ہی بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ اپنی طرز کے سائیکو تھیراپسٹ ہوتے ہیں۔ وہاں لوگ اپنا دکھ لے کر جاتے ہیں۔

میں گزشتہ دنوں ایک بابے کے پاس گیا ہوا تھا۔ یہ میں نے ایک اور بابا تلاش کیا ہے جو چوہنگ کے پاس رہتا ہے۔ وہاں ایک شخص نے کہا کہ اس نے ۴۰ ہزار کی کمیٹی ڈالی تھی لیکن کوئی

سارے پیسے لے کر بھاگ گیا ہے۔

بابا جی نے سب سے کہا کہ "دُعا کرو کہ محمد شریف کی خدا مدد کرے اور اس ظالم کا کوئی بندوبست کرے۔" وہیں پر ایک آدمی بولا کہ "کمیٹی کس کے پاس ڈالی

تھی۔"

اُس نے کہا کہ "فلاں بندے کے پاس ڈالی تھی۔"

اس شخص نے کہا کہ "وہ اس شخص سے بات کرے گا اور تین دن کے اندر تجھے پیسے واپس نہ دِلوا دیئے تو پھر کہنا۔"

دیکھئے اس طرح ایک رُخ پیدا ہو گیا۔ ایک بندے نے دکھ بیان کیا اور دوسرے نے اس کے دکھ کے مداوے کی بات کی۔

اس میں بابے نے کچھ نہیں کیا تھا۔

وہیں پر ایک شخص نے کہا کہ "بابا جی میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

بابا جی نے کہا کہ "بھئی علیحدگی میں کیوں بات کرتے ہو، یہیں کرو۔"

اس نے کہا کہ "میں عزّت دار آدمی ہوں۔ میں نے بات خفیہ طریقے سے ہی کرنی ہے۔"

بابا جی نے کہا کہ "سارے ہی عزّت دار ہیں اور عزّتیں سب کی ساتھی ہیں۔ تم

گھبراؤمت بلکہ بات کرو۔"

اس نے کہا کہ "جی میں ایک جگہ کام کرتا تھا۔ وہاں کے کارخانے دار نے مجھے نوکری سے نکال دیا ہے۔ وہ بڑا ظالم تھا۔ وہ بیچارہ وہاں سے آٹھ دس ہزار روپے لیتا تھا۔

اس نے کہا کہ اب اس کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور میں نے جو قرضہ لیا ہوا ہے، اس کا ماہانہ Interest یا بیاج جو ہے وہ بائیس سو کے قریب ہے، وہ ادا کرنا مشکل ہو گیا ہے جس کے باعث میں چاہتا ہوں کہ مر جاؤں۔ آپ براہِ کرم اس کے لیے دُعا کریں۔

وہاں بیٹھے چالیس پچاس لوگوں پر تکلیف دہ ہیبت طاری ہو گیا۔ وہاں ایک میجر صاحب بیٹھے تھے۔

انہوں نے اس شخص کو اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ تم پرسوں آجانا اور پرسوں سے اپنے آپ کو ملازم سمجھو۔ میری یونٹ میں ایک ملازم کی ضرورت ہے۔ وہاں تمہیں زیادہ تو نہیں ساڑھے پانچ ہزار ملا کریں گے۔

یہ سُن کر اس شخص کا چہرہ خوشی سے ٹمٹما اُٹھا۔

انسان کا انسان سے دکھ بیان کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے۔ میری اِن باتوں پر کچھ لوگ اعتراض بھی کرتے ہیں۔ ان کا ہو سکتا ہے یہ اعتراض درست بھی ہو اور وہ کہتے ہیں کہ میں اس جدید دَور میں کیسی بابوں کی باتیں لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔ لاہور میں نیو کیمپس کے پاس ایک سندھی بابا تھے۔ ان کا حضرت سخی سائیں غازی نام تھا۔ میں کبھی کبھی اُن کے پاس جاتا تھا۔ بڑی دیر کی بات ہے۔ تب نہر کا پُل نہیں تھا اور وہاں ایک شہتیر رکھا ہوا تھا جو پُل کا کام کرتا تھا۔ اس پر بڑا بیلنس کر کے گُزرنا پڑتا تھا۔ ایک بار میرے ساتھ میری بیوی بانو قدسیہ بھی گئی اور اس پُل سے گرتے گرتے بچی۔ اس کے بعد میں نے اُسے منع کر دیا کہ آپ کنارے پر کھڑی رہا کریں ہم مِل کر آجایا کریں گے۔ حضرت سخی سائیں کا ایک اچھا ڈیرہ تھا۔ بڑا خوبصورت اور صاف ستھرا ڈیرہ تھا۔ وہاں ہر وقت پتہ نہیں کیوں ایک کوئل بولتی رہتی تھی۔ وہاں ایک دن ایک بندہ آیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی تھی۔ اس نے وہاں آکر کہا کہ "جی میں پانی پینا اے۔"

بابا جی نے کہا کہ "لو جی ایہنوں چاء پیاؤ، خدائی مہمان آیا اے۔"

(اسے چائے پلائیں یہ خدا کا مہمان ہے کیونکہ ہم نے تو بلایا نہیں اسے خدا نے ہمارے پاس

بھیجا ہے)۔

اسے چائے پلائی گئی اور اس کے ساتھ سوکھے بسکٹ (رسک) بھی دیئے گئے۔

سندھی سائیں اس سے پوچھنے لگے کہ "کہاں جارہے ہو۔"

اُس نے کہا کہ "جی میں لاہور جارہا ہوں۔"

اُس نے بتایا کہ "میرے ساتھ میری بیٹی ہے۔ اسے بیاہے ہوئے چار پانچ ماہ ہوئے ہیں۔ اِس کو سسرال والوں نے مارا پیٹا ہے۔"

خواتین و حضرات! میں نے سُسرال میں یہ دیکھا ہے کہ ساس اتنی بُری نہیں ہوتی۔ ایک چڑیلیں ننانیں (نندیں) بھی ہوتی ہیں۔ وہ بڑا پیچھے پڑتی ہیں۔

اس نے بتایا کہ "میں نے اس کا اب کاغذ (طلاق) لے لینا ہے۔"

سائیں صاحب کہنے لگے کہ "نا بھئی نا۔ تم اس کا کاغذ نہیں لوگے۔"

"ایہہ ساڈھی دھی اے، ایہہ ہُن بابا تیری دھی نہیں، اسیں جانئے تے ساڈا کم جانے۔"

وہ لڑکی روتی آرہی تھی۔ یہ سُن کر وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

بابا جی نے کہا ”بیٹی اب جو بھی تجھے تکلیف ہو تم نے آکر ہم سے بیان کرنی ہے۔ اپنے ابّے سے بات نہیں کرنی جو چیز چاہیے اب ہم سے ہی لینی ہے اور ہمیں ہی بتانا ہے۔“

اس کے بعد بابا جی نے وہاں بیٹھے ایک گاؤں کے ذیلدار سے کہا کہ ”تم گھوڑے پر کاٹھی ڈالو اور اس گاؤں کے ذیلدار سے جا کر کہو کہ یہ ہماری بیٹی ہے جسے تم نے نکال دیا ہے۔ اس کے ذمّہ دار تم ہو۔“

وہ کوئی پانچ چھ میل دُور تھا۔ میں اب سوچ رہا تھا کہ ذیلدار گاؤں کا سردار ہوتا ہے۔ یہ کیسے

جارہا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ”آپ کیوں جارہے ہیں۔“

تب وہ کہنے لگا کہ ”جی امر ہو گیا ہے۔“

اب وہ لڑکی وہاں بیٹھی تھی۔ جب شام کو اس کے باپ نے کہا کہ چلو بیٹی چلیں تو

اس نے کہا نہیں ابّو میں نے نہیں جانا۔ مجھے واپس میرے سسرال چھوڑ آئیں۔ اس کے باپ نے کہا کہ ”تو کمال پئی کرنی ایں، تینوں مارن کُٹّن گے۔“ لیکن اس لڑکی نے کہا کہ ”نہیں مجھے چھوڑ آئیں۔“

بابا جی بڑے خوش ہوئے، کہا کہ ”کسی کی جرأت نہیں کہ ہماری بیٹی کو ہاتھ لگائے۔ ہم خود چھوڑ کر آئیں گے۔“

خواتین و حضرات! کوئی معجزہ نہیں ہوا۔ بابا جی نے کچھ نہیں کیا۔ بس ایک بندے نے ایک بندے کی بات سُنی اور مسئلہ حل ہو گیا۔ بچّو! میں جعلی لوگوں کی بات نہیں کر رہا۔ آرمی کا ایک اصلی میجر ہوتا ہے اور ایک نقلی۔ وردی پہن کر دکانوں سے پیسے لے جاتا ہے۔ وہ اصلی میجر یا تھانیدار نہیں ہوتا، بلکہ نقلیا ہوتا ہے۔ میں اصل لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔

یہ وہ وقت ہے جو انتہائی خوفناک اور خطرناک ہے جس میں ہمیں حکومت کو ایک طرف کر کے خود آگے بڑھ کے اُن لوگوں کے لیے جینا کیسا، گندا مندا کندھا تیار کرتا ہے جس پر وہ سر رکھ کر رو سکیں اور کچھ نہیں دینا۔ ایک پیسہ بھی نہیں دینا۔ بس دتے میں سے دینا ہے۔ وہ گروہِ انسانی جو ہمارا ہے کچھ لگتا ہے ہم جس میں

سے ہیں انہیں وقت دینا ہے۔ وگرنہ صُورتِ حال گھمبیر اور خطرناک ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دہشت گردی نفسیاتی الجھن کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، جس نے انسانوں کو ایک دوسرے سے دُور کر دیا ہے اور اُن کے درمیان یگانگت اور محبّت ختم کر دی ہے۔ لیکن اس کے لیے ایسے ہی کوشش کرنی پڑے گی جس طرح سویّاں بٹنے اور روٹی پکانے کے لیے کرنی پڑتی ہے۔

آئندہ سے ہمیں یہ کوشش ضرور کرنی چاہیے اور میں یہ بات اپنے آپ سے زیادہ کہہ رہا ہوں کیونکہ آپ کو تو خدا نے یہ صلاحیت دی ہے کہ آپ دوسروں کے لیے ہمدردی رکھتے ہیں۔ مجھ میں شاید یہ کمی ہے۔

ایک دن میں اپنے پوتے سے کہہ رہا تھا کہ "بلال میاں، میں اپنے اللہ کو مان کے مرنا چاہتا ہوں۔"

وہ کہنے لگا کہ "بابا تم تو بہت اچھے آدمی ہو۔"

میں نے کہا "نہیں مجھے میرے ابّا جی نے کہا تھا کہ ایک اللہ ہوتا ہے اور میں نے یہ بات مان لی اور اللہ کو ماننے لگا۔"

میں اللہ کو خُود سے ڈائریکٹ ماننا چاہتا ہوں۔ بس خدا پر یقین کی ضرورت ہے۔

میرے ابّا جی بتایا کرتے تھے کہ ایک دن اُن کے ساتھ دفتر میں کام آنے والے ملازم کی تنخواہ چوری ہو گئی تو سب نے کہا کہ یار بڑا افسوس ہوا۔ تو وہ کہنے لگے کہ ”خدا کا شکر ہے نوکری تو ہے۔“

ایک ماہ بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کی نوکری بھی چلی گئی۔

لوگوں اور ابّا جی نے ان سے افسوس کیا تو کہنے لگے۔ ”خدا نے اپنا گھر دیا ہے۔ اندر بیٹھ کر اچار روٹی کھالیں گے۔ اللہ کا فضل ہے۔ پرواکی کوئی بات نہیں۔“

یہ خدا کی طاقت تھی۔

مقدمے بازی میں کچھ عرصے بعد اس کا گھر بھی فروخت ہو گیا۔

وہ پھر بھی کہنے لگا کہ ”فکر نہیں میرے ساتھ میری بیوی ہے۔ یہ بیالیس سال کا ساتھ ہے۔“ بیوی فوت ہوئی تو اس نے کہا کہ ”کوئی بات نہیں میں تو زندہ سلامت ہوں، تندرست ہوں۔“

وہ شوگر کا مریض تھا۔ اس کی ایک ٹانگ کٹ گئی۔ میرے والد نے کہا کہ ”بہت بُرا ہوا۔“

اس نے کہا "ڈاکٹر صاحب ایک ٹانگ تو ہے۔"

بیماری بڑھنے کے بعد اس کی دوسری ٹانگ بھی کٹ گئی۔

میرے والد بتاتے ہیں کہ جب وہ فوت ہوا تو اس نے اپنی بہو سے کہا کہ "بیٹا کمال کا بستر ہے، جس پر میں فوت ہو رہا ہوں۔ کیا خوبصورتی سے اس چارپائی کی پائنتی کی ہوئی ہے۔ مزا آرہا ہے۔"

ایسی طاقت اور قناعت پسندی کی ضرورت ہے۔ ایسی طاقت اس وجہ سے حاصل ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے لیے اپنا کندھا بازو یا صرف اپنا کان کھلا رکھتے ہیں اور لوگوں کو سہارا Provide کرتے ہیں۔

میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

Wisdom of the East

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ہمارے بابے کہتے ہیں کہ جب تک دنیا کی ساری لذّتوں سے خود قطع تعلّق نہیں کر لو گے اور انہیں چھوڑ نہیں دو گے، اس وقت تک تمہاری سمجھ میں اصل بات نہیں آئے گی۔ آپ بہت کثیر المقاصد لوگ ہیں۔ سب سے پہلے اپنے مقاصد کا تعین کرنا ہو گا۔ ہم لوگ لذّتوں اور ناحق کے مقاصد پر عمل پیرا ہیں، جیسا کہ میری بیوی کہتی ہے کہ وہ نوکری بھی کرے، روٹی بھی پکائے، آٹا بھی گوندھ لے، ٹیلیفون بھی سُن لے، چُغلی میٹنگ میں بھی شرکت کرے۔ اس کے بعد بازار بھی چلی جائے، درزی سے بھی ہو آئے۔ لیکن ایسے تو نہیں ہوتا ہے نا۔ اتنے سارے مقاصد کو آپ ایک ساتھ کیسے چلا سکتے ہیں یا پا سکتے ہیں۔

وہ کہتے تھے کہ باہر کے سارے پَٹ بھیڑ (بند کر دو) دو تو پھر اندر کا دروازہ کھلتا ہے۔ جب باہر کے پَٹ کھلے رہیں گے تو اندر کا دروازہ نہیں کھلے گا۔ ہم بابا جی سے

ضد کیا کرتے تھے کہ بابا جی ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تو ایک خاص وضع کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایک اندازِ زیست پر چل رہے ہیں لیکن وہ بار بار سمجھاتے تھے کہ آپ کو سب راستوں میں سے ایک راستہ ضرور اختیار کرنا ہے۔ بڑا کام کرنے کے لیے ایک راستہ اپنانا ہو گا۔ وہ بڑا کام چاہے روحانیت کا ہو، چاہے انسانیت کا ہو یا مادیت کا، اور چاہے وہ کام دین کا ہوں۔ ہم کئی جگہوں پر خود کو تسلیم کر کے کوئی بڑا کام یا معرکہ نہیں مار سکتے۔ ہمیں اپنے ایک ٹارگٹ کا تعیّن کرنا ہو گا اور پھر آپ نے اس پر نشانہ باندھنا ہے۔ اگر آپ کے ساتھ چھوٹی موٹی لیریں قطریں چمٹی آئیں گی تو اس سے آپ حتمی فیصلہ نہیں کر پائیں گے۔ ہمیں بابا جی کی اس بات کا بڑا دکھ ہوتا تھا۔ حضرت بابا بلھے شاہ سرکار اپنے مرشد شاہ عنایت کے پاس لاہور آئے۔ وہ اپنے مرشد کے پاس عموماً آتے رہتے تھے۔ اپنے مرشد سے کبھی جھگڑا کرتے، کبھی اُن کے سامنے ناچتے۔

ایک بار حضرت بابا بلھے شاہ نے اپنے مرشد سے پوچھا کہ سرکار میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے باطن کے سفر میں اللہ تک جاؤں۔ آپ مجھے بتائیں کہ میں خدا تک کیسے پہنچوں۔ اس پر حضرت شاہ عنایت نے فرمایا کہ ”تمہیں کسی چیز سے محبّت ہے۔“

انہوں نے کہا کہ ”مجھے کسی خاص چیز سے تو محبّت نہیں ہے۔ میں تو سادات کا ایک لاڈلا بچّہ ہوں اور اچھی زندگی بسر کر رہا ہوں۔“

اُن کے مرشد نے کہا کہ ”پھر بھی تمہیں کوئی سی چیز تو اچھی لگتی ہو گی؟“

بابا بلھے شاہ نے کہا کہ ”مجھے اپنی بھینس بہت پیاری ہے۔“

سرکار شاہ عنایت نے کہا کہ ”ٹھیک ہے۔ اللہ کو چھوڑو اپنی بھینس سے ہی محبّت کرو۔“ بلھے شاہ نے فرمایا کہ جی مرشد بہت اچھا۔ آپ نے جو فرما دیا ہم تو اس بات کو مانتے ہیں“ اور تشریف لے گئے۔

اس کے ساتھ پھر کوئی مہینہ چالیس دن وہ اپنے گھر پر رہے۔ پھر مرشد سے ملنے کا خیال آیا تا کہ ان سے ملاقات ہو اور اپنا احوال بھی بیان کیا جائے۔

جب حضرت بلھے شاہ اپنے مرشد شاہ عنایت کے دروازے پر آئے تو محسوس کیا کہ جیسے سینگ دروازے سے نہیں گزر سکیں گے۔ اب وجہ یہ تھی کہ بلھے شاہ نے مرشد کے حکم کے مطابق خود پر بھینس کی کیفیت طاری کر لی تھی اور ان کی ساری ذات بھینس میں بدل گئی تھی۔ جب انسان خود پر اس طرح کی بے اختیاری طاری کر لے جو ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم بھی ساری عمر

اس آرزو میں لگے رہتے ہیں لیکن ہم سے اس طرح کی کیفیت کا پلو پکڑا جاتا نہیں ہے لیکن پیر و مرشد گرو بتاتے رہتے ہیں کہ آپ کو پہلے اپنا آپ پہچاننا ہے اور اپنی ذات کا تجزیہ پہلے کرنا ہے۔ جب آپ اپنی ذات میں موجود چیزوں تک رسائی حاصل کر لیں گے اور انہیں دبوچ لیں گے تو پھر آپ کو آسانیاں ملنی شروع ہو جائیں گی۔

خواتین و حضرات! مجھے واقعی ہی نہیں پتہ ہے کہ میں کون ہوں؟

جب میں چھوٹا سا تھا تو میں ایک معصوم بچّہ تھا۔ پیارا اور اچھا بچّہ تھا۔ نیک اور مخلص ہی تھا۔ میں اپنے آپ کو جانتا تھا۔ اپنے کھلونوں کے حوالے سے اور اپنے ماں باپ کے حوالے سے۔

ایک دن میری خالہ ہمارے گھر آئیں اور انہوں نے مجھے دیکھ کر میری ماں سے کہا ''آپا یہ تو بہت پیارا بچّہ ہے۔ یہ تو بھائی جان جیسا ہے۔'' میں نے پہلی دفعہ یہ بات سُنی کہ میں تو ابّا جی جیسا ہوں۔

اس احساس سے میری معصومیت کم ہونا شروع ہو گئی اور میں ابّا جی بن گیا۔

ایک دفعہ پھر میری دوسری ماسی یا پھوپھی آئیں تو انہوں نے میری تعریف

کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو ماشاء اللہ بڑ ذہین بچّہ ہے اور ذہانت میں اپنے بڑے بھائی سے بھی بڑھ کر ہے۔

میں نے سوچا کہ چلو بات بنی اب تو میں اپنے بڑے بھائی کو بھی کاٹ گیا ہوں۔

خواتین و حضرات! میں آپ لاہور میں بسنے والے اور سب انسان پوری کائنات میں ہر شخص اپنے Self کے بارے میں نہیں جانتا ہے اور سب نے اپنے ارد گرد چھوٹی تختیاں اور سائن بورڈ

لٹکا رکھے ہیں۔ کسی نے سنگلی ڈال کر اس تختی کو گلے میں ڈال رکھا ہے جس پر ذہین لکھا ہے۔ کسی نے رائٹر، کسی نے ماہرِ نفسیات، کسی نے ڈاکٹر لکھوا رکھا ہے جبکہ انسان کی اپنی ذات کہیں پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ مراقبہ کرنے سے انسان کو اپنے اندر کے حال کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے بابا جی نے ہمیں مراقبہ کرنے کا طریقہ سکھایا کہ کس طرح سے بیٹھنا ہے کیا کرنا ہے؟

آئندہ پروگراموں میں بھی اس بابت بات ہوتی رہے گی۔ اب میں نے اپنی شوخی اور جنٹلمینی میں کئی شوق پال رکھے تھے اور میں اونچی سوسائٹی میں بھی آنا چاہتا تھا۔ اس گھمنڈی شوق کے پیشِ نظر میں گالف کھیلنے لگا۔ ایک دفعہ میں اور

میرے طرح کے دیگر دوستوں نے کہا کہ موسم بہت اچھا ہے، گالف گراؤنڈ میں چلتے ہیں۔ جب ہم وہاں گئے تو وہاں کئی شوقین مزاج لوگ گراؤنڈ میں جمع تھے حالانکہ وہ صبح کا وقت تھا اور ایک ورکنگ ڈے تھا۔ ان لوگوں میں ایک سنہرے بالوں والا گورا بھی تھا۔ وہ بڑا صحتمند، خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ جب وہ ساتھ چلتا تھا تو سامان کا تھیلا اُٹھانے والا بھی اُس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلتا۔

حالانکہ عام طور پر کھلاڑی اور تھیلا اُٹھانے والا دُور دُور چلتے ہیں۔ ہٹ لگانے والے آخری مقام پر پہنچ کر اس گورے نے جب ہٹ لگائی تھی تو اس کے سامان پکڑنے والے نے گیند رکھی۔

خواتین و حضرات! ہول اور گیند میں کم سے کم بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ گورے نے سٹک پکڑی، تھوڑی دیر اپنا وزن تولا اور اس خوبصورت انداز میں ہٹ کیا کہ گیند سیدھی ہول میں جا گری۔

ہم سب نے تالی بجائی۔ اُس گورے نے بھی اپنا ہاتھ اُوپر اُٹھا کر خدا کا شکریہ ادا کیا، جب اس نے اپنا چہرہ اُوپر اٹھایا تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ اندھا تھا۔

اس کی دونوں آنکھیں پُتلیوں سے محروم تھیں اور بالکل سفید تھیں۔ ہم سب اُس کے گرد جمع ہو گئے اور ہماری حیرانی کی انتہا نہ تھی کہ ایک اندھا شخص کہاں سے چلا، کہاں پہنچ کر اس نے ہٹ لگائی۔ لیکن ہم میں سے کسی ایک کو بھی اس کی معذوری بارے شائبہ تک نہیں ہوا۔

وہاں ہمارے ایک ریلوے کے آفیسر دوست بھی تھے۔ اس نے اس گورے سے کہا کہ

?Excuse me Sir, whether you are blind

اس نے جواب دیا کہ

You have to be blind to see.

(جب تک آدمی اندھا نہیں ہوتا اس وقت تک وہ دیکھ نہیں پاتا ہے۔)

پیارے بچّو! اب یہ بات جو میں نے اس اپنے بابا جی سے سُنی تھی مجھے اس کی یہاں ایک مثال ملی۔

اس نے ہمیں بعد میں بتایا کہ برما کے محاذ پر وہ بطور کیپٹن تعینات تھا تو ایک بم

کے پھٹنے سے اُس کی تیز روشنی نے چشمِ زدن میں اُسے اندھا کر دیا۔ پھر میں نے تہیّہ کرلیا کہ میں زندگی بسر کروں گا اور "سجاکھے" (بینا) انسانوں کی طرح کروں گا۔ اس گورے نے بتایا کہ اس نے بعد ازاں ایک کھیلوں کا سامان بیچنے والی دُکان پر نوکری کرلی۔ دو تین بار تو میری بیوی مجھے وہاں تک چھوڑنے گئی، پھر میں نے اس سے کہا کہ میں اب اکیلا ہی جایا کروں گا۔ میں بس پر جاتا تھا اور اس پر سے ایک خاص مقام پر اُتر کر پھر کھمبوں کو ہاتھ لگا کر ایک اندازے سے گھر کی طرف جاتا تھا۔ میں نے گھر کے درست راستے کا تعیّن اس طرح سے کیا کہ موٹے کھمبوں کے بعد پھر چھوٹے کھمبے آتے تھے۔ پھر دس قدم چلنے کے بعد مجھے ایک بیکری سے تازہ ڈبل روٹی بننے کی خوشبو آنے لگتی تھی تو میں خیال کرتا کہ میں درست سمت میں جا رہا ہوں اور مجھے کنفرم ہو جاتا کہ I am on the right track۔ یہ سب اسے ایک طرف متوجّہ ہونے سے میسر ہوتا تھا۔ لیکن ہم کثیر المقاصد جو لوگ ہیں، ہم بھی یہ کرنا ہے، وہ بھی کرنا ہے کے چکروں سے نہیں نکلتے اور کچھ بھی نہیں کر پاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نے نماز بھی پڑھنی ہے، روٹی بھی پکانی ہے، چوری بے ایمانی بھی کرنی ہے اور بھی فلاں فلاں کام کرنے ہیں۔ وہ گورا بتاتا ہے کہ جب بیکری کی خوشبو کچھ ماند پڑ جاتی تھی اور پٹرول اور ڈیزل کی Smell شروع ہو جاتی تو پھر میں سمجھتا کہ ٹھیک راستے پر گامزن

ہوں۔ وہاں آ گئے بارہ قدم چل کر مجھے Left میں گھومنا ہوتا تھا اور میں اس پٹرول پمپ سے Left گھوم کر گلی میں چلا جاتا تھا اور سڑک پر بنے تیسرے سپیڈ بریکر پر جب میرا پاؤں پڑتا تھا تو مجھے پتہ چل جاتا کہ اس سے پندرہ قدم کے فاصلے پر میری دُکان ہے۔ پھر میں وہاں سامان بھی پہنچانے لگا اور میں نے گیم بھی شروع کرنے بارے سوچا اور کھیلتا رہا۔

جب آپ مراقبہ کرتے ہیں یا انشاء اللہ کریں گے اور آپ کو وقت ملے گا تو اس کا سب سے اہم تقاضا یہ ہو گا کہ آپ نے اور ساری باتوں کو چھوڑ کر توجّہ ایک جگہ پر مرکوز کرنی ہے۔ توجّہ بار بار دوسری طرف جائے گی جیسے نماز کے دوران کئی خیالات آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ زبان

دوسری طرف بھاگے گا لیکن آپ نے اس کو پکڑ کے واپس نہیں لانا بلکہ ڈھیلا چھوڑ دینا ہے۔ خود کو مشکل نہیں ڈال لینی۔

خدا نے انسان کو جانور سے افضل تر قرار دیا ہے اور وہ ہے بھی۔ اس کو کم از کم اپنے ذہن کے اوپر اتنا کنٹرول تو ہونا چاہیے کہ وہ اس کو Still کر سکے۔ انسان تو ہاتھی، گھوڑے اور خونخوار شیروں کو رام کر لیتا ہے، یہاں آ کر مار کھا جاتا ہے۔

آپ کے قابو میں نہیں آتا ہے لیکن جو لوگ صاحبِ حال ہیں وہ ذہن کو بھی قابو میں رکھتے ہیں اور پھر اس کا آہستہ آہستہ فائدہ ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس حوالے سے جب آپ درجہ کمال کو پہنچتے ہیں تو ضروری نہیں کہ اس کا کوئی مادی فائدہ ہو یا آپ کو اس کے فوائد کا واضح طور پر پتہ چلے جیسا کہ آپ چہرے پر کریم یا پاؤڈر لگا لیتے ہیں تو آپ کو اور لوگوں کو پتہ چل جاتا ہے لیکن اس معاملے میں آپ کو پتہ نہیں چلتا کہ کچھ تبدیلی آ رہی ہے لیکن تبدیلی آ رہی ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی آپ کے مزاج طبیعت اور وجود میں نمایاں طور پر آ رہی ہوتی ہے۔ اس کا یقین وہ لوگ دِلاتے ہیں جو آپ کے ارد گرد ہوتے ہیں۔ اس گورے کا نام مسٹر اوسوال تھا۔ اس کی طرح جب آپ صحیح نشانے پر اپنا نشان لگاتے ہیں اور آپ کڑی کمان بن جاتے ہیں جس طرح ایک نظم میں کہا گیا ہے کہ۔

ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

ملّت کا پاسباں ہے محمد علی جناح

تو آپ کو مقاصد کا حصول شروع ہو جاتا ہے۔

پیارے حضرات! اگر کڑی کمان نہ ہوئے تو پھر زندگی کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ پھر

تم ہم جانوروں کی طرح ہی ہوئے کہ کھایا، پیا، دو چار بندوں سے علیک سلیک کیا اور چلے گئے اور اپنا مال بھی چھوڑ گئے۔ بندے کو جیسے تیسے اپنا مال چھوڑنا ہے اور بہتر یہ ہے کہ ایسا مال ہو جو مثبت کی طرف لے جائے۔ ذہن پر کنٹرول اور مقاصد پر درست نشانے کے فن کے لیے مغرب بڑا بے چین ہے۔ مشرق میں یہ بات ہے۔ مغرب والے آرزو رکھتے ہیں کہ ہم کو بھی تعلیم دی جائے۔ ہم اس کے بارے میں جانیں۔ میں جب روم یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا تو ایک ہی بات کا بار بار ذکر ہوتا تھا کہ ہمیں Wisdom of the East کے بارے میں بتائیں۔ اب مجھے خاک علم تھا کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ میں نے تو یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ پھر وہاں (روم) چلا گیا۔ نوکری مل گئی موج لگ گئی۔ اب میں ان کے اس سوال پر چھُپتا پھرتا تھا کیونکہ مجھے Wisdom of the East کا علم ہی نہیں تھا۔

اب میں جان چھڑانے کے لیے اُن سے کہتا کہ آپ کو اللہ نے بڑی دانائی سے نوازا ہے اور آپ کی Wisdom ہم East والوں پر بڑی بھاری ہے۔ آپ ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ بندہ مار دیتے ہو اور آپ کے پاس یہ بڑی صلاحیت ہے۔

خواتین و حضرات! یہ ولایت والوں کے پاس ایک بہت بڑی خوبی ہے۔

بش کہتا ہے کہ ”افغانستان میں کارپٹ بمباری کرو۔“ یہ ایسی بمباری ہے جیسے قالین بُنتے ہیں۔ اس طرح کی یہ بمباری ہوتی ہے اور اس میں انچ انچ پر گولے برسائے جاتے ہیں۔

بش ڈیزی کٹر ہتھیار پر بڑے نازاں ہیں اور اُن کا کہنا ہے کہ یہ پتھر کی چٹانوں کو آن کی آن میں ریت کے ذرّوں کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے اور آکسیجن ختم کر دیتا ہے۔ افغانستان میں جب ان ہتھیاروں کو آزمایا جا رہا تھا تو ایک صاحب مجھے کوئٹہ میں ملے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بمباری کی جگہ سے آدھے میل کے فاصلے پر تھا لیکن آکسیجن کی کمی اتنی زیادہ تھی کہ میرا پیٹ میرے مُنہ میں آگیا ہے اور دم گھُٹ رہا تھا۔ مغرب کی توجّہ زیادہ اسی طرف ہے کہ آدمیوں کو کس طرح سے ختم کیا جائے۔ اس شخص مسٹر کلاشنکوف نے ایک اوزار بنایا تھا۔ اس نے جو ہتھیار بنایا ہے اس سے صرف آدمی ہی مارا جا سکتا ہے۔ اس کے بنانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ لوگوں کا گروہ بیٹھا ہو تو کسی طرح سے اسے ختم کرنا ہے۔ اس ہتھیار (کلاشنکوف) سے ہاتھی کا شکار نہیں کر سکتے، وہ صرف آدمی مارنے کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ اس کی یہ خوبی ہے۔ آپ نے کئی لوگوں کو دیکھا ہو گا جو آپ کو اور ہمیں خوفزدہ کرنے کے لیے کندھے پر لٹکائے پھرتے ہیں۔ روحانیت کی اس دنیا

میں اس بات کا بار بار تقاضا ہوتا ہے کہ جب تک آپ اپنے آپ کو نہیں جانیں گئے بات نہیں بنے گیا۔ جب تک مسٹر بش اپنے آپ کو نہیں جانے گا کہ وہ کون ہے اسے پتہ ہی نہیں چلتا۔ وہ ایک ایسی روش پر چلا جا رہا ہے جو تباہی کی جانب جاتی ہے۔ جب آپ مراقبہ کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو آپ کو اپنا پتہ چلتا ہے۔ آپ اس مراقبے میں خود کو تلاش کرتے ہیں لیکن مراقبہ آسانی میں ہونا چاہیے۔ ہمارے مرشد بھی ہمیں یہی کہتے ہیں کہ "اپنی جان کو مشکل میں نہ ڈالو۔ آسانی میں رکھو!"

یہ چیز آپ کے اندر کو خوبصورت بنانے اور اجالنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

جیسے ہم میک اپ کرتے ہیں اور سُرخی پاؤڈر کا جعل آئی شیڈ لگا کر خود کو خوبصورت بنانے کے لیے کئی بکھیڑے کرتے ہیں۔ اسی طرح مراقبہ بھی اندر کو خوبصورت تر کرتا ہے۔ اندر کے میک اَپ کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ اگر آپ اندر کے میک اپ کے بغیر چلے گئے تو پھر آپ کا جانا ایسا باعثِ افتخار جانا نہیں ہو گا۔

وہ گورا اوسول مکمل اندھا ہونے کے باوصف ایسی خوبصورت شارٹ کھیلتا تھا کہ

ہم ”سجا کھے“ ویسی نہیں کھیل سکتے اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور وہ بابا جو ایک گھاس پھوس کی جھونپڑی میں بیٹھا ہے وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اتنا طاقتور ہے کہ وقت کے بادشاہ جوتے اتار کر اس کی جھونپڑی میں اسے سلام کرنے کے لیے آتے ہیں۔

وہ کیوں آتے ہیں؟ اس کے پاس ایسا کیا ہے؟

اس پر آپ غور کیجیے گا۔ آئندہ پھر بات ہو گی۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

خالی کینوس

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ہماری زندگیاں کچھ ایسی ہو گئی ہیں اور اس میں کچھ ہماری مجبوری بھی ہے کہ ہم بھرے ہوئے کو چاہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ "خالی" کی ہماری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن جوں جوں آپ کو موقع ملے اور آپ غور کرتے جائیں تو یہ بھی ویسی ہی اہمیت کا حامل ہے جیسی کہ بھری ہوئی چیز ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بڑے نبی کو عبادت کدہ تعمیر کرنے اور پھر وہاں کھڑے ہو کر لوگوں کو آنے کی دعوت دی ہو گی تو اس نے سوچا ہو گا کہ اس دوران عبادت کدے میں کون آئے گا؟ لیکن جب اس نے وہاں لوگوں کو خدا کی طرف پکارا ہو گا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ضرور ہوا ہو گا کہ اس کی اذان پر کتنے ہی لوگ کچے دھاگے سے بندھے چلے آرہے ہیں اور آتے ہی جا رہے ہیں۔

ایسے ہی دن تھے اور ایسا ہی موسم تھا کہ ہم ڈھاکہ سے کاکس بازار کی طرف

پرواز کر رہے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ مشرقی پاکستان کے شاعروں ادیبوں فنکاروں اور گلوکاروں نے مغربی پاکستان کے فنکاروں اور دیگر آرٹسٹ حضرات کو اپنے ہاں دعوت دی تھی۔ ہم تقریباً ۵۰ لوگ تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں وہ جگہ اپنے گھر سے بھی پیاری اور بھلی لگی کیونکہ اپنے عزیز واقارب کا گھر اپنے گھر سے بھی پیارا ہوتا ہے۔ ہم وہاں رہے۔ مشرقی پاکستان کے ہمارے میز بانوں نے کہا کہ ہم مغربی پاکستان کے مہمانوں کو اپنا ملک دکھانے کے لیے ملک کے مختلف گوشوں اور کونوں میں لے جائیں گے۔ مہمانوں کی بڑی تعداد نے سُندر بَن دیکھنے کی خواہش کی اور کچھ نے کہا کہ ہم چٹا گانگ کے پہاڑی مناظر کی سیر کریں گے۔ جو بڑی عمر کے لوگ تھے انہوں نے کہا کہ ہم اتنا سفر تو نہیں کر سکتے البتہ ہم دریائے کرنافلی کا نظارہ کریں گے۔ ہم تین مہمانوں نے کہا کہ اے پیارے میز بانوں آپ ہمیں کاکس بازار لے جائیں۔

خواتین و حضرات! یہ بازار سمندر کا وہ خوبصورت ساحل ہے جس سا دنیا بھر میں کوئی ساحل نہیں ہے۔ یہ ساحل ساٹھ میل کی دوری تک سمندر کے بالکل ساتھ ساتھ چلتا ہے اور اس کی زمین باوصف اس کے کہ سمندر کی ریت سے بنی ہے لیکن ایسی پختہ اور مضبوط ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس پر اینٹوں کا کام

کیا گیا ہو۔ جیسا کہ لاہور کے شاہی قلعہ کا دیوانِ عام پختہ بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر اس ساحل پر جمپ لگائی جائے تو ریت کا ایک ذرّہ بھی نہیں اُڑتا۔ سیّاح بڑی دُور دُور سے اسے دیکھنے آتے ہیں۔ ہمیں بھی لالچ تھا کہ ہم وہاں پر دھوپ سینکتے ہوئے کیکڑے دیکھیں گے۔ وہاں سمندر سے نکل کر اتنی بڑی تعداد میں کیکڑے آکر بیٹھتے ہیں کہ حدِّ نگاہ تک ہوتے ہیں اور ان کی تعداد کا شمار کرنا بالکل ناممکن ہوتا ہے۔ وہ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ لوگ اُن کا نظارہ کرنے کے لیے جب جیپ دوڑاتے ہیں تو وہ کیکڑے جیپ کے آگے بھاگتے ہوئے دوبارہ سمندر میں جاتے ہیں اور یہ ایک ایسی عجیب دوڑ ہوتی ہے جو ایک سیدھ میں ہوتی ہے اور ایک مخصوص چوڑائی کے اندر رہوتی ہے۔ جن تین مہمانوں نے اس خوبصورت ساحل کو دیکھنے کی تمنّا کی تھی ان میں غلام عباس (ممتاز افسانہ نگار آنندی کے خالق ہیں) اعجاز بٹالوی اور میں تھا۔ جب ہم جہاز سے اُترے تو اُترنے سے قبل جہاز کے اندر ہی ایک بحث شروع ہو گئی۔ میں نے کہا کہ یہ سمندر اس وقت بھاٹا (اُترائی) میں ہے۔ اعجاز بٹالوی کہنے لگے کہ ہیں کہ یہ جوار (چڑھائی) میں ہے۔ ہم اس بات پر کافی دیر لڑائی کرتے رہے اور اعجاز میری بات نہیں مان رہے تھے۔ اس پر ہم نے غلام عباس سے کہا کہ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ''بھاٹا'' اور ''جوار'' کو کبھی بھی

اکیلے اکیلے استعمال نہیں کیا۔ جب بھی استعمال کیا "جوار بھاٹا" (مدّوجزر) اکٹھا ہی استعمال کیا ہے۔ ائیر پورٹ پہنچنے کے بعد ہم نے کاکس بازار میں سب سے پہلا سوال وہاں کے اسٹیشن منیجر سے کیا۔ وہ یہ تھا کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ اس وقت سمندر مدّوجزر کے اعتبار سے کس سمت میں ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اس وقت یہ اُتراؤ میں ہے اور جب چاند نکلے گا تو پھر اس میں چڑھائی شروع ہو گی اور لہریں اوپر کو اُٹھیں گی لیکن اس وقت یہ بڑا پُر سکون ہے۔ آپ بھی وہاں جائیں گے تو دیکھیں گے کہ وہ نہایت خوبصورت شہر ہے اور وہاں کے لوگ بھی نہایت ہی خوبصورت اور ملنسار ہیں اور وہ ساحل بھی بہت ہی مہمان نواز ہے۔ جب ہم اپنا سامان ریسٹ ہاؤس میں رکھ چکے تو اعجاز بٹالوی کہنے لگے کہ ہم پہلے بازار دیکھتے ہیں پھر چائے یا کھانے کے بارے سوچتے ہیں۔ ہمارے ریسٹ ہاؤس کے قریب ہی ساحل تھا جو ہمیں نظر آرہا تھا۔ کاکس بازار بھی نہایت کشادہ خوبصورت اور ستواں ہے۔ جب ہم بازار میں آہستہ آہستہ چلنے لگے تو بجائے کسی دُکان میں جانے کے یا لوگوں سے ملنے کے، ہم نے فیصلہ کیا کہ یہاں پر جو ایک بدھ لوگوں کی عبادت گاہ یا ایک بدھ ٹیمپل ہے اس کی زیارت کی جائے۔ وہاں تین چار بھکشو گیروے رنگ کے کپڑے پہنے کھڑے ہوئے تھے۔ جب ہم اندر جانے کے لیے اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگے تو ایک بھکشو نے کہا کہ "آپ نے تھوڑا سا ہی تو

دیکھنا ہے آپ نے عبادت تو کرنی نہیں، پھر آپ کیوں جوتے اُتارتے ہیں۔ ایسے ہی چلے جائیں۔"

اس پر غلام عباس نے اس سے کہا کہ "نہیں ہم داتا کی نگری سے آئے ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ کسی کی بھی عبادت گاہ ہو ہم وہاں پر جوتوں سمیت مت جائیں بلکہ احترام کو ملحوظِ خاطر رکھیں چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہی کیوں نہ رُکنا ہو۔"

خیر ہم بوٹ وغیرہ اُتار کر اندر چلے گئے۔ وہاں مہاتما بدھ کا ایک بہت بڑا پیتل کا پانچ فُٹ اونچا بُت موجود تھا۔ وہ جو لوگ وہاں گیروے رنگ کے کپڑے پہنے کھڑے تھے ان بھکشوؤں سے اعجاز بٹالوی نے پوچھا کہ "آپ کہاں کے بدھ ہیں؟"

تو انہوں نے بتایا کہ "ہم پاکستانی بدھ ہیں!"

ہمیں یہ سُن کر اور اُن سے مل کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ تو ہمارے ہی ہیں۔ جب ہم زیارت کر کے باہر نکلے تو ایک وکیل کا دفتر جو کہ بانس سے بنا ہوا تھا وہ بڑا خوبصورت تھا اور باہر اس نے اپنے نام کا بورڈ ایڈووکیٹ فلاں فلاں لگایا ہوا تھا۔

اعجاز بٹالوی کہنے لگے کہ ان سے ضرور ملتے ہیں اور ہم ان کے پاس جا کر بیٹھ

گئے۔ اعجاز اور وکیل صاحب عدلیہ کی باتیں، سسٹم کی باتیں، وکلا کے حالات پت
مبنی تکنیکی باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے جبکہ میں اور غلام عباس نے کچھ دیر تو
انہیں برداشت کیا۔ خیر وہاں پر اعجاز بٹالوی نے ان سے رہن کے حوالے سے
سوال کیا کہ "رہن کا کیا قانون ہے اور کس طرح سے اس حوالے سے کام ہوتا
ہے کیونکہ یہاں ہندو بنئے بھی ہیں جنہوں نے مسلمانوں اور بدھسٹوں کی
جائیدادوں اور زمینوں پر قبضہ جمار کھا ہے اور آپ رہن اور ِگروی کے مقدمات
کو کیسے ڈیل کرتے ہیں۔" یہ ایک باریک بات تھی جو لمبی چلتی رہی۔ وکیل
صاحب نے کہا کہ کیا آپ لوگ میرے بیٹے سے مل لیں وہ آرٹسٹ ہے اور ساتھ
انہوں ہی نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔

ان کی آواز کے بعد ایک نہایت خوبصورت گوراچٹا چوبیس پچیس برس کا نوجوان
آ گیا۔ وکیل صاحب نے اپنے بیٹے کو ہماری بابت بتایا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ یہ
پچھمی پاکستان سے آئے ہیں۔ اس نوجوان نے ہمیں اپنا سٹوڈیو دِکھانے کی
دعوت دی۔ باپ کے دفتر کے پیچھے ہی اس کا باغ تھا جس کے باہر اعلیٰ قسم کے
بانس کے پودے تھے۔ ساتھ ناریل کے پیڑ تھے اور ان کے ساتھ اناس کے
پھل دھاگہ باندھ کر لٹکائے گئے تھے۔ اس کے باغ میں موجود کمرے میں کئی

ایک پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ ہم وہاں بیٹھ کر اس سے باتیں واتیں کرتے رہے اور وہ بھی ہمارے بارے میں ہم سے سوالات کرتا رہا۔ اس سے غلام عباس نے پوچھا کہ ”آپ ہمارے ہاں ٹیکسلا میں آئیں۔ وہاں بدھ بڑی تعداد میں رہتے ہیں اور آپ کے مطلب کی چیزیں بھی وہاں بکثرت موجود ہیں۔“ وہ کہنے لگا کہ ”میں وہاں ایک مرتبہ گیا تھا لیکن وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکا۔“

خواتین و حضرات! وہ بذاتِ خود ایک پینٹر تھا۔ اس کی پینٹنگز دیوار کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں اور ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ اس نے جو بھی تصاویر بنائی تھیں وہ ساری کی ساری سفید تھیں۔ اُن کے اوپر کوئی نقش نہیں تھا۔ وہ تمام گولڈن رنگ کے فریم میں جڑی ہوئی تھیں۔ کینوس تنے ہوئے تھے اور وہ بے حد شفاف تھیں لیکن بے نقش تھیں۔ وہ کہنے لگا کہ یہ میری پینٹنگز ہیں اور میری ساری محنت محبّت یہی ہے۔ والد صاحب وکالت کرتے ہیں اور میں سارا دن انہیں کے ساتھ رہتا ہوں۔ ہم حیران ہو کر بیٹھے یہ دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اللہ یہ پینٹنگز کہاں سے ہو گئیں؟

ہماری حیرانی کو دیکھ کر اُس نے کہا کہ آپ نقش کی طرف نہ جائیں بلکہ پینٹنگز کے عمل کی طرف جائیں۔ میں پینٹنگز کے عمل سے محبّت کرتا ہوں۔ اس کی یہ بات

اکثر میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں تصویر نقش سے محبّت نہیں کرتا ہوں۔ میں اپنا برش لیتا ہوں اسے دھو کر سکھاتا ہوں اور اس سوکھے برش کے ساتھ پینٹنگ بنانا شروع کر دیتا ہوں اور اس سوکھے برش سے جو شاہکار بن رہا ہوتا ہے وہ مجھے نظر آتا ہے۔ میرا یہ جو عمل یا Process ہے یہی میری محبّت ہے۔

خواتین و حضرات! اب ہم جیسے لوگوں کے لیے اس بات کو تسلیم کرنا یا برداشت کرنا یا اس کو ہضم کرنا بہت مشکل تھا۔ مجھے غلام عباس نے آنکھ کے اشارے سے کہا کہ "شاید یہ بے چارہ Abstract Painting (تجریدی آرٹ) بارے نہیں جانتا کہ اُلٹے سیدھے برش مارنے سے جو بھی تصویر بن جائے وہ اس آرٹ کے زمرے میں آجاتی ہے۔"

وہ لڑکا کہنے لگا کہ "میں آپ لوگوں کو اپنی پرانی اور زمانۂ جاہلیت کی پینٹنگز کھاتا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر اندر سے تصویریں اُٹھا لایا۔

خواتین و حضرات! میں نے اپنی پوری زندگی میں ویسی تصاویر نہیں دیکھیں۔ ان میں Still Life، پھلوں اور ہاتھیوں کی بے شمار تصویریں تھیں۔ تصویروں میں

چھوٹے بڑے ہاتھی ایک دوسرے کے پیچھے بغیر استری کیے ہوئے لباس پہنے ہوئے پھرتے دِکھائے گئے تھے۔ وہ کہنے لگا کہ "اب میں اس طرح کی تصویریں بنانا ترک کر چکا ہوں۔"

میں نے کہا کہ "سفید فریم میں جڑے ہوئے جو کینوس ہیں یہ آپ نے کیوں لٹکائے ہوئے ہیں؟" وہ کہنے لگا کہ "میں نے ایسے خالی ہی لٹکائے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ سلسلہ وار اور حالات و واقعات کے مطابق لٹکائے ہوئے ہیں۔ ان کے کچھ معانی ہیں۔"

میں نے کہا کہ "اگر میں ان کی ترتیب بدل دوں تو!"

وہ کہنے لگا کہ "اس سے تو میری روح بے چین ہو جائے گی۔ میں گھبرا جاؤں گا اور مجھے پھر سے انہیں پرانی ترتیب میں رکھنا پڑے گا۔" ہمارے لیے یہ بھی ایک عجیب و غریب بات تھی۔

جب اس نے یہ سب باتیں کیں تو مجھے اُستاد جھنڈے خاں کی بات یاد آ گئی کہ "خالی" کتنا اہم ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے اور اس کا انسان کی روح کے ساتھ اندر کے ساتھ کیسا گہرا تعلق ہو سکتا ہے اور انسان اگر ذوقِ عمل کے ساتھ محبّت کرتا ہو تو

بات بن جاتی ہے۔ بے نقش تصویر میں سے بھی تصور اُبھر کر سامنے آنے لگتی ہے۔ ہم اس نوجوان کو ٹیکسلا دکھانے کی باتیں کرتے رہے لیکن ایک ایسی نظر لگانے والی بات وہاں موجود تھی جس کا ہمیں احساس نہیں ہو رہا تھا۔ جب ہم وہاں سے واپس آئے تو عباس صاحب کہنے لگے کہ اب ہمیں ساحل پر کیکڑوں کو دیکھنا ہے۔ ہمارا پھر جھگڑا ہو گیا کہ اس وقت جوار ہے اور وہ وہاں نہیں ہوں گے لیکن وہ "بھاٹا" پر اصرار کرنے لگے۔ ہم نے کہا کہ اس وقت "جوار" ہے یا "بھاٹا" جو بھی ہے ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ شام پڑ چکی ہے۔ اعجاز بٹالوی نے کہا کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کیکڑے آئیں گے اور پھر آہستہ آہستہ جمع ہوں گے۔ پیارے بچّو! وہ ایک قابلِ دید نظّارہ ہوتا ہے جیسے جیسے دھوپ بڑھتی جاتی ہے تو کیکڑے جمع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے پاس جیپ تو نہیں تھی لیکن ہم نے خود کیکڑوں کے پیچھے دوڑ لگا کر انہیں بھگایا اور جس طرح سے کیکڑے ہمارے آگے بھاگے وہ بھی ایک دیکھنے والا منظر تھا۔

(آپ حیران مت ہونا کہ ہم اس عمر میں کہاں بھاگنے لگے۔ ان دنوں ہم بھی جوان ہوا کرتے تھے)

لیکن دل میں جیپ بھگا کر ان کیکڑوں کو بھگانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔

لوگ وہاں اس "بھاگڑ" کو دیکھنے کے لیے دُور دُور سے آتے ہیں۔ جب ہم کاکس بازار سے لوٹے تو ایک دن کے بعد ڈھاکہ سے ہماری روانگی تھی اور ہم نے ڈھاکہ سے لاہور آنا تھا۔ ہم سارے جمع تھے جن میں ہم اور ہمارے میزبان بھی تھے۔ سارے مغموم سے کھڑے تھے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ وہاں منیر نیازی نے یہ "پھڈّا" ڈال دیا کہ وہ نہیں جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ "میں تو یہیں رہوں گا۔ میرا یہی اصلی گھر ہے۔"

ہم نے کہا کہ "تم یہاں کہاں رہو گے؟"

اور اس نے کہا کہ "میں سُندر بَن میں رہوں گا۔"

ہم نے کہا کہ "سُندر بَن تو بڑی خطرناک جگہ ہے۔"

اس نے کہا کہ "میں نے وہاں وہ درخت بھی دیکھ لیا ہے جہاں میں مچان بنا کر رہوں گا اور اپنی زندگی آرام سے بسر کروں گا۔ اس سے پیاری جگہ اور کوئی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا کہ "مچان میں تم بھوکوں مرو گے۔"

اس نے کہا کہ وہ مچان اتنی اونچی ہو گی کہ اس تک ہاتھی کی سونڈ پہنچ سکے گی۔ اور ہاتھی مجھے خوراک پہنچاتا رہے گا۔ میں اس سے بھی دوستی لگا کر آیا ہوں۔

یہ ساری باتیں واقعات اور کہانیاں جتنی بھی اکٹھی ہوتی رہیں اور ہم جتنی مرتبہ بھی مشرقی پاکستان جاتے رہے، محبّتوں میں اضافے بدستور ہوتے رہے لیکن ایک آنکھ ایسی تھی جو اِن محبّتوں کو برداشت نہیں کر سکی۔ اس کی ایک اپنی خطرناک اور حسد پر مبنی سکیم بن رہی تھی کہ یہ محبّت اور یہ سُندر بَن میں رہنے والے منیر نیازی شاعر کا مقام نہیں ہو سکتا۔ میں ان کو اتنے قریب قریب رہنے نہیں دوں گی۔ وہ نظریہ اس طرح کا تہیّہ کر رہی تھی جس سے ہم قطعی طور پر غافل تھے اور ناآشنا تھے۔ میں اب بھی کبھی پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں اور منیر نیازی کی شاعری میں یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ وہ شاعری یہاں مغربی پاکستان میں بیٹھ کر کرتا ہے لیکن اس کے بہت سے شعروں اور نظموں میں اسی سُندر بَن کی گونج ہے۔ ویسی ہی آہ ہے۔ وہی "اودرا پن" (اداسی) ہے جو ہم سب مشرقی پاکستان کو یاد کر کے محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے میں منیر نیازی کو "اودرا ہوا شاعر" کہتا ہوں۔ ہم ادیبوں کے اندر جنہوں نے کچھ لکھا یا نہ لکھا، جنہوں نے خالی کینوس ہی تیّار کیے۔ ان کے کینوس کے اُوپر وہ تصویریں موجود ہیں جو وہاں

بنیں۔ ہمارے ذہنوں اور ہماری روح پر وہ تصاویر اُتریں اور ہم جہاں بھی جاتے ہیں وہ تصویریں اُبھر کر بالکل سامنے آ جاتی ہیں۔ جیسا کہ آج میں آپ کے سامنے آج کا دن اور موسم دیکھ کر ان تصویروں کے عکس محسوس کر رہا ہوں لیکن زندگی میں ایسے دن آتے رہتے ہیں اور ایسی گھڑیاں اور حالات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں جن کو بندہ چار و ناچار برداشت کرتا رہتا ہے اور یہی اس کا کمال ہے اور یہی اس کا شرف اور فخر ہے کہ وہ انہیں برداشت کرتا ہے اور اپنے ذوقِ عمل کے اندر اسی پائداری کے ساتھ آگے بڑھتا ہے جیسا کہ وہ عمل لے کر ابتدا میں چلا تھا۔

اللہ آپ کو خوش رکھے، اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

لائٹ ہاؤس

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

مجھے ایک بار لائٹ ہاؤس دیکھنے کا حسین اتفاق ہوا۔ راتوں میں بحری جہازوں کو چٹانوں سے محفوظ یا باخبر رکھنے کے لیے سمندر میں خطرناک جگہوں پر لائٹ ہاؤس بنائے جاتے ہیں اور اِن لائٹ ہاؤسز میں جو دیئے رکھے جاتے ہیں اُن کے اِرد گرد ایسا شیشہ لگا ہوتا ہے جو روشنی کو کئی سمت میں منعکس کرتا ہے یا آپ کہہ لیں کہ وہ شیشہ محدّب (یہ گول اور بیچ سے اُبھرا ہوا شیشہ ہوتا ہے) طرز کا ہوتا ہے۔

خواتین وحضرات! آپ یقین کریں کہ وہ لائٹ ہاؤس میں لگا چھوٹا سا دیا مٹّی کے تیل یا کیروسین آئل سے جلتا ہے اور اِن لائٹ ہاؤسز میں اسے جلانے کے لیے ملازم رکھا جاتا ہے جو اپنی ذمّہ داری سے اسے سرِ شام روشن کر دیتا ہے تا کہ جہاز بھٹک کر بھول سے کسی چٹان سے ٹکرا نہ جائیں۔ وہ ایک چھنگلی جتنا دیا دیکھیں

کتنے لوگوں کو درست سمت عطا کرتا ہے۔ اس مٹّی کے تیل کا موٹی بتّی والا "دیوا" جونہایت کم روشنی رکھتا ہے۔ محدّب شیشے کے باعث اس کی روشنی پچیس کلومیٹر تک بھی جا سکتی ہے۔ وہ دیا ایک ایسی گھومنے والی چیز پر ہوتا ہے جو مسلسل گھومتی رہتی ہے اور اس کے گھومنے سے اس کے گرد لگا محدّب شیشہ پھر اس تھوڑی ای روشنی کو میلوں دُور تک لے جاتا ہے اور یہ Reflect کرنے والے شیشوں کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ اب جب میں اس "دیوے" کو دیکھ چکا ہوں اور آج کے وقت سے موازنہ کرتا ہوں جسے باہر والوں نے انفارمیشن کی صدی قرار دیا ہے اور اُن کا کہنا ہے کہ اس انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صدی میں علم اس طرح سے پھیلے گا تو بہت ساری باتیں ایک ایک کر کے میرے ذہن میں سے گزرتی ہیں کہ یہ علم کی روشنی کہاں سے کہاں تک پہنچے گی اور کیسے پہنچے گی؟ یہ ساری بات میرے سامنے آ گئی چونکہ میری زیادہ Study مذہب پر ہوتی ہے۔ گو میں اس اسٹڈی سے کسی منزل پر نہیں پہنچ سکا لیکن میری زیادہ توجّہ اسی نقطے پر مرکوز رہتی ہے کہ مذہب کیسے ٹریول کر کے اور لمبے فاصلے طے کر کے پیدل چلتا ہوا کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ ہپ راز مجھ پر ابھی تک کھل نہیں سکا ہے۔ آج کل کے میرے نوجوان بچّے کہتے ہیں کہ جی تلواریں مار کر دوسروں کو فنا کر دیا جاتا ہے اور اس طرح سے انہیں اپنا مذہب سکھا دیا جاتا ہے اور سب کے

”گاٹے“ اُتار کر اسلام سکھایا گیا۔ خواتین وحضرات! لیکن یہ بات تو کسی کے لیے بھی ناقابلِ قبول ہے اور عقل اسے تسلیم نہیں کرتی ہے۔ جب بندے ہی مار دیئے تو پھر کیسا مذہب سیکھنا اور کِن کو مذہب سکھلانا!

جب میں اپنے اِرد گرد دیکھتا ہوں تو دنیاوی معاملات ایک طرف، دینی معاملات پر ہی اتنا لٹریچر ہمیں پہنچایا جارہا ہے اور میرے گھر میں ہی اتنا لٹریچر آتا ہے کہ میں اسے ٹھیک طرح سے پڑھ بھی نہیں سکتا اور وہ سارے کا سارا لٹریچر جو انفارمیشن اور معلومات کے لیے مجھے پہنچایا جاتا ہے وہ میری ذات کے اندر نہیں اُتر پاتا۔ علم تو ہے اور پہنچایا بھی جارہا ہے اور بہت دُور دُور تک بھیجا جارہا ہے لیکن ہمارے اندر جذب نہیں ہوتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں حسد میں سے نکلوں۔ بیبیوں میں بہت حسد ہوتا ہے۔ وہ کسی اور خاتون کا اپنے گھر کے قریب سے گزرنا بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ ایک طرح سے میں ان کے اس حسد کی داد بھی دیتا ہوں اور یہ اچھی بات بھی ہے اور میں اپنی بیوی سے اکثر کہا کرتا ہوں کہ گھر اس طرح سے محفوظ رہتے ہیں کہ اگر حسد ذرا بھی نہ کیا جائے اور سب ہم مردوں پر چھوڑ دیا جائے اور ہم حسبِ عادت سب اچھا کہتے رہیں اور یہی روش رکھیں گے کہ چلو یہ بھی ٹھیک ہے، وہ بھی ٹھیک ہے، السّلام علیکم، وعلیکم السّلام

کہتے پھریں اور سب کو "جیپھیاں" ڈالتے پھریں۔ تو اس طرح سے تو گھر برباد ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے اِن خواتین کی بڑی مہربانی ہے لیکن جب یہ ضرورت سے بڑھ جاتا ہے تو خطرناک صُورتِ حال اختیار کر جاتا ہے اور حد سے بڑھ جانے سے کنجوسی آجاتی ہے۔ پھر اس کا قلع قمع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

خواتین و حضرات! اس کا قلع قمع کرنے کے لیے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نماز پڑھو اور روزے رکھو اور نیک عمل کرو، اب میں بڑا حیران بھی ہوتا ہوں اور پھنس جاتا ہوں کہ میں نے جب نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا تو کیا یہ نیک عمل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے تیسری نیک عمل کی کیٹیگری کیوں بنائی ہے۔ میں اب تک اس کشمکش میں پھنسا ہوا ہوں کہ نیک عمل کیسے کیے جائیں۔

میری طرح آپ بھی جب کسی نیک عمل کی بابت سوچیں گے تو آپ کو اِرد گرد پر نظر دوڑائی ہو گی۔ کیونکہ نیک عمل کے لیے آپ کو کوئی بندہ یا جاندار ڈھونڈنا ہو گا۔

کسی بڑی امّاں کو پاس بٹھا کر پوچھنا ہو گا کہ "امّاں روٹی کھادی اے کہ نئیں

کھادی۔ تیرے پُت نے تینوں ماریا سی، ہُن تاں نئیں ماردا۔"

یہ نیک عمل ہے۔ کسی دوست سے اچھی بات کرنا نیک عمل کے زمرے میں آتا ہے۔ ابّاجی کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کا نام نیک عمل ہے۔

لیکن یہ نیک اعمال کرنے ہم نے خیر سے چھوڑے ہوئے ہیں اور یہ ایک الگ بحث ہے۔ یہ جو سارا لٹریچر، ساری کتابیں اور بہت کچھ مجھے پہنچایا جا رہا ہے، یہ میرے اندر نہیں گھستا۔ میں ایک اچھا آدمی بننے کی کوشش کرتا ہوں اور اللہ گواہ ہے کہ میرے اندر اچھا آدمی بننے کی خواہش بھی ہے لیکن یہ سارا لٹریچر پڑھ چکنے کے بعد اور سُن لینے کے بعد ٹی وی کے پروگرام دیکھنے کے بعد، "زاویہ" دیکھنے کے بعد بھی میں وہیں کا وہیں رُکا ہوا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اشفاق صاحب بڑی اچھی بات کر رہے ہیں لیکن اس اچھی بات کو اپنے عمل کا حصّہ بنانے سے قاصر رہتا ہوں۔ ایک لڑکی کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ خود کو خوبصورت بنا کر رکھے۔ لِپ اسٹک پاؤڈر کاجل لگا کر نکلے اور جسم کی خوبصورتی ظاہر ہو، پھر ساتھ ہی انسان کی آرزو ہوتی ہے کہ اندر کی خوبصورتی بھی ظاہر ہو کیونکہ اندر کا بھی ایک حُسن ہوتا ہے۔ بسم اللہ آپ باہر کا میک اَپ ضرور کریں، اچھا لگتا ہے اور حکم بھی ہے کہ صاف سُتھرے رہو اور خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں

کہ ”اللہ جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔“

اور یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے بن سنور کر رہنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اپنے اندر کا حُسن کیسے اُجاگر کریں۔ میں آپ سے جو لائٹ ہاؤس کی بات کر رہا تھا۔ خواتین و حضرات! جس طرح وہ چھوٹا سا دیا جو بالکل مونگ پھلی والے کی ریڑھی کو مشکل سے ہی روشن کرتا ہے، وہ پچیس میل دُور تک روشنی پھینک دیتا ہے اور یہ اتنا سارا لٹریچر، اتنا پرنٹ میڈیا اور اتنا سارا الیکٹرونک میڈیا، ریڈیو، ٹیلیویژن یہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ ہمارے اندر ہی نہیں گھستا۔ وہ ”دیوا“ کسی کمال کا ہے۔

پھر مجھے یہ خیال آیا (میرا یہ خیال بھی بس ایسے ہی ہے پتہ نہیں ٹھیک ہے یا نہیں) کہ اس دیے کے گِرد جو محدّب شیشے لگے ہوئے ہوتے ہیں وہ ہی تو اس کی روشنی کو منعکس کرتے ہیں۔ وہ چھوٹا سا لیمپ اپنی روشنی اِن شیشوں میں اُتارتا ہے اور وہ شیشہ Reflect کر کے دوسرے گھوم کے آنے والے شیشے میں اُتار دیتا ہے اور اس طرح سب وہ روشنی اپنی اپنی باری سے Reflect کرتے ہیں اور اس طرح سے جب وہ روشنی سمندر کے پچیس میل کے علاقے میں پھیل جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ دیا اپنی روشنی ڈائریکٹ پھینکے گا تو کچھ نہیں ہو گا۔ تو خواتین و

حضرات! جب تک بندے کو علم عطا نہیں ہو گا اور اُسے بندہ نہیں سیکھے گا اور وہ دوسروں کے لیے نمونہ نہیں بنے گا، اس وقت تک بات نہیں بنے گی۔

مجھ سے میرے بچّے پوچھتے ہیں کہ ابو مسلمان تو بڑے لڑاکا تھے، تلواریں لے کر نکلتے تھے اور بڑی جنگیں کرتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ بھئی اچھا ایسا ہی ہو گا۔ تمہاری بات مان لیتے ہیں، پھر میرے دل میں خیال آیا کہ چین میں سنکیانگ کا جو علاقہ ہے اور جس کی طرف جانے والے چھوٹے سے رستے کو ہم سِلک روٹ کہتے ہیں، اس سڑک پر ایک شخص اُونٹ کی سواری کرتا ہوا جا رہا ہے۔ اگر آپ لوگ بھی اُدھر جائیں تو بڑے بڑے دریا دیکھ کر ڈر جائیں اور سڑک کے ساتھ نیچے دریا بہہ رہا ہوا تھا۔ وہ شخص جاتا جاتا سنکیانگ میں پہنچ جاتا ہے۔ اب اس کے پاس نہ تو کوئی لٹریچر ہے، نہ وہ اس علاقے کی بولی جانتا ہے جہاں پہنچا ہوتا ہے، نہ وہ کسی کے ساتھ Communicate کر سکتا ہے۔ وہ سنکیانگ والے اُسے دیکھ کر کہتے ہیں کہ یار یہ کمال کا بندہ ہے، ایک طرف چلا جاتا ہے۔ پھر یہ کبھی کھڑا ہو جاتا ہے، کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے، کبھی سجدے میں گِر جاتا ہے (اب ان لوگوں کو نہیں پتہ یہ طریقہ نماز کی ادائیگی کا ہے) وہ لوگ اسے اپنی بولی میں پوچھتے ہیں کہ ”یار تو اتنا اچھا کیوں ہے۔“

جیسے یہاں لاہور میں جب داتا صاحب غزنی سے آکر راوی کنارے بیٹھے تھے اور وہ وہاں کے گائیاں چرانے والے ہندوؤں سے انتہائی حُسنِ سلوک سے پیش آئے۔ انہیں داتا صاحب پانی کے گھڑے بھر بھر کر پلاتے تھے، لیکن اُن سے کوئی بات نہ کرتے۔ وہ ہندو گائے بان حیران ہوتے اور کہتے کہ آپ اتنے اچھے کیوں ہو؟ تم نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا ہے؟ اور وہ داتا صاحب سے آکر کہتے تھے کہ "بابا ہمیں بھی اپنے جیسا بنالو۔"

داتا صاحب کہتے کہ "تم اپنے جیسے ہی ہو، بس ٹھنڈا پانی پیا کرو، کرنا کرانا کچھ نہیں ہے۔ تم نے صرف ٹھنڈا پانی پینا ہے۔" جب ان لوگوں نے بہت ہی زور دیا تو داتا صاحب نے کہا کہ تم اتنے سارے خداؤں کو مانتے ہو (خواتین و حضرات پانچ چھ خدا ہمارے اچھرہ میں ہوتے تھے۔ یہاں اُن کے بڑے بُت ہوا کرتے تھے۔ داتا صاحب کے زمانے میں اچھرہ میں اخروٹ اور بادام کے بڑے درخت ہوا کرتے تھے) ایک گروہ فارس سے گرم مصالحہ جات، بھارت کا دھاگہ کپڑا لے کر کشتی میں چلا اور ایک عجیب و غریب جزیرے پر پہنچا جس کا انہیں نام بھی نہ آتا تھا۔ انہوں نے اپنی چیزیں بیچنے کی غرض سے ساحل پر پھیلا دیں۔ وہاں کے لوگ ان کی وہ چیزیں دیکھنے کے لیے آئے۔ ان میں شیشے کا سامان بھی تھا۔

اس جزیرے کے لوگ اپنے آئینے یا شیشے سے بھی ناآشنا تھے۔ وہاں کے لوگوں نے انہیں بتایا کہ اس جگہ یا جزیرے کو انڈونیشیا کہتے ہیں۔ فارس کے تاجروں نے اپنی اشیاء لے کر وہاں کی اشیاء بھی تجارت کی غرض سے خریدنا چاہیں اور ایک چیز کی بابت انہوں نے اصرار کیا کہ اس کی قیمت کم کی جائے لیکن جو جزیرے والے ایک شخص نے قیمت کم کرنے سے انکار کیا اور بتایا کہ یہ اس کے مالک کی چیزیں ہیں لہذا وہ ایک خادم ہونے کے ناتے کم نہیں کر سکتا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے دیکھا کہ اس خادم کے لیے پانچ چھ عرب سروں پر کھانے کے پتیلے اُٹھائے ہوئے آ رہے ہیں۔ انہوں نے حیران ہو کر کہا کہ بھلا کوئی نوکر کے لیے بھی کھانا لاتا ہے۔ تم کس طرح کے اور کون لوگ ہو؟

ان لوگوں نے اشاروں سے کچھ غلط لفظ اور جملے جوڑ جاڑ کے وضاحت پوچھی تو انہوں نے آگے سے جواب دیا کہ "یہ ہمارے اللہ کا حکم ہے کہ نوکروں سے حُسنِ سلوک سے پیش آؤ، ہمیں نوکروں سے بھی وہ سلوک کرنے کا حکم دیا گیا جیسا ہم اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔" وہ غیر تاجر بڑے حیران ہوئے۔

خواتین و حضرات! پورے انڈونیشیا میں کوئی بھی لڑاکا یا تیر کمان والا یا کوئی جنگجو نہیں ہے لیکن وہ سارے کا سارا مسلمان ہے اور وہ ہم سے بہت بڑا ملک ہے۔

سنکیانگ میں کوئی لڑاکا نہیں ہے۔ ہمارے جو بادشاہ یہاں آ کر لڑے، انہوں نے تو لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکا یا اس طرح کے اقدامات کیے جن سے لوگ مسلمان نہ ہوں۔ اکبر بادشاہ نے دینِ الٰہی چلانے کی بات کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح سے میرا اور تمہارا دونوں کا فائدہ ہو گا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ روشنی اسی طریقے سے پھیلے گی جس طرح West والے کہہ رہے ہیں کہ اگر ابلاغ ہو، کھُل کے بات کی جائے اور دُور دُور تک پہنچائی جائے تو وہ دُور دُور تک جا سکتی ہے۔

اس طرح سے بات دُور دُور تک پہنچی تو ضرور ہے لیکن دِلوں میں نہیں اُترتی۔ ہم یہ بات جاننا چاہ رہے ہیں۔ میں اچھا ہونا چاہتا ہوں آپ اچھا ہونا چاہتے ہیں۔ یہ آپ کی خواہش ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ Light House ہمیں Provide کیا جائے، وہ روشنی کا مینار ہمیں چاہیے جو مدینہ شریف کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ٹمٹماتا تھا اور وہ ایک ایسی مسجد میں تھا جس کے شہتیروں اور بالوں سے لوگوں کا سر لگتا تھا۔ اس چھوٹے سے دیے نے کہاں کہاں تک اپنی روشنی پہنچا دی کہ پوری دنیا سیر اب ہو گئی۔ اس نے اپنا وہ نور بغیر ٹی وی، ریڈیو کے آخر کیسے پہنچا دیا۔

خواتین و حضرات! یقیناً وہاں بندوں نے ہی محدّب شیشوں والا کام کیا ہو گا اور ان بندوں نے ہی نور اور روشنی کو آگے Reflect کیا ہو گا اور روشنی دُور دُور تک پھیل گئی ہو گی۔ میں اس نشست کے بہانے سے کہنا چاہوں گا کہ مجھے میرا روشنی کا مینار یا لائٹ ہاؤس مِل جائے۔ اگر آپ کو علم ہے تو مجھے بتائیں کہ میرا Light House کہاں ہے یا مجھے بتائیں کہ اس بات پر کیسے غور کیا جائے اور کس طرح سے کیا جائے کیونکہ ہم سب اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق اچھے ہونا چاہتے ہیں۔ جس طرح اچھی دُکان پر جا کر ہمیں ایسی اشیاء کی طلب ہوتی ہے یا باغ میں جا کر ہمیں اچھی خوشبو یا ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم وہاں مزے سے پھرتے ہیں۔ اسی طرح ایک اچھے دین میں آ کر ہم تھوڑا سا مزہ لینا چاہتے ہیں اور پھر یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

”پتنگ باز سجنا“

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

زندگی یوں تو گزر ہی جاتی ہے لیکن اگر ہماری زندگی باہم انسانوں کے درمیان اور ان کی محبّت میں گزرے تو وہ زندگی بڑی خوبصورت ہو گی اور یقیناً ہو گی۔ انسان اللہ کو خوش کرنے کے لیے عبادات کرتا ہے۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر خداوند تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے تاکہ اسے خالق اور پالن ہار کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔ اگر ہم اللہ کی خوشنودی کے لیے انسانوں کو محبت کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیں اور سوچ لیں کہ ہم نے کبھی بھی کسی انسان کو حقیر نہیں سمجھنا تو آپ یقین کریں کہ یہ سوچ ہی آپ کے دل کو اتنا سکون فراہم کرے گی کہ آپ محسوس کریں گے کہ جیسے خدا آپ کو مُسکراہٹ سے دیکھ رہا ہے۔ آپ عبادات ضرور کریں، شوق سے کریں لیکن خُدارا انسانوں کو بھی اپنے قریب کریں۔ یہ بھی عظیم عبادت ہے۔

اللہ کا تصوّر اور چیز ہے اور خدا کی ذات کا اعتراف اور چیز ہے۔ انسان کے اچھے کاموں میں جو مباح چیز ہے وہ عبادت ہے۔ یہ اچھی عادت ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ عبادت کے ذریعے وہاں پہنچ سکیں جس کی آپ کو آرزو ہے۔ ہم جب تھکے اور ولایت میں نوکریاں کرنے کے بعد وطن آئے تو ہمارا باہوں اور ڈیروں کے حوالے سے Concept ذرااور ہی تھا جس طرح عام طور پر لوگوں کا ہوتا ہے کہ وہ چرس کے سوٹے لگاتے ہیں اور لوگ بھنگ کے نشے میں ٹُن ہو کر پڑے رہتے ہیں۔ ہمارا بھی خیال تھا کہ اب ولایت میں کام کر کے تھک گئے ہیں۔ کیاڈیرے پر جا کر ہم بھی رہبانیت کی زندگی گزاریں گے اور مزے سے رہا کریں گے لیکن خواتین و حضرات! وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ اس سے زیادہ مشقت، جدوجہد، کوشش اور محنت کی زندگی اور کہیں ہے ہی نہیں لیکن عبادت کر لینا اور دین کے بارے بھی گفتگو کر لینا آسان کام ہے لیکن اس کے اندر اُتر کر اسے عملی طور پر اختیار کرنا مشکل کام ہے۔ یعنی تصوّف شریعت سے جدا نہیں ہے۔ یہ وہ نماز روزہ ہے لیکن اس میں علم کے ساتھ ساتھ عمل پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ ہم جس بابا کے پاس جاتے تھے ان کی بات ذرا مختلف ہوتی تھی۔ وہ ہمیں کتابوں اور اکتسابی پلندوں میں نہیں ملتی تھی اور نہ ہی ہم نے پڑھی تھی۔ ایسے بابوں سے لوگ شاکی بھی ہوتے ہیں۔ ایک بار باباجی نور والے کے صاحبزادے نے خود مجھ

سے شکایت کی کہ "بابا جی لوگوں پر بڑی مہربانی کرتے ہیں اور ان پر بڑے Kind رہتے ہیں۔ انہیں چیزیں بھی دیتے ہیں، رضائیاں بنا کر دیتے ہیں اور رسد فراہم کرتے ہیں۔ لیکن میرے اوپر بالکل مہربان نہیں ہیں۔ اگر میں کوئی چیز مانگوں تو اس پر شرط عاید کر دیتے ہیں۔"

اب صاحبزادے کی بات کا میرے دل پر بھی اثر ہوا کہ وہ تنگی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ شاید اُن کی ٹریننگ کے لیے تھا۔ میرا ذرا تھوڑا مُنہ چڑھا تھا اور بابا جی سے بات کر لیتا تھا۔ میں نے کہا کہ "بابا جی یہ صاحبزادہ صاحب شکوہ کناں ہیں کہ آپ انہیں وہ مراعات نہیں دیتے جو دی جانی چاہیے۔" اس پر بابا جی کہنے لگے کہ میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا بلکہ میری یہ آرزو ہے کہ اسے انسان کی مدد، آرزو اور انسان کے سہارے کی عادت نہ رہے اور یہ بلاواسطہ طور پر خدا سے مدد طلب کرے۔ اگر یہ انسان سے کوئی آرزو وابستہ کرے گا تو یہ خدا سے اتنا ہی دُور ہوتا چلا جائے گا۔

وہاں ڈیرے پر ایسے لوگ بھی آتے تھے جن کو اللہ کا بلاواسطہ طور پر علم تھا۔ یہ سعادت ہمیں تو خیر نصیب نہ ہو گی لیکن اُن لوگوں کا یہ ایمان تھا کہ اُن کے کاموں میں خدا کا پورے کا پورا عمل دخل ہے اور وہ اُن پر حاوی ہے۔ مجھے یاد ہے

کہ وہاں ایک اشرف لغاری آیا کرتا تھا۔ اسے پتنگ اُڑانے کا بڑا شوق تھا اور وہ بڑا ہی پتنگ باز سجنا تھا۔ وہ خوبصورت سی ریشمی چادر باندھتا تھا اور کاندھے پر پرنا رکھتا تھا اور جوں جوں بسنت قریب آتی جاتی تھی اس کا شوق اور مانگ بڑھتی جاتی تھی۔

میں نے اس سے کہا کہ "اشرف تم پتنگ سے اتنی محبّت کیوں کرتے ہو؟"

وہ کہنے لگا "صاحب اگر آپ بھی پتنگ اُڑا کر دیکھیں اور آپ کو بھی اس کی ڈور کا جھٹکا پڑے تو آپ بھی اسے چھوڑ نہ سکیں۔"

میں نے کہا کہ "تم ڈیرے پر بھی آتے ہو۔ بابا جی کی باتیں بھی سُنتے ہو اور لوگوں کی خدمت بھی کرتے ہو۔"

وہ کہنے لگا کہ "صاحب جی سب کچھ میری گڈی (پتنگ) اُڑانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔"

میں نے کہا یار اس میں کیا راز ہے تو وہ کہنے لگا جب میرا پتنگ بہت اُونچا چلا جاتا ہے اور "ٹکی" ہو جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور میرے ہاتھ میں صرف اس کی ڈور ہوتی ہے تو اس نہ نظر آنے کی جو کھینچ ہوتی ہے اس نے مجھے

اللہ کے قریب کر دیا ہے اور میرے دل پر اللہ کی کھینچ ویسے ہی پڑتی ہے جیسے اس پتنگ کی میرے ہاتھوں پر پڑتی ہے۔

اب ہم جو ولایت سے پڑھ کر اور موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر آئے تھے وہ کورے کے کورے تھے اور وہ پتنگ باز سجنا ہم سے بہت آگے تھا۔

وہ مجھے کہنے لگا "اشفاق صاحب آپ کو بھی کھینچ نہیں پڑتی؟"

میں نے کہا "یار اشرف، ویسے نہیں پڑتی جیسے تم کہہ رہے ہو اور یہ ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔"

وہاں ڈیرے پر ایک حاجی صاحب تھے۔ اُن کی آنکھیں گہری نیلی تھیں اور وہ بہت خوبصورت تھیں۔ وہ ڈیرے پر کافی عرصہ رہے تو ایک روز جانے لگے۔ ان کا رحیم یار خان کے کسی گاؤں سے تعلق تھا۔ جب وہ بابا جی سے اجازت طلب کر کے جانے لگے تو بابا جی نے ایک بار انہیں کہا کہ "حاجی صاحب آپ کچھ دیر اور یہاں رہ جاتے۔" ہماری بھی یہی خواہش تھی لیکن وہ مُصِر تھے کہ وہ ضرور جائیں گے۔ جب وہ جانے ہی لگے تو بابا جی کہنے لگے "حاجی صاحب کیا آپ کے گاؤں میں بھیڑ بکریاں ہوتی ہیں؟"

حاجی صاحب نے کہا کہ "جی ہاں بہت ہوتی ہیں۔ وہاں بھیڑوں کے بڑے گلّے ہوتے ہیں۔"

بابا جی نے ان سے کہا کہ "جب تم جاؤ گے تو کہیں نہ کہیں بھیڑوں کے ریوڑ کو کراس تو کرو گے جو وہاں چر رہے ہوں گے۔"

حاجی صاحب نے کہا کہ "جی ہاں۔"

بابا جی نے ان سے کہا کہ "جب تم بھیڑوں کے ریوڑ کے پاس پہنچ گئے وہاں کتّے بھی بہت ہوں گے۔ تو تم ان سے اپنا بچاؤ کیسے کرو گے۔"

حاجی صاحب نے کہا کہ "میں انہیں پتھر ماروں گا اور گزر جاؤں گا۔"

بابا جی نے کہا کہ "وہاں تو کئی سارے کتّے ہوں گے جو بھیڑوں اور بکریوں کی پاسبانی پر مامور ہوں گے۔ ایک پتھر سے تو ایک کتّا جی زخمی وغیرہ ہو گا۔"

اس پر حاجی صاحب کہنے لگے کہ "میں ایک لکڑی لوں گا اور اسے گھماتا جاؤں گا تاکہ کتّے گزند نہ پہنچائیں۔"

بابا جی فرمانے لگے کہ حاجی صاحب اگر تین چار کتّے ہوئے تو آپ لکڑی سے کس

کس کو ڈرائیں گے؟

اب حاجی صاحب کہنے لگے کہ "حضور آپ کی فرمائیں کہ اس situation میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

بابا جی نے کہا کہ "آسان طریقہ یہ ہے کہ کتّوں کو اور خود کو پریشان کئے بغیر اور کتّوں کو اپنا آپ دکھائے بغیر سب سے پہلے گڈریے کو آواز دو۔ وہ آپ کی آواز سُن کر اپنی جھگی سے باہر آئے گا۔ پھر آپ اس سے کہیں کہ میں یہاں سے گزرنا چاہتا ہوں اور وہ گڈریا کتّوں کو آواز دے گا کہ 'اوہ کالو، اوڈبو'۔ کتّے اس کے پاس آجائیں گے اور آپ آسانی سے گزر جائیں گے۔"

خواتین و حضرات! چاہے ہمارے پاس کتنی ہی اچھی استری کیوں نہ ہو جب تک ہم اس کے پلگ کو بجلی سے Connect نہیں کریں گے وہ گرم ہو کر کپڑے کی سلوٹیں نہیں نکالے گی اور جب تک ہم خدا کی ذات سے رابطہ و تعلّق استوار نہیں کریں گے زندگی کی سلوٹیں بھی دُور نہیں ہوں گی۔

مجھے فرانس کے ملّاحوں کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ جب وہ سمندر میں اُترنے لگتے ہیں تو ایک بڑی مختصر سی دُعا مانگا کرتے ہیں کہ اللہ تیرا سمندر بہت بڑا

ہے اور میری کشتی بہت چھوٹی ہے۔

گو یہ ایک معمولی سی دُعا ہے لیکن اس میں اتنا اعتراف ہوتا ہے اور خدا سے اتنی قربت ہوتی ہے کہ اُن کی بات بن جاتی ہے۔

اس بات کا احساس رکھنے والے بہت سے لوگ تھے اور اب بھی ہیں۔ ایسے ہی جانکار لوگوں میں سے ایک شخص سلطان راہی تھا۔ پنجابی فلموں کے حوالے سے انہیں آپ بھی جانتے ہیں۔ وہ میرے دوست تھے اور ہمارا رابطہ فلم سے ہٹ کر ایک اپنے انداز کا تھا۔

ایک دن مجھے اُن کا پیغام ملا کہ ہم نے ایک چھوٹی سی محفل رکھی ہے آپ اس میں شرکت ضرور کریں اور آپ اسے پسند کریں گے۔

لاہور میں ایک علاقے نسبت روڈ ہے جہاں دیال سنگھ کالج ہے۔ اس کے عقب میں چھوٹی چھوٹی گلیاں ہیں جن میں اچھے اچھے لوگ رہتے ہیں۔ وہاں پر وہ محفل رکھی گئی تھی۔ بس وہاں دس بارہ لوگ ہی تھے۔ بڑی اچھی سی وہ بیٹھک تھی اور اس میں جالی والا دروازہ لگا ہوا تھا۔ سلطان نے اس میں اگر بتیاں جلا کر بڑا خوشگوار بندوبست کیا ہوا تھا۔ شاید آپ کو پتہ ہو کہ سلطان راہی کو قرات کا بڑا

شوق تھا اور اس کا اپنا انداز تھا۔

سلطان راہی کے ساتھ ایک گاؤں کا بالکل پینڈو آدمی بھی تھا جس نے دھوتی باندھی ہوئی تھی اور اس کے کندھے پر کھیس تھا۔ سلطان راہی نے اس شخص کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ ان سے ملیں یہ "بھا رفیق ہیں۔"

سلطان راہی نے کہا کہ میں آپ کو کچھ سُنانا چاہتا ہوں۔

ہم سب نے کہا کہ "بسم اللہ ضرور سُنائیں۔"

انہوں نے کہا کہ "میں سورۃ مزمل تلاوت کروں گا۔"

ہم نے کہا کہ "سبحان اللہ اور کیا چاہیے۔"

پھر سلطان راہی نے اپنے انداز، اپنے رنگ اور طریقے سے سورۃ مزمل کی تلاوت شروع کی اور لوگوں نے بہت ہی اسے پسند کیا۔ پھر انہوں نے بھا رفیق کی طرف دیکھا اور ان سے کہا کہ آپ بھی کچھ فرمائیں۔

اب ہمارا اندازہ نہیں تھا کہ گاؤں سے آنے والا ایسا سیدھا سا آدمی بھی کچھ سُنائے گا۔ بھا رفیق نے کہا کہ میری آرزو بھی سورۃ مزمل سُنانے کی ہی تھی لیکن چونکہ

اب سلطان بھائی نے سُنا دی ہے تو میں کچھ اور تلاوت کر دیتا ہوں۔ ہم نے کہا نہیں نہیں آپ بھی یہی پڑھیں۔

اب خواتین و حضرات! انہوں نے بیٹھ کر کھیس کندھے سے اُتار کر گود میں رکھ لیا اور سورۃ

مزمل سُنانی شروع کی۔ آپ نے بھی بڑے بڑے قاریوں کو سُنا ہو گا لیکن انہوں نے جو تلاوت کی اس کا اپنا ہی انداز تھا۔ جب وہ سُناتے چلے جا رہے تھے ہم سب نے ہی محسوس کیا کہ یہ تاریخ کا کوئی اور وقت آ گیا ہے۔ یہ وہ وقت شاید نہیں ہے جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں ایسے لگا کہ جیسے ہم مدینہ شریف اور آغازِ اسلام کے وقت کی زندگی میں ہیں اور یہ وہی عہد اور زمانہ ہے اور ہم ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جو اس عہد کی آواز کو سُن رہے ہیں۔

ہم نے محسوس کیا کہ اس کمرے میں ایک عجیب طرح کا نور اور روشنی آ گئی ہے۔ (ہو سکتا ہے یہ ہمارا خیال ہو لیکن کچھ خاص رنگ و نور کی بارش ہمیں محسوس ضرور ہوئی) اب صُورتِ حال یہ تھی تلاوت کے خاتمے کے بعد ہم سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ہم بھا رفیق کا شکریہ زبان سے ادا بھی نہیں کر سکتے تھے۔ البتّہ ہماری

نگاہوں اور جھکے سروں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ہم اس گاؤں کے آدمی کے بہت مشکور ہیں اور ہم پر جو کیفیت تھی وہ اس سے پہلے ہم پر کبھی نہیں گزری تھی۔

میں نے ہمّت کر کے سلطان سے کہا کہ ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں کہ آپ نے اور آپ کے دوست نے سورۃ مزمل سُنائی اور ہم پر جو کیفیت طاری ہوئی پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اس پر سلطان راہی نے کہا کہ "بھاجی میں سورۃ مزمل جانتا ہوں اور بہت اچھی جانتا ہوں لیکن یہ (بھا رفیق) مزمل والے کو جانتا ہے۔"

خواتین و حضرات! جب آپ والے کو جاننے لگتے ہیں یا اللہ کے ساتھ ایسا رابطہ پیدا ہو جاتا ہے جیسا پتنگ باز سجنا اشرف کا تھا تو پھر کیفیت ذرا اور طرح کی ہوتی ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے پوری زندگی کے مزے اور لطف و سکون ایک طرف اور اس کیفیت کا سرور ایک طرف ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

بلیک اینڈ وائٹ

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

زندگی بھی عجیب چیز ہے۔ اس میں بعض اوقات ایسے موڑ آجاتے ہیں جب انسان بالکل مایوس اور لاچار سا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو بے بس خیال کرتا ہے۔ حقیقت میں زندگی کئی ایک مدارج میں طے ہوتی ہے۔ ایک وقت انسان شیر خوارگی کی حالت میں ہوتا ہے تب وہ اپنے ماں، باپ، رشتہ داروں اور بڑوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ (یہ میں عام زندگی کی بات کر رہا ہوں اس میں مَیں روحانی حوالے سے جائزہ نہیں لے رہا ہوں)۔

اس حالت میں انسان سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل عاری ہوتا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو روتا ہے۔ کوئی گُدگُدی کرے تو پہلے عجب محسوس کرتا ہے، پھر رو دیتا ہے یا چہرے پر مُسکراہٹ پھیل جاتی ہے بلکہ کئی بچّے تو کلکاریاں مار کر ہنستے ہیں۔

پھر انسان Black and White سے نکل کر Colourful زندگی میں آتا

ہے۔

آپ کو اس بات کا علم تو بخوبی ہو گا ہی کہ بچّہ ایک ایسے مقام پر بھی ہوتا ہے جب اسے چیزیں بلیک اینڈ وائٹ نظر آتی ہیں اور پھر جب وہ چند ہفتے زندگی بسر کر لیتا ہے تو اسے یہ دنیا رنگین نظر آنا شروع ہو جاتی ہے اور شاید انسان اسی رنگینی کے باعث ہی بعد میں رنگین مزاج بھی ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔(مُسکراتے ہوئے)

یہ قدرت کے کام ہیں۔ لڑکپن میں انسان خود میں چند تبدیلیاں محسوس کرتا ہے۔ پھر جوانی، شادی کی عمر ہوتی ہے۔ آزادی سے اچانک انسان سنجیدہ زندگی کی جانب آ جاتا ہے۔ پھر انسان پر اُدھیڑ پن آتا ہے اور اس کے بعد بڑھاپا آتا ہے۔ یہ زندگی کے ظاہری مدارج ہیں جو ایک باپ اور نانا، دادا بننے والے شخص پر سے گزرتے ہیں۔

زندگی کا ایک دوسرا رُخ روحانیت کا ہے۔ کچھ انسان بس کھاتے پیتے زندگی بسر کر جاتے ہیں، میری طرح اور کچھ اپنے ہونے یا دنیا میں آنے کے مقصد کی آگاہی کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ جو لوگ مقصد پا لیتے ہیں وہ تو شاید کامیاب ہی ہوتے ہیں اور جو مقصد کو پا لینے کی کوشش میں رہتے ہیں میرے خیال میں وہ

پھر بھی ہم جیسے گنواروں اور بے مقصد زندگی گزارنے والوں سے تو بہرحال بہتر رہتے ہیں۔

خواتین و حضرات! جو مقصد کو پا لیتے ہیں یا اس کے حصول کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں وہ شاید اس Colour کی حکمت کو پہچان گئے ہوتے ہیں جو انہوں نے اپنی شیر خوارگی کے پہلے ہفتوں میں محسوس کیا ہوتا ہے، جب وہ بلیک اینڈ وائٹ سے Colourful دنیا میں لوٹے تھے۔ ان میں کئی ایسے ہیں جو جنگلوں, بیابانوں اور پہاڑوں کی چھاؤں میں اسلام آباد کے ڈپٹی سیکرٹیریوں اور بیوروکریٹس کی طرح رہبانیت کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ وہ شاید خود کو تو کسی حد تک آسانی میں رکھ پاتے ہوں گے لیکن ان کے اس Colourful Vision کا عام لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ لیکن جو لوگ ہم میں رہ کر یا ڈیروں میں بیٹھ کر لوگوں کو محبّت کا درس دیتے ہیں وہ زیادہ بہتر ہیں۔

لیکن گھروں سے باہر رہنا اولیا اللہ کا کام رہا ہے۔ ان کی وہ سیاحت ایک مخصوص یا Limited Period کے لیے ہوتی تھی اور وہ ایک مخصوص عرصہ بطور ٹریننگ گزارتے تھے۔ کوئی بھی ایسا شخص یا خدا کا بندہ جس نے لوگوں سے محبّت کی بات لوگوں کو بتائی، وہ ساری زندگی جنگلوں، بیابانوں میں رہ کر نہیں آیا اور اس کی

تمام تر تپسیا، ریاضت محض اپنے آپ تک ہی محدود نہیں رہی۔

ہمارے بابا جی نور والے کہا کرتے تھے کہ "جو لوگوں کو آسانی عطا کرے وہ بابا ہوتا ہے۔ اور جو لوگوں کو آسانی عطا نہ کرے وہ بابا نہیں ہو سکتا۔"

جب ہم چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے اور ابھی ہم دنیا کی مادری اُلجھنوں کا شکار نہیں ہوئے تھے، ہمارے گاؤں میں ایک مائی بھاگو ہوتی تھی۔ وہ بیچاری انتہائی غریب تھی۔ اس کے دو جواں سال بھائی تھے۔ کرتے ورتے کچھ وہ تھے نہیں۔ وہ ہی لوگوں کے گھروں سے مانگ تانگ کر لے آتی تھی۔ دیہاتوں میں زندگی اتنی مشکل نہیں ہوتی جس قدر شہروں میں ہے۔ شہروں میں ہم لوگوں نے اپنے روزمرّہ کے لوازمات کچھ زیادہ ہی بڑھا رکھے ہیں اور ناحق اپنے کندھوں پر بوجھ ڈال رکھا ہے۔ وہ صبح اٹھتی، دو پھلکے (روٹیاں) پکاتی۔ دو تین گھروں سے لسی مانگ لائی اور اچار مرچوں سے وقت چلا لیتی۔ اس کے آس پاس کے گھروں والے بھی اسے کچھ دے دلا جاتے۔

خواتین و حضرات! وہ تھی بڑی سیانی، جب اسے کچھ چاہیے ہوتا تو وہ بجائے مانگنے کے وہ کسی کے گھر میں چلی جاتی۔ اگر کوئی عورت گھر میں لحاف سی رہی ہوتی یا

مثال کے طور پر اچار ڈال رہی ہوتی تو وہ اس کی مدد کرتی اور کہتی "بھین تو چھڈ ایہ میں کرنی آں تو کوئی ہور کم کر لے۔"

(بہن تم چھوڑو، یہ کام میں کرتی ہوں۔ آپ کوئی اور کام کر لو)

ایسے ہی کہی ہوئی اور ساتھ کام کرواتی رہتی۔ واپسی پر وہ عورت اسے ضرور کچھ نہ کچھ دے دیتی۔ ایسے ہی وہ میری ماں کے پاس بھی کبھی کبھار آ جاتی تھی اور میری ماں بھی اسے کچھ چیزیں یا پیسے وغیرہ دے دی جنہیں وہ اپنے دوپٹے کے ساتھ باندھ لیتی۔

ایک دن وہ میری ماں کو بتانے لگی کہ فلاں گاؤں میں ایک بابا ہے۔ اس کی دُعا میں بڑا اثر ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس کا تعویذ بڑا تیز اثر ہے۔ میرے گھٹنے میں درد رہتا ہے۔ میں نے سوچا ہے اس سے ہی تعویذ لے آتی ہوں۔ وہ کہنے لگی کہ وہ بابا تعویذ یا دم کا ہدیہ لیتا ہے اور اگر ہدیہ نہ دیں تو کام نہیں ہوتا۔

وہ بتا رہی تھی کہ وہ کئی مہینوں سے بابے کے ہدیے کے لیے پیسے جوڑ رہی ہے اور جیسے ہی اس کے پاس پیسے پورے ہو گئے، وہ وہاں دُعا لینے جائے گی۔

میری ماں کہنے لگی "تو ڈاکٹر کول نئیں گئی؟" (تو نے ڈاکٹر نہیں دکھایا)

وہ بولی ”نئیں بابے کولوں دم ای کرواواں گی خورے ڈاکٹر دی سمجھ وچ بیماری آوے کے نہ آوے۔“

(میں اس پیر سے ہی دم کرواؤں گی شاید ڈاکٹر کی سمجھ میں اس کی بیماری آئے یا نہ آئے)

اب وہ بیچاری سمجھ رہی تھی کہ بابا ہی بہتر طور پر اس کی تکلیف کو سمجھ سکتا ہے۔

خواتین و حضرات! ایسے بابے نہیں ہوتے۔ بابے آسانیاں فراہم کرتے ہیں۔ لوگوں کو آسرا اور سہارا فراہم کرتے ہیں، تشفی دیتے ہیں۔ ایسے وقت میں محبّت کے دو بول عطا کرتے ہیں جب انسان کو اُن کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے نزدیک وہ الیکٹریشن بابا ہے جو کسی گھر میں بغیر پیسے مانگے بجلی کا شو ٹھیک کر کے گرمی میں پنکھا چلا دیتا ہے۔ میرے نزدیک وہ بابا ہے جو کسی محتاج بوڑھے کو اپنا کام چھوڑ کر سڑک پار کرواتا ہے اور میرے خیال میں وہ سائیکل پر برف کے گولے بیچنے والا ایک بابا ہے جو کسی راہی کو بغیر معاوضہ محبّت سے پانی کا ایک گلاس پیش کرتا ہے۔

یہ وہ بابے ہیں جن کی زندگی Colourful ہے۔ وہ ہم جیسے مفکّر، اسکالر اور

دانشور نہیں ہیں جو ابھی تک بلیک اینڈ وائٹ پھرتے ہیں۔ آج کل ایک اور روش ہمارے ہاں پروان چڑھ رہی ہے کہ لوگ مذاق میں یا جان چھڑانے کے لیے کسی کو راستہ غلط بتا دیتے ہیں۔ یہ تو بابے والی کوالٹی نہیں ہے۔ یہ تو بلیک اینڈ وائٹ کام ہے۔

اس کی ساری وجہ ہمارے رویّے ہیں جو ہمیں ایک دوسرے سے قریب یا دور کر دیتے ہیں۔ اگر ہم سوچ لیں کہ ہم نے ایک مہینے میں ایک ہفتے میں یا دن میں کسی بھی ایک وقت لوگوں کی اور انسانوں کی آسانی کے لیے کام کرنا ہے تو ہمارے سارے مسائل خود بخود حل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ یہ بلیک اینڈ وائٹ زندگی خود بخود کلر فُل ہونا شروع ہو جائے گی۔ ہماری زندگی کا انسانوں کے لیے صرف کیا گیا ایک ایک منٹ، سیکنڈ جب بہت سارے انسانوں کے اسی طرح کے وقف کیے گئے گھنٹوں، دِنوں، منٹوں اور سیکنڈوں میں جمع ہو گا تو یہ وقت اتنا بن جائے گا کہ شمار نہیں ہو گا۔

خواتین و حضرات! یہ کام انفرادی طور پر کرنے کا ہے، حکومت کا نہیں ہے۔ ہم ہر بات پر حکومت کو دوش دینا شروع کر دیتے ہیں۔ نظام کی خرابی کی بات کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی بات ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ ”جی ساڈا نظام ای ٹھیک نہیں“ یا

یہ کہ حکومت کچھ بھی نہیں کر رہی۔ انسانوں کو آسانیاں فراہم کرنا حکومتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ انفرادی نوعیت کا کام ہے اور حکومت کا کام تو ٹیکس اور یوٹیلٹی بِلز کا حساب کتاب رکھنا ہے۔ ہمارے بابا بھی کہا کرتے تھے کہ کوئی انسان حقیر نہیں ہوتا، کبھی کسی کو کم تر نہ جانو۔ وہ کہتے کہ کافر سے اس لیے نفرت نہ کرو کہ وہ کافر ہے بلکہ اس کے کفر کو قید جانو، اسے نہیں۔ وہ تو انسان ہے۔ ہماری زندگیوں پر یوٹیلٹی بِلز کا اس قدر بوجھ بڑھ گیا ہے کہ ہم چڑ چڑے ہو گئے ہیں۔

ہماری زندگی بھی کئی لوگوں سے بہتر ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں انسان ہم سے بھی مشکل حالات میں جی رہے ہیں۔ ہم سب قدرت کی حسین شاہکار وادیوں میں بڑے شوق سے جاتے ہیں۔ آپ نے بھی دیکھا کہ وہاں کے رہنے والے کس حال میں زندہ ہیں۔ سردیوں میں وہ شدید برفباری کا شکار ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں نہیں ہوتیں۔ راستے بند ہو جاتے ہیں اور وہ ایسی زندگی سے عاجز آ جاتے ہیں اور ہم لوگ ٹولیاں بنا بنا کر وہاں سیر کرنے جاتے ہیں لیکن آپ ان کو دیکھیں، ہم وہاں جب بھی جائیں مہمان نوازی کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ کبھی ان کے ماتھے پر شکن نہیں ڈالی کہ یہ لوگ کس طرح اسیری کی زندگی میں ہیں۔

اور وہاں ان لوگوں نے جو جھونپڑیوں یا چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں،

گائیاں بھی ہوئی ہیں۔ وہ سارا دن خود ہی چرتی رہتی ہیں اور شام کو وہاں آ جاتی ہیں۔ وہ ان گائیوں کا دودھ دودھ کر بیچ دیتے ہیں۔ اور تو ان کا کوئی ذریعہ روزگار نہیں ہوتا۔ میں ممتاز مفتی اور ہمارا پورا لشکر ایسی ایسی جگہوں پر بھی گئے ہیں جہاں زندگی اتنی مشکل ہے کہ ناقابلِ بیان لیکن ان لوگوں نے ہمیشہ ہمارا ہنس کر اور مُسکرا کر استقبال کیا۔ ہمیں نہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اتنا پیار دیا کہ چٹیل پہاڑ اور خوبصورت لگنے لگے اور ہمارا اُن سے پیار اور رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔

ہمارے صحراؤں کے باسیوں نے اتنی محبّت اور اُلفتیں بخشیں کہ طبیعت پر بوجھ بڑھاتی ہوئی ہماری نفرتیں شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔ ہم ملک میں جہاں بھی گئے محبّت سمیٹتے ہوئے آئے۔ سرکار امام بری سے لے کر سخی شہباز قلندر اور بہاءالدّین زکریا کی نگریوں نے کہیں بھی ہمیں سندھی، بلوچی، سرحدی، پنجابی اور سرائیکی ہونے کا تاثر نہیں دیا۔ وہاں جا کر ایسا ہی لگا کہ ہم کسی ایک خمیر سے اٹھے ہوئے لوگ ہیں جن کی تکمیل میں ایک ہی مٹّی اور پانی استعمال ہوا ہے۔ ہم میں کوئی دراڑ نہیں ہے۔ یہ بلیک اینڈ وائٹ باتیں کرنے والے اور نفرتوں کا تاثر دینے والے تو کوئی اور ہی ہیں۔ ہم میں سے نہیں۔ یہ ہمیں ایک بھائی (بنگلہ دیش) کے بعد دوسروں سے جدا کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم تو ایسا نہیں ہونے دیں

گے۔

ہم تو یکجان ہی رہیں گے۔ ہم تو Colourful سوچیں گے، کلر فُل دیکھیں گے۔ جب تک یہ پہاڑ زندہ ہیں، ہمارے دریا کسی نہ کسی جگہ باہم ملے ہوتے ہیں۔ ہمارے چاروں صوبوں کی ہوائیں ایک دوسرے کا لمس محسوس کرتی ہیں۔ ہم مل کر اور اکٹھے ہو کر ہی جئیں گے اور رہیں گے۔

ہر قوم پر کڑا وقت آتا ہے لیکن وہ قومیں ہی آگے نکلتی ہیں جو عزم کی پیکر ہوتی ہیں۔ اپنے خون اور مٹّی سے محبّت کرتی ہیں اور یہ کڑا وقت ہی قوموں کو مضبوطی، توانائی اور استحکام عطا کرتا ہے۔ قومیں چوٹ کھا کر ہی اُبھرتی ہیں اور اپنی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔

کیا آپ کو علم ہے کہ ہمارے جوتوں میں جیکٹوں میں اور دیگر چیزوں میں جو چمڑا استعمال ہوتا ہے یہ کسی Process سے ہو کر اتنا نفیس ملائم اور چمکدار بنتا ہے۔

چمڑا اتنی بدبودار جگہ پر اپنی اس صورت کو اختیار کرتا ہے کہ اگر ہم دیکھ لیں تو کبھی چمڑا استعمال نہ کریں۔ چمڑے کو کبوتر کی بیٹوں یا فضلے میں کئی کئی دن پکایا جاتا ہے تاکہ اس کی حقیقی ملائمت نکل سکے۔ جب وہ تمام مشکل مراحل سے گزر کر آ

جاتا ہے تو اپنی خام حالت کی نسبت اس حالت میں کئی گنا زیادہ مہنگا ہو جاتا ہے۔
چمکدار اور خوبصورت بن جاتا ہے۔

جو قومیں بُرے حالات کا مقابلہ کر کے اچھے حالات میں آ جاتی ہیں، اپنے بُرے وقت سے سبق سیکھ لیتی ہیں وہ Colourful Vision کی حامل ہو جاتی ہیں۔ وہ بلیک اینڈ وائٹ نہیں رہتیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

"بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں"

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

حادثات کا نام جس قدر خوفناک ہے اسی قدر انوکھا بھی۔ ہم سُنتے ہیں کہ آج فلاں جگہ پر یہ حادثہ ہو گیا، فلاں پر یہ ہو گیا۔ پہاڑی سے وین لڑھک کر کھائی میں جا گری۔ دس بندے مارے گئے۔ موت کے کنویں میں سکوٹر چلانے والا اپنی کھٹارا سی سکوٹر سمیت گر گیا۔

انسان ویسے حادثات کو پسند نہیں کرتا لیکن عام طور پر حادثات کا بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر تعلق انسان سے ہی ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں حادثات لازم وملزوم ہیں۔ کوئی ایسا انسان اس جہاں میں نہیں گزرا ہو گا جس نے زندگی کا ایک حصّہ گزرا ہو، یا اہل و عیال والا ہو اور اس کے ساتھ کوئی حادثہ رونما ہوا نہ ہو۔ آئے روز حادثے ہوتے ہیں۔ حادثات کی بھی ایک اپنی تاریخ ہے۔ یہ زمین، پانی، جنگل، اُجاڑ صحرا و بیابان کسی بھی جگہ ہو انسان کی جان نہیں چھوڑتے۔

انسان تو اس کے شکار ہیں، وہیں دیگر جاندار بھی حادثات کی نظر ہوتے ہیں۔

اگر آپ کی گرم علاقے میں تانگے پر سواری کریں (خیر اب تانگے ہمارے ہاں سے تو معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور اب ان کی جگہ چنگ چی رکشوں نے لے لی ہے۔ یہ بھی انسان نے ایک نرالی چیز ایجاد کی ہے۔ تانگے کی طرح ایک ٹرالی سی بنا کر اس پر گھوڑے کی جگہ ایک سکوٹر کو راسیں ڈال کر کئی انسانوں کو پھنس پھنسا کر بٹھا دیا جاتا ہے اور وہ گھوڑے کی طرح ہنہناتا یا ٹرر ٹرر کرتا بھاگا جاتا ہے۔) تو آپ کئی جگہوں پر دیکھیں گے کہ گھوڑے چلتے چلتے گرمی کی شدّت سے گر پڑتے ہیں اور بے چارے مر جاتے ہیں حالانکہ چند لمحے پہلے وہ اچھے بھلے بھاگے جا رہے ہوتے ہیں۔ ایسے واقعات ان علاقوں میں اکثر و بیشتر رونما ہوتے رہتے ہیں۔

آج تک کسی کو علم نہیں ہو سکا کہ ان حادثوں نے اس دنیا میں کب جنم لیا؟ یہ کیسے ہونے لگے؟ اور کیونکر ہونے لگے لیکن سب کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ حادثے جو کسی کے ساتھ ہوتے ہیں اور ان کی تاریخ شاید اتنی ہی پرانی ہے جتنی دنیا کی یا زمین کی تاریخ پرانی ہے۔

اب یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر حادثہ انسانی غلطی کی وجہ سے ہی ہو۔

اگر کسی صاحب کا بچّہ فوت ہو جاتا ہے اور وہ اس کا ایک ہی بچّہ ہوتا ہے تو یہ گو ایک عام سی بات ہے لیکن اس شخص کے لیے جو اپنے بیٹے سے محروم ہوا ہے ایک سانحۂ عظیم ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ "جی جس نے جنم لیا ہے ایک دن مرنا تو ہے ہی۔"

لیکن وہ شخص کہتا ہے کہ اگر ایسی ہی بات ہے تو ٹھیک لیکن وہ اس حادثے اور دکھ سے کیوں گزرا اس سے بہتر تو یہ تھا کہ وہ خود مر کھپ گیا ہوتا اور اسے یہ دکھ نہ دیکھنا پڑتا۔ حوادث اپنے رنگوں اور انداز میں رونما ہوتے ہیں۔

خواتین و حضرات! حادثات اور واقعات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ کچھ ملتے جلتے ہی ہوتے ہیں۔ واقعات میں شاید انسان کا اپنا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے اور حادثات میں کچھ کم۔

آپ کا جنگل میں شیروں کا شکار کرنا اور تن تنہا بندے کا انہیں بھگا دینا یا مار ڈالنا، ایک واقعہ ہے لیکن ٹرین کا باراتیوں سے بھری بس سے ٹکرا جانا ایک حادثہ ہے۔ اس کے لیے انسان پہلے سے تیار نہیں ہوتا۔

ایک آدمی تھا۔ اس کے پاس ایک گدھا تھا جس سے وہ اپنی کاشت کاری کا کام لیتا

تھا۔ ”پٹھانیرا“ (چارہ) کاٹ کر وہ اس پر رکھ کر لاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اس کا وہ گدھا بِدک گیا اور اس کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اس شخص نے ایک بھاری سی لکڑی اسے ڈرانے کے لیے اس کی طرف پھینکی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ لکڑی اس گدھے کے سر پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے قریبی یا گاؤں کے لوگوں نے اس سے افسوس کیا کہ اس کا ناحق میں نقصان ہو گیا۔

اس واقعہ یا حادثے کے (اسے آپ جو بھی نام دیں) وہ اپنی بھینس کا دودھ دوہنے لگا تو اس کی بھینس نے ایک بچّہ دیا ہوا تھا جسے ہم پنجابی میں کٹّا کہتے ہیں۔ اس کا بچّہ ابھی چند دِنوں کا ہی تھا۔ جیسے عام طور پر بھینس کو دوہنے یا اس کا دودھ نکالنے سے پہلے اس کے بچّے کو بھینس کے قریب کیا جاتا ہے تا کہ ایک تو وہ دودھ پی لے اور دوسرا بھینس اچھی طرح اپنے تھنوں میں دودھ لے آئے اور ”پسم“ جائے۔ اس شخص نے کٹے کو چھوڑا تو وہ بجائے بھینس کی طرف جانے کے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا اور مستیاں کرنے لگا۔ وہ شخص بار بار اسے پکڑ کر بھینس کے قریب کرتا لیکن وہ اس کے قریب نہ آتا۔ اس شخص نے غصّے میں آکر اس کٹّے کی گردن کو مروڑ کر بھینس کی جانب زبردستی موڑنا چاہا تو ایک دم وہ نیچے گر گیا۔ اب وہ شخص یا کسان جب اسے قریب جا کر دیکھتا ہے تو وہ مر چکا ہوتا ہے اور اس

کا منکا ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ اب وہ سخت پریشان اور شدید دُبدھا میں پڑ گیا کہ ہائے ابھی لوگ اس سے گدھے کی ہلاکت کا افسوس کر کے گئے اب کیا سوچیں گے۔

اب اس کے سامنے ایک تو مرا ہوا گدھا پڑا ہے اور اس کے ساتھ وہ بھینس کا بچّہ اور وہ سخت پریشانی میں بیٹھا ماتھے پر ہاتھ رکھے سوچ رہا ہے کہ اس کے ساتھ اس قسم کے حادثات کیوں ہو رہے ہیں۔ وہ یہ سوچتے سوچتے پاس رکھی چارپائی پر دھڑام سے گرتا ہے۔

جس طرح ہم تھک ہار کر صوفے پر ِگر جاتے ہیں، تو اس چارپائی کے جو دونوں ''سیرو'' یا پائیوں کو پکڑ کر رکھنے والے ڈنڈے سے زمین پر جا گرتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ زمین پر جا پڑتا ہے۔

خواتین و حضرات! اب آپ اس شخص کی پشیمانی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ یکے بعد دیگرے اس کے ساتھ کیا حادثات گزر رہے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ اس پر وقت بھاری ہے۔ لہذا اسے دو نفل نماز ادا کرنی چاہیے تا کہ اسے ان حادثات کی مصیبت سے چھٹکارا مل سکے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ زمین سے اُٹھتا ہے تا کہ وضو کے لیے دیوار پر رکھا لوٹا جو پانی سے بھرا ہے اسے اٹھا سکے۔ وہ

جونہی اس لوٹے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتا ہے اور نیچے میاؤں میاؤں کرتی بلّی کو لگتا ہے اور وہ بلّی موقع پر ہی مر جاتی ہے اور پوری طرح میاؤں بھی نہیں کر پاتی۔

خواتین و حضرات! یہ سب کے چند منٹوں کے اندر اندر ہوتا ہے۔ اب اسے کوئی کیا نام دے۔ حادثے کہیئے یا واقعات۔۔۔۔۔۔!

حقیقت میں بعض اوقات سوچ کچھ اور رہا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہو کچھ اور رہا ہوتا ہے۔ شاید اسی کو حادثہ کہتے ہیں لیکن حوادث کے بارے میں کچھ لوگوں کی رائے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حادثے انسان کے اپنے کارناموں اور کرتوتوں کی پاداش میں جنم لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر کہ ایک شخص اگر گاڑی تیز نہیں چلائے گا تو وہ نا اوور سپیڈ ہو گی اور نہ ہی کسی دوسری گاڑی سے جا کر ٹکرائے گی۔ اب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی آہستہ گاڑی چلانے والے سے کوئی اور آ کر ٹکرا جائے۔

بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے لیکن وہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ جو اس کسان کے ساتھ بیتی۔

اس حوالے سے ایک شاعر نے بھی لکھا ہے کہ

وقت کرتا ہے پرورش برسوں

حادثے ایک دم نہیں ہوتے

لیکن یہ بحث بہت کمی ہے۔ بعض اوقات حادثے ہی انسان کو چور ڈاکو سے پارسا بناتے ہیں اور بڑے بڑے پارسا اور عبادت گزار حوادث کے باعث اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

کچھ لوگ ان حوادث سے گزر کر خدا کے قریب چلے جاتے ہیں اور کچھ دوسری راہ پر جا نکلتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بجا نہیں ہے کہ حادثات کا عمل دخل انسانی زندگی میں نہیں ہے۔

جب ہم تیسری یا چوتھی کلاس میں پڑھا کرتے تھے تب ہمارے اس چھوٹے سے بغیر عمارت دیوار والے سکول میں ایک لڑکا پڑھا کرتا تھا۔ اس کا نام بشیر تھا اور بشیر سے یاد آیا کہ ہمارے قصور میں اتنے نام کے بشیر آپ کو ملیں گے کہ آپ کسی بازار میں کھڑے ہو کر ایک بار اُونچی آواز میں بشیر پکاریں، آپ کو اس وقت تین چار بشیر مل جائیں گے۔ اس لڑکے کا نام بشیر تھا۔ وہ تھا تو گوراچٹا لیکن اس کی

پھوپھی جسے وہ پنجابی میں ''بھووا'' کہتا تھا وہ اس کا سر منڈوا کے رکھتی تھی۔ اس پر سارے لڑکے یا بچّے اسے مذاق سے ''بشیر توڑا'' کہا کرتے تھے۔ اسے جب بھی ماسٹر صاحب ڈانٹتے تو وہ اونچی آواز میں ''بھووا'' کو پکارتا اور اس کی وہ ''بھووا'' جو سکول سے سامنے والے گھر میں رہتی تھی اپنے گھر کی کچی دیوار سے سر نکال کر دیکھتی اور سکول پہنچ جاتی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ وہ اپنے اس بچّے کو پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنائے گی اور ہمارے اُستاد سے بھی کہتی کہ وہ اس پر زیادہ سختی نہ کرے۔ وقت گزرتا گیا۔ وہ لڑکا پڑھ لکھ نہ سکا۔ ان کا گھرانہ انتہائی مذہبی قسم کا تھا لیکن وہ لڑکا بڑا ہو کر آوارہ گردی کرنے لگا اور اس کی صحبت گھر کے ماحول سے برعکس قسم کے لوگوں سے ہوئی اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ ناچنے والے گروہ میں شامل ہو گیا۔ وہ ناچنے والے جنہیں ''کھسرے'' کہا جاتا ہے۔ وہ اچھا بھلا صحتمند اور خوبصورت بشیر توڑا میلوں ٹھیلوں میں ناچنے والوں کے ساتھ رہتا اور وہ اس طرح بڑا خوش تھا

مجھے اپنے دوست کی وہ بات بھی یاد آرہی ہے کہ جو اس نے مجھے بڑے مزے لے لے کر بتائی تھی۔

اس نے مجھے بتایا کہ اس کے گاؤں میں ایک موچی تھا اور اس کے چار پانچ بیٹے

تھے اور اس نے بچپن سے ہی اپنے ان بچّوں میں سے کسی کا نام آئی جی کسی کا ڈی آئی جی کسی کا تھانیدار رکھا ہوا تھا لیکن بڑے ہو کر اس کے وہ تمام بیٹے نہ تو پڑھ لکھ سکے اور نہ ہی کچھ بن سکے گو کہ اس نے اپنی بساط کے مطابق انہیں پڑھانے کی بڑی کوشش کی۔

میرے دوست نے مجھے بتایا کہ اس کے چاروں بیٹوں میں دو تو بشیر توڑے کی طرح ناچنے

گانے والوں کے ساتھ مل گئے اور باقی آوارہ گردی کرتے ہیں۔

خواتین و حضرات! یہ سب حادثات ہیں، واقعات نہیں ہیں۔ ان حادثات و واقعات میں قدرت کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔

ایک بار ہم ڈیرے پر بابا جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک نوجوان جو بہت خوبصورت تھا، سائیکل پر آیا اور اس چار پائی جس پر بابا جی بیٹھے ہوئے تھے سائیکل پر سے اُترے بغیر کھڑے کھڑے ایک پاؤں رکھ کر کہنے لگا "آپ لوگ اِدھر بیٹھے ہو کیا آپ کو پتہ ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔"

ہم سب کو اس کی اس حرکت پر بہت غصّہ آیا لیکن بابا جی مُسکرانے لگے اور کہا

"پتر توکون ایں۔"

وہ بولا "میں دیال سنگھ کالج میں پڑھتا ہوں اور میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ انسان پہلے بندر ہوا کرتا تھا اور ایک حادثے میں یہ انسان بنا ہے۔"

بابا جی کہنے لگے "نئیں میرے پیارے بیٹے تو تو نبیوں کی اولاد ہے۔ تو بندر کیوں تھا۔ تو عظمت والے نبی کی اولاد میں سے ہے۔ اس پر وہ لڑکا جو پہلے انتہائی گستاخانہ انداز میں بات کر رہا تھا نرم پڑ گیا اور اس کی آنکھوں میں ایک دم سے روشنی کی شمع روشن ہو گئی۔"

اس بیچارے نے کسی مغربی مصنّف کی کتاب سے پڑھ لیا ہو گا کہ انسان پہلے بندر ہوتا تھا اور کسی ایک حادثے نے اسے انسان کا روپ دے دیا ہے یا وہ بدلتے بدلتے انسان کے روپ میں آ گیا۔

خواتین و حضرات! حادثے چاہے جتنا مرضی ہماری زندگیوں میں کردار ادا کریں۔ یہ چاہے جس قدر مرضی ہماری روحوں، جسموں اور سوچوں پر شب خون مار لیں، ہم نے ان حوادث کے آگے ہار نہیں ماننی اپنا مقصد نہیں کھونا۔ اپنے آپ کی تلاش کا کام جاری رکھنا ہے۔ اس لڑکے کی طرح ایک کتاب پڑھ کر

بغیر سوچے سمجھے غصّہ نہیں کھا جانا بلکہ سوچنا ہے۔ اپنی روحوں کے اندر جھانکنا ہے۔ خود کو مایوس کیے بغیر کسی دیوار سے ڈھولگا کر اس بات کو تلاش کرنا ہے کہ ہماری زندگی میں ہونے والے حادثے ہمیں پریشان ہی کیوں کرتے ہیں؟

ایسے حادثے ہی کیوں ہوتے ہیں جو ہماری جانوں سے کھیلتے ہیں؟

ایسے حادثے کیوں نہیں ہوتے کہ انسان دوسرے انسان کی توقیر کرنے لگے۔

اسے اس کا کھویا ہوا مقام دے دے۔

ایک ڈپٹی کمشنر لوگوں سے خود آکر پوچھے کہ انہیں کیا مسائل ہیں تاکہ لوگ ان کے دفتر کے باہر صبح سے شام کر لیں۔

جو لوگ اپنی ہستی کو پہچان لیتے ہیں انہیں دکھی اور رنجیدہ کرنے والے حوادث سے پالا کبھی نہیں پڑتا۔ میری اس Prolix کا مقصد ہر گز نہیں کہ میں اس مقام پر ہوں بلکہ میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ میری مدد کریں تاکہ میں بھی اس مقصود تک پہنچنے کی کوشش کر سکوں جو اُن لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو کامیاب ہوتے ہیں۔ جو حوادث میں رہ کر بھی خوشیاں بانٹتے ہیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہوتے ہیں جو حادثوں کی نذر ہو کر اوندھے مُنہ گرتے ہیں بلکہ ان لوگوں

جیسے ہوتے ہیں جو کہتے ہیں۔

بلھے شاہ آساں مرنا ناہیں

گور پیا کوئی ہور

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

Folk Wisdom

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

معافی اور درگزر، یہ ایک پھول کی مانند ہیں۔ اس کے باعث انسان ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں اور معافی، انسانوں کے مابین Connectivity کا کام دیتی ہے۔ جو لوگ معافی مانگنے سے محروم ہو جاتے ہیں وہ انسان کے درمیان رابطے اور تعلق کے پُل کو توڑ دیتے ہیں اور ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ ان کو خود کسی وجہ سے آدمیوں اور انسانوں کے پاس جانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن وہ پل ٹوٹا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک انسان سے کوئی زیادتی کرتے ہیں یا انسان کا کوئی گناہ کرتے ہیں اور پھر وہ انسان خدانخواستہ فوت ہو جاتا ہے یا برطانیہ یا کینیڈا جا کر آباد ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں اس انسان کے پاس جا کر معافی مانگنے میں بڑی مشکل درپیش ہوتی ہے لیکن اگر ہم خدا کے گنہ گار ہوں اور ہمارا ضمیر اور دل ہمیں کہے کہ "یار تو نے یہ بہت بڑا گناہ کیا ہے

اور مجھے اپنے رب سے معافی مانگنی چاہیے۔" تو اس صورت میں ہمیں سب سے بڑی آسانی یہ ہوتی ہے کہ ہمیں اپنے خدا کو کہیں جا کر ڈھونڈ نہیں پڑتا تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ وہ تو ہر جگہ موجود ہے اس لیے ہمارے بابے اس بات پر زور دیتے ہیں اور ہمارے باباجی ہمیں اکثر و بیشتر یہ کہا کرتے تھے کہ "انسان کے معاملے میں بہت احتیاط کیا کرو اور کوئی ایسا گناہ یا غلطی کی سرزدگی سے بچا کرو جو انسان سے متعلق ہو کیونکہ انسان سے کیے گناہ یا ظلم کی معافی اس سے ملے گی۔ اگر تم سے کوئی خدا کا گناہ ہو جاتا ہے تو یہ اور بات ہے وہ رحیم و کریم ہے اور ہر جگہ موجود ہے اس سے معافی کسی بھی وقت مانگی جا سکتی ہے۔ اگر وہ انسان کھو گیا تو مارے جاؤ گے۔"

اصغر ندیم سیّد (گفتگو کے درمیان میں سوال پوچھتے ہیں): خان صاحب! آپ کی ہم جتنی بھی باتیں سُنتے ہیں انہیں سُن کر بہت لطف آتا ہے۔ آپ ہمیں جس Folk Wisdom کی بابت بتاتے ہیں وہ کبھی مستریوں، کبھی درزیوں، کبھی ترکھانوں اور عام آدمی سے آپ لیتے ہیں۔ آپ براہِ کرم ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اور بتائیں۔

اشفاق احمد: یہ تو برسبیلِ تذکرہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ بات یہ ہے کہ آپ ماشاء اللہ

اُستاد اور پروفیسر ہیں اور آپ کو یہ بات پکڑنی خاصی مشکل ہو جائے گی کہ تعلیم سے الگ دانش ایک اور چیز ہوتی ہے۔ میں کسی پروگرام میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جب میں میٹرک کرنے کے بعد ایف اے میں داخل ہوا تو مجھے پھر شہر آنا تھا۔ میری ماں نے ہمارے ملازم کو ایک ٹرنک سا دیا اور کہا کہ جا کر اشفاق کو چڑھا آ۔ ان دنوں ہمارے ہاں سے ایک چھوٹی گاڑی چلتی تھی۔

جب میں چلنے لگا تو میری ماں نے کہا کہ ٹھہر جا اور اسٹیشن جانے سے پہلے تایا قاسم علی کو سلام کر کے جانا۔

خواتین و حضرات! ہمارا وہ تایا پورے گاؤں کا تایا تھا۔ وہ موچی تھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر جوتوں کو ٹانکے لگایا کرتا تھا۔ (حقیقت میں مَیں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا کہ کیونکہ میں اب میٹرک پاس کر چکا ہوا تھا اور تعلیم یافتہ ہو گیا تھا اور مجھے اللہ نے عقل دے دی تھی۔ اس طنزیہ گفتگو پر پورا ہال ہنسنے لگتا ہے) اب ماں مجھے زبردستی وہاں بھیج رہی تھی کہ تائے کو مِل کر جانا ہے اور میں چارو ناچار نہ چاہتے ہوئے تائے کے پاس گیا۔ انہیں سلام کیا۔

وہ مجھ سے کہنے لگے ''کتھے چلا ایں۔''

میں نے کہا کہ "جی میں بڑے کالج میں پڑھنے کے لیے شہر جا رہا ہوں۔"

تایا نے مجھ سے کہا "وہاں جا کے پُٹھیاں آستیناں والی قمیض نئیں پانی۔"

(وہاں جا کر ایسی قمیص زیبِ تن نہیں کرتی جس کی آستین یا کف اُلٹے ہوں)

بچّو! اب اس زمانے میں آستینیں اُلٹی کر کے ٹِچ کر کے بٹن لگانے کا بڑا رواج تھا اور میری آٹھویں جماعت سے یہ آرزو تھی کہ جب میں بڑا ہوں گا اور فرسٹ ائیر میں داخل ہوں گا تو Tum کف والی قمیص پہنوں گا لیکن اب تائے نے مجھے منع کر دیا۔ پتہ نہیں اسے کیسے پتہ تھا کہ میرے اندر ہی اندر یہ خواہش اُٹھتی ہے۔ دوسری بات تائے نے کہی کہ "پُتر بودے نہ رکھنا۔ (بیٹا لمبے بال مت رکھنا۔)"

اس زمانے میں ہم بچّوں کے سر پر مشین پھیر دی جاتی تھی اور بال بڑھنے دیئے بھی نہیں جاتے تھے اور آپ اس دکھ میں میرے شریک ہو سکتے ہیں۔

تیسری بات جو تائے نے مجھے کہی وہ یہ تھی کہ "کُڑیاں نوں نہ ویکھیں۔"

(لڑکیوں کی طرف متوجّہ نہ ہونا)

(ہال سے ایک آواز آتی ہے)

گویا تائے نے تمام اچھی باتوں سے منع کر دیا۔ (قہقہے)

اب یہ تائے کا حکم تھا۔ میں ان کی باتیں سوچتا ہوا اُنہیں سلام کر کے آ گیا۔ میں نے پھر شہر آ کر بڑے کالر والی قمیص سلوائی حالانکہ ہم گاؤں میں ایسی قمیصیں نہیں پہنتے تھے۔ اس پر بٹن آستینیں بھی بنوائیں۔ اس کے بعد میں نے بودے بھی رکھ لیے۔ لڑکیاں ہمارے ساتھ پڑھتی تھیں۔ وہ تو پھر وہاں تھیں ہی، انہیں بھی دیکھتے تھے۔ جب میں بڑے شہر سے بڑی تعلیم حاصل کر چکا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں لوٹ کے گھر آیا تو گھر میں بڑی عزّت افزائی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ شہر میں پڑھنے سے لڑکا بہت ذہین ہو جاتا ہے۔ (اشفاق احمد یہ جملہ طنزیہ طور پر مُسکراتے ہوئے بولتے ہیں)۔

اب شام کے وقت میں سیر کرتا ہوا اپنے تایا قاسم علی کے پاس درخت کے نیچے گیا اور پتھر کی سل پر بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے تائے سے کہا کہ "تایا سُن میں تمہیں ایک بڑی کام کی بات بتاتا ہوں۔" وہ بڑے تجسس سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ کو مکھی ہوتی

ہے اور جسے معمولی اور بہت حقیر خیال کیا جاتا ہے یہ دیکھنے اور بینائی کے معاملے میں تمام کیڑوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے کیونکہ اس کی آنکھ میں تین ہزار محدّب شیشے یا لینز لگے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ ہر زاویے سے دیکھ سکتی ہے اور یہی وجہ ہوتی ہے کہ جب بھی اور جس طریقے سے بھی اس پر حملہ آور ہوں یہ اُڑ جاتی ہے اور اللہ نے اسے یہ بہت بڑی اور نمایاں خصوصیت دی ہے۔ اب میں سمجھ رہا تھا کہ اس بات کا تانے پر بہت رُعب پڑے گا کیونکہ میرے خیال میں یہ بڑے کمال کی بات تھی۔

لیکن تایا کہنے لگا "لکھ دی لعنت ایسی مکھی تے جندیاں تین ہزار اکھاں ہون اور جدوں وی بہندی اے گندگی تے ای بہندی اے۔"

(ایسی مکھی پر لعنت ہو جس کی تین ہزار آنکھیں ہوں اور وہ جب بھی بیٹھے گندگی پر ہی بیٹھے یا اس کو ترجیح دے)

خواتین و حضرات! یہ بات ہے دانش کی۔ ایسی باتیں علم و تعلیم کے زمرے میں نہیں آتی ہیں۔ میں بات کر رہا تھا معافی کی، Tolerance کی۔ ہم بڑی ساری کوشش کے باوصف اور بہت ساری تعلیم حاصل کرنے کے باوجود جب اپنے

رویّے کی طرف لوٹتے ہیں تو اپنی تحریر میں، تقریر میں اور اپنی پیش قدمی میں Tolerance کی پالنا نہیں کرتے۔ اس کی عزّت نہیں کرتے۔ یہ عام طور پر ہم سے کوتاہی ہو جاتی ہے۔ ہم آئے روز اخبارات میں ایڈیٹوریل پڑھتے ہیں۔ کام دیکھتے ہیں۔ اس میں جو چیز آپ کو ناپسند ہوتی ہے اس کے خلاف بڑی شدّت سے ردِّ عمل ظاہر کرتے ہیں اور یہ بات ہماری زندگی میں بہت بُری طرح سے عود کر آتی ہے اور ہم اور ہمارے Tolerance کے مابین یہ بات نہایت شدّت کے ساتھ حائل ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کیونکہ آپ بھی تائے اور اُستاد ہیں کہ بچّوں کو ان کی اچھی کارکردگی کے صلے میں کچھ انعام واکرام یا گفٹ، میڈل یا سرٹیفکیٹ دینا چاہیے یا نہیں۔

ایک خاتون: میرے خیال میں تو دینا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ اچھا کام کرتا ہے تو اس کی ستائش، تعریف چاہتا ہے اور آپ فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔

ایک صاحب گویا ہوتے ہیں: خان صاحب! اگر ہم اس بچّے کو اچھی کارکردگی کے صلے میں کچھ دیں گے تو وہ بھی اگلی نسل کو کچھ عطا کرے گا۔

ایک اور صاحب: اس طرح سے مقابلے اور کارکردگی بہتر بنانے کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ چھوٹی سی بات پر کسی بچّے کو شاباش کہہ دیناہا تھپکی دے دینایااس کی طرف مُسکرا کر دیکھ لینا بھی ایک بہت بڑاانعام ہوتا ہے۔

اصغر ندیم سیّد؛ کسی کو شاباش دینااچھی بات ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ضرور دیکھنا چاہیے کہ جو اس شاباش یا تھپکی سے محروم رہاہے اس کی بنیادیں کیا ہیں۔ اس کی وجوہات کیاہیں؟

اور اس محرومی میں ہمارے نظام کی کونسی کمزوریاں ہیں اور اسّی فیصد کیوں ناکام ہوگئے؟

ایک اور صاحب گویا ہوتے ہیں: لیکن ایک بچّہ جو ایک لیمپ کے نیچے بیٹھ کر پڑھتاہے اور دن رات محنت کرتا ہے۔ میں سمجھتاہوں کہ اس کی اس قدر محنت اور مشقت کا اگر Physically Award بھی ہو جائے تو شاید اس سے اور بھی فائدہ ہو اور کم نمبر لینے والے بچّے کو بھی مزید محنت کرنے کا حوصلہ ملے۔

اس پروگرام میں شریک ایک محترمہ: آپ اس میں حد بندی نہیں کر سکتے کہ ایک اچھا پھر اور درمیانہ پھر اور کم تر بچّہ کون ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ

پڑھنے والا بچّہ کسی وجہ سے ناکام ہو گیا ہو۔

ایک اور صاحب گویا ہوتے ہیں: اگر ایک بچّہ ستّر فیصد نمبر حاصل کرتا ہے تو اسے انعام ملتا ہے اور اس میں مزید محنت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اب وہ کوشش کرے گا کہ وہ اسّی فیصد نمبر حاصل کرے۔

اشفاق احمد: (مُسکراتے ہوئے) اصغر ندیم سید کی سوچ کا انداز وہ ایک برطانوی ماہرِ نفسیات سے ملتا ہے۔ وہ ہماری نفسیات سے ملتا نہیں ہے۔ مغربی ماہرینِ نفسیات یا ماہرین کہتے ہیں کہ بچّوں کو انعام دینا اور ان کی کارکردگی کو ستائش کرنے سے بچّے آگے چل کر چالاکی کی طرف توجّہ دینا شروع کر دیتے ہیں۔ پڑھائی کی طرف اتنی توجّہ نہیں دیتے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ آئندہ انعام حاصل کرنے کے لیے باوجود اس کے کہ ہم نے محنت سے ہی انعام حاصل کیا ہے اب ہم کس طرح سے دوبارہ انعام حاصل کریں۔ اس طرح اُن میں بوٹی مافیا کا ہلکا سا رنگ پیدا ہونے لگتا ہے کہ کس طرح سے حصول زیادہ ہو۔

اصغر ندیم سید: ایک دوسری بات یہ ہے کہ بزرگوں کا ایک اور خیال اور نظریہ ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اگر "ایہدی تعریف زیادہ کیتی تے ایہہ چوڑ ہو جائے

گا۔"

(اگر اس کی تعریف زیادہ کر دی تو یہ خراب ہو جائے گا۔)

محفل میں شریک خاتون: میرا موٴقف ذرا مختلف ہے کیونکہ اللہ میاں کا بھی حکم ہے کہ جو اچھے کام کرے گا اس کو جنّت ملے گی اور جو خراب کام کرے گا اسے دوزخ۔ یہ تو قدرت کا فیصلہ ہے۔

ایک صاحب اشفاق احمد سے سوال کرتے ہیں: کیا آپ کی شخصیت میں آپ کے والدین کا بھی عمل دخل ہے؟ یا آپ کی گفتگو آپ کی ذاتی سوچ اور تدبّر کا نتیجہ ہے؟

اشفاق احمد: یقیناً ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے جو والدین تھے وہ تربیت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ وہ علم کے معاملے میں بے چارے اس قدر ارفع نہیں ہوتے تھے۔ اب میری یہ بات پھر لوٹ کر

آپ کے کورٹ میں چلی جائے گی کہ آپ کو بے شمار اَن پڑھ اور کم علم لوگ ایسے ملیں گے جو کہ بے ایمانی نہیں کرتے ہوں گے۔ یہ بھی تربیت کا ہی اثر ہوتا ہے اور آپ کو بے شمار سیکرٹیری لیول کے اور وفاقی حکومت کے اعلیٰ افسر ایسے

ملیں گے جو سی ایس ایس کر کے بہت ساری لوٹ مار کر رہے ہوں گے۔

اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

پچاس برس پہلے کی دُعا

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ اس موسم میں جو کہ چھٹیوں کا موسم ہے اور کچھ لوگ یہاں سے باہر جاتے ہیں اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ کچھ وہاں کے لوگ یہاں بھی آتے ہیں۔

پرسوں مجھے کینیڈا سے آ کر ہمارے ہاں چھٹی گزارنے والے دو صاحب ملے۔ ان میں ایک پاکستانی بھی تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی جو بڑی اچھی تھی۔ ملاقات کے بعد جب انہوں نے مجھے اپنے وزٹنگ کارڈز دیئے تو ایک صاحب کے کارڈ پر کوئی سات کے قریب ڈگریاں درج تھیں اور دوسرے کے پانچ کے قریب تھیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان ڈگریوں کا مجھ پر بڑا رُعب پڑا کیونکہ میں نے اتنی ساری ڈگریاں پہلے کسی کارڈ پر چھپی ہوئی دیکھی ہی نہیں تھیں۔ میں ان کے کارڈز دیکھ کر بڑا مرعوب ہوا۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ڈگریوں کا اوز وزٹنگ کارڈ پر دی ہوئی تفصیل کا انسان کی ذات سے ضروری

نہیں کہ بڑا گہرا تعلق ہو۔ اس کا اندر اور وجود اس سے مختلف بھی ہو سکتا ہے جو ہم کارڈ پر درج کوالیفیکیشن دیکھ کر اس بارے اندازہ یا رائے قائم کر لیتے ہیں۔ یہ انسان کی شخصیت اور اس کے اندر کے مطابق بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے کم تر بھی ہو سکتا ہے۔

خواتین و حضرات! بہت سے لوگ جو بہت ساری قابلیتیں اور Qualifications لے کر ہمیں زندگی میں ملتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کا ہم پر بڑا رُعب اور دبدبہ ہوتا ہے اور عام آدمی پر اس کا بہت اثر پڑتا ہے اور ہم اس بارے توقع اور آرزو رکھتے ہیں کہ یہ ہم سے بہتر آدمی ہے اور ہم بعض اوقات یہ توقع لے کر دفتروں میں بھی چلے جاتے ہیں اور بیوروکریسی سے بھی یہی توقع وابستہ کرتے ہیں کہ یہ ڈگریوں اور تعلیم میں بھی ہم سے آگے ہیں اور انہوں نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا ہے جو بڑا ہی مشکل امتحان ہوتا ہے اور پھر اس سخت امتحان کو پاس کر چکنے کے بعد انہوں نے ایک خاص ٹریننگ حاصل کی ہے جس کے بعد انہیں اس مقام پر بٹھایا گیا ہے اور اس سب کے بعد یہ لوگ ہمارے دل کی دھڑکنوں سے زیادہ واقف ہوں گے اور ہمارے دکھ درد کا مداوا بہتر طور پر کر سکیں گے۔ لیکن جب ہم ان کے ذرا قریب جاتے ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ

سب کے سب اپنی ان ڈگریوں، ٹریننگ اور کوالیفیکیشن پر پورا اُتریں جو وہ حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔

اس ساری صُورتِ حال سے یوں بھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسانی زندگی میں یہ صُورتِ حال چلتی رہتی ہے اور آپ یہ طے نہیں کر سکتے کہ کیا میں ظاہر کو اتنی اہمیت دوں کہ وہ باطن پر بھی حاوی ہو سکے۔

یہ ذرا سی مشکل اور پیچیدہ بات ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آگے چل کر یہ بخوبی سمجھ میں آ جائے گی۔ ایک مرتبہ ہم چولستان میں شوٹنگ کر رہے تھے۔ وہاں ایک فلم بنائی جا رہی تھی اور جو ہمارے ڈائریکٹر تھے ان کا نام "توتی" تھا اور وہ اٹلی سے آئے ہوئے تھے۔ ہم وہاں ڈی جی کے قلعے سے بڑی طویل شوٹنگ کر کے پہنچے تھے۔ ہمارے ڈائریکٹر کو ایک چھوٹے سے لیکن ایک مضبوط کردار کے لیے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو شخص لمبا تڑنگا خوفناک ہو۔ اس کی عقاب جیسی آنکھیں ہوں اور وہ بڑا کرخت سا نظر آئے اور عام انسانوں سے بہت حد تک مختلف نظر آتا ہو۔ڈائریکٹر صاحب مجھے کہنے لگے کہ "آپ ہی کچھ کرو۔"

انہیں کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جس کی شباہت شکل و صورت اور مزاج

راسپوٹین سے ملتا جلتا ہو۔

میں نے کہا کہ جی ایسا شخص کوئی مل تو سکتا ہے لیکن وہ پڑھا لکھا نہیں ہو گا کیونکہ اس علاقے میں کسی ایسے کردار اور وہ ہو بھی پڑھا لکھا، ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔

وہ کہنے لگے کہ خیر ہے ہم خود ہی اسے تھوڑی سی ٹریننگ دے دیں گے کیونکہ مختصر سا کردار ہے۔

اب خدا کا کرنا یہ ہوا کہ مجھے ایک ایسا آدمی شام کو ہی نظر آ گیا جو بالکل ایسی ہی شکل و صورت کا مالک نظر آتا تھا، جس کی ہمارے ڈائریکٹر صاحب کو تلاش تھی۔ ویسا یہ لمبا تڑنگا اور سخت مزاج، اس نے زلفیں لمبی اور کھلی چھوڑی ہوئی تھیں۔ اس کی گھنی داڑھی تیل سے چپکی ہوئی تھی۔ کمر کے ساتھ اس نے ایک سنگل (زنجیر) لپیٹی ہوئی تھی۔ اس نے پاؤں میں ایسے بڑے بڑے گھنگرو ڈالے ہوئے تھے جو گھوڑوں یا جانوروں کو ڈالے جاتے ہیں۔ مجھے وہ بڑا پسند آیا اور میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگایا کہ یہ ہمارے کام کا بندہ ہے۔

میں نے اسے روک کر پوچھا کہ ”بھئی تمہارا کیا نام ہے؟“

اس نے جواب دیا کہ ”فقیروں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔“

میں نے کہا ”فقیر صاحب! آپ ہی بتائیں کہ کیا آپ فلم میں کام کرنا پسند کریں گے؟“

اس نے کہا کہ ”ٹھیک ہے کریں گے کیوں نہیں کریں گے۔“

میں نے کہا کہ ”اس میں ڈائیلاگ بھی بولنے پڑتے ہیں۔“

کہنے لگا ”وہ بھی بول لیں گے۔“

میں نے کہا ”کیا تمہیں ڈائیلاگ بولنے آتے ہیں؟“

وہ کہنے لگا کہ ”فقیروں کو آتا ہی ڈائیلاگ بولنا ہے۔ اس کے علاوہ فقیروں کو اور کوئی کام کرنا آتا ہی نہیں ہے۔“

میں بڑا خوش ہوا اور اپنے ڈائریکٹر ”توقی“ کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ فوراً گاڑی نکالیں اور اسے ملنے چلتے ہیں۔

وہ بھی دیکھ کر خوش ہوئے اور کہے لگا کہ یہ تو میری Requirement کے مطابق بنا بنایا شخص اور کردار ہے۔ ڈائریکٹر صاحب کہنے لگے کہ ”تم نے یہ کیسے ڈھونڈ لیا اور اس سے وقت طے کر لو اور اسے دس ہزار دے دو۔“

میں نے کہا کہ "جناب اتنی بڑی رقم!(کیونکہ اتنے تو مجھے بھی نہیں ملنے تھے۔ میں وہاں ان کا مترجم تھا) لیکن وہ کہنے لگے کہ اسے دے دو۔"

اس سے وقت طے ہو گیا اور دو دن کے بعد اس کی شوٹنگ کا وقت رکھا۔

دو دن کے بعد کی صبح کو ہم سب نے کیمرے وغیرہ تیار کیے، لوکیشن کا جائزہ لیا اور سارے انتظامات مکمل کر کے تیار ہو کر بیٹھ گئے اور اس کا انتظار کرنے لگے۔ صحرا میں ہم بیٹھے تھے اور کرسیاں ورسیاں لگی ہوئی تھیں اور ہم اس درویش کا انتظار کر رہے تھے۔ جرمنی سے آئی ہوئی اس فلم کی ہیروئن بھی تھی اور فلموں میں ایک درخت سے جھول کر دوسرے درخت کے تنے تک جانا تھا اور وہ ہالی وُڈ کی فلموں میں ٹارزن کا کردار ادا کرنے والا "لیکس بار" بھی موجود تھا، تو وہاں پر ایک صاحب آ گئے۔ وہ بڑے خوش شکل تھے۔ بال اچھی طرح سے تراشے ہوئے تھے ان کے اور خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ وہاں پر آ کر کھڑے ہو گئے۔

ہم نے خیال کیا کہ یہ بھی کوئی ویسا ہی شخص ہو گا جس طرح عام طور پر لوگ شوٹنگ دیکھنے آ جاتے ہیں۔ اب وہ شخص میری طرف غور سے دیکھنے لگا اور وہ

معنی خیز انداز میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا" جی فرمائیں کیا بات ہے ؟"

تو وہ کہنے لگا کہ جی میں فلاں فقیر ہوں اور شوٹنگ پر آیا ہوں۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ "تمہارے بال کہاں گئے ؟"

کہنے لگا کہ جی شوٹنگ پر آنے کے لیے تو اچھے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے میں صاف سُتھرے کپڑے پہن کر بال کٹوا کر شیو کروا کر آیا ہوں۔ وہ اعلیٰ درجے کی کریم لگوا کر اور بن ٹھن کر ہمارے سامنے کھڑا تھا اور ہمارے ڈائریکٹر زور سے سر پیٹنے لگے اور کہنے لگے اوہ ظالم یہ تو نے کیا کر دیا۔

(وہ پریشانی کے عالم میں زور سے سر پیٹتے تھے اور اپنی زبان میں عجیب و غریب بولتے تھے)

مجھے کہنے لگے کہ "اس کو کیا ہوا ؟"

میں نے کہا کہ "جی اس نے اپنی کوالیفیکیشن اندر سے نکال کر اپنے اوپر وارد کر دی ہے اور اب یہ سمجھتا ہے کہ میں اچھا بن گیا ہوں اور اس کا خیال ہے کہ میں اچھا اور خوبصورت لگوں گا تو ہی مجھے فلم میں رول ملے گا ویسے تو نہیں ملے گا۔"

ڈائریکٹر صاحب اسے کہنے لگے کہ "تو میری نگاہ کے سامنے کھڑا نہ ہو، تو نایاب آدمی تھا اور اب اپنی نایابی ختم کر ڈالی ہے تو نے!"

خواتین و حضرات! پھر میں نے سوچا کہ ایک Requirement ہوتی ہے جسے آپ کو پورا کرنا ہوتا ہے اور آپ نے اپنے ذہن اور سوچ اور مزاج کے اندر اس مطلوبہ چیز کا یا Requirement کا کچھ اور ہی ترجمہ کیا ہوا ہوتا ہے اور جب ہم زندگی میں اپنی ذات سے ہٹ کر اپنی پروگرامنگ کچھ اور کر دیتے ہیں تو پھر بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر آپ میں اور جو بھی اس دنیا میں رہنے والے ہیں وہ نہیں رہتے جس کا تقاضا کیا گیا ہے۔

ہمارے بابے اور فلسفی بھی یہی کہتے ہیں کہ جو ہماری ذات ہے اس کے اندر رہیں، اپنے حال کے اندر رہیں اور جس بات کا آپ نے وعدہ کیا ہے اسی چوکھٹے کے اور فریم کے اندر رہیں۔

ایک مرتبہ ڈیرے پر باباجی نے کہا کہ "مجلس ورد کرتے ہیں اور اس طرح وہاں کھجوروں کی گٹھلیوں پر ورد کیا گیا اور انہیں پڑھا گیا۔"

وہ زیادہ ورد "یا ودود یا لطیف" کا کیا کرتے تھے۔ ورد کی مجلس کے بعد ہم دُعا مانگنے

لگے۔ ہم جتنے بھی لوگ اس ورد میں شامل تھے ہم نے بغاوت کر دی حالانکہ بابوں کے آگے بغاوت چلتی نہیں ہے اور ایسا ہوتا نہیں ہے اور ان کے آگے اونچا بولتے بھی نہیں ہیں۔ ہم نے باباجی سے کہا کہ آپ نے ایسے ورد کی محفل کیوں کروائی کہ جس کے خاتمے پر جب دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے گئے تو آپ نے کہا کہ "اے اللہ یہ ورد جو ہم نے اپنے پڑوسی ملک انڈیا کے لیے کیا ہے اس کو تقویت عطا فرما کہ وہ اپنے کیے ہوئے وعدوں پر قائم رہے کیونکہ دنیا میں سب سے مشکل مقام اور کام یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کیے ہوئے وعدے اور عہد سے پھسل جائے۔"

ہم نے باباجی سے کہا کہ "یہ معاملات جو پاکستان پر ہمارے بھارت سے طے ہوئے ہیں یہ تو لکھے ہوئے ہیں اور دستاویزی شکل میں ہیں۔ ان پر دونوں فریقین کے باقاعدہ دستخط ہوئے ہیں۔ اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس مسوّدے پر دستخط کر دیئے ہیں جس پر لکھا ہوا ہے کہ کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کے لیے وہاں پر ریفرینڈم کروایا جائے گا اور یہ بات باقاعدہ سلامتی کونسل کی موجودگی میں طے ہوئی ہے اور آپ نے خواہ مخواہ دُعا کیوں کروا دی۔"

اس پر باباجی کہنے لگے کہ "بیٹا ہم ابھی تک اپنے کشمیری بھائیوں سے جدا ہیں اور ہماری محبّت و شفقت ان کے لیے ہے اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں انڈیا اپنے وعدوں سے مُکر نہ جائے (باباجی اپنے Vision کے مطابق کہہ رہے تھے) اور یہ لوگ جو وعدوں کے پوری طور پر قائل نہیں ہیں اس لیے ڈر ہے کہ یہ پھسل نہ جائیں اور یہ کسی مقام پر پہنچ کر یہ نہ کہیں کہ ہم نے تو یہ وعدہ نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "جی جب تحریر میں موجود ہیں، اس پر ساری دنیا کے دستخط ہیں اور ساری دنیا جانتی ہے تو پھر مُکرنے والی کیا بات ہے۔"

باباجی کہنے لگے کہ "کاغذ پر دی ہوئی چیز اور لکھی ہوئی چیز اور کاغذ پر کیا ہوا دعویٰ انسان کا دعویٰ نہیں ہوتا۔ وہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ اس سے پھسلا بھی جا سکتا ہے۔ جب تک انسان اس دعوے یا وعدے پر اندر سے قائل نہیں ہو گا تب تک کاغذ پر کیے ہوئے وعدے ہیں تو ٹھیک، تاریخی اعتبار سے لیکن ان سے پھسل جانے کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔ ماضی کی زندگی میں جتنے بھی جھگڑے انسانوں میں ہوتے رہے ہیں، وہ سارے، سارے کے سارے اس وجہ سے ہوئے کہ انہوں نے عہد سے روگردانی کی اور وہ عہد سے پھر گئے۔"

خواتین و حضرات ! یہ ڈگری اور سند جو ہوتی ہے وہ ساری کی ساری شخصیت کی ترجمان نہیں ہوتی ہے۔ شخصیت الگ چیز ہے اور ڈگری اس سے الگ چیز ہے۔ آج اس بات کو پچاس سے زیادہ سال ہو گئے اور بھارت نے اپنے وعدوں سے انکار ہی کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دستخط تو کیے تھے اور وعدہ بھی کیا تھا لیکن اب ہمارا ان پر عمل کرنے کو دل نہیں کرتا۔ انسان کبھی بھی بے راہ رو ہو سکتا ہے۔

ہمارے بابا جی اس وقت وہ اندیشہ ظاہر کر رہے تھے جس پر ہمیں اب تشویش ہوتی ہے اور وہ پچاس سال سے زائد اس کا وعدے کا قصّہ ہمیں آج بھی نیا لگ رہا ہے۔ جب کہ بھارت کسی طور پر اپنے وعدے پر عمل کرنے کی طرف آ ہی نہیں رہا ہے اور وہ ڈھٹائی سے کشمیر کو اپنا حصّہ قرار دیتا ہے اور خواتین و حضرات ! یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے ہی گھر کو آگ لگا دے جبکہ وہاں روز ایک نئی خون آشام شام اُترتی ہے اور کتنے ہی گھر جلا دیئے جاتے ہیں۔ اگر جسم کے ایک حصّے کو تکلیف پہنچے تو کیا پورے جسم کو اذیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بھارت دعویٰ کرتا ہے کہ کشمیر اس کا حصّہ ہے لیکن اس نے اپنے اس حصّے کو لاکھوں فوجیوں توپوں ٹینکوں کی طاقت سے جکڑا ہوا ہے اور قیدی بنایا ہوا ہے۔

یہ بات نہیں ہے کہ وہ کشمیر اور ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا نہیں ہوا ہے۔

ضرور ہوتا ہے، روز اس کے ضمیر کی عدالت اسے سرزنش کرتی ہو گی لیکن وہ ایسی عادی مجرم بن چکا ہے جو ضمیر کو سلا دینے اور دبا دینے میں ہی فخر محسوس کرتا ہے۔ آج پھر وہی دُعا کریں جو باباجی نے پچاس برس قبل کی تھی۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

فرنٹ سیٹ

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں بہت بہت سلام پہنچے۔ اس سے پہلے ہم اس حوالے سے بات کرتے رہے ہیں اور Macrocosm (عالمِ اکبر) اور Microcosm (عالمِ اصغر) بارے ایک طویل بحث پہلے ہی چلتی رہتی ہے اور اب بھی زور و شور سے چل رہی ہے اور مغرب والے بھی اس تحقیق میں مصروف رہے ہیں لیکن یہ سب ایک الگ بحث ہے۔ جب میں سٹوڈیو آ رہا تھا تو اس وقت میرے سامنے والی گاڑی جو ذرا زیادہ رفتار سے جا رہی تھی اس نے ایک سائیکل والے کو ٹکر مار دی۔ چیں چاں کر کے ٹریفک رکی اور لوگوں کا مجمع سا لگ گیا۔ کوئی کہہ رہا تھا دوڑ کر پانی لاؤ۔ کوئی رکشہ والے کی بات کر رہا تھا کہ اسے فوراً ہسپتال لے چلو لیکن وہ بوڑھا شخص جان ہار گیا تھا۔ میں وہاں یہ سوچنے لگا کہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ گاڑی ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصّے سے ذرا پہلے گزر جاتی یا بعد میں آتی تو شاید وہ بوڑھا شخص جس کی سائیکل پر کوئی ترکاری وغیرہ لدی ہوئی تھی جان سے نہ جاتا لیکن خواتین و حضرات! اس کا وقت طے تھا۔ اس گاڑی نے

اپنے مقررہ وقت پر وہاں آنا تھا اور اسے Hit کرتا تھا۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات رونما ہوتے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ کاش ایسا نہ ہوتا، کاش وہ اس طرح سے کر لیتا۔ ہمارے گھروں میں عام طور پر عورتیں کہا کرتی ہیں کہ ”میں کہتی تھی لڑکی کا رشتہ وہاں نہ کرنا یہ تو ہونا ہی تھا۔“

لیکن شاید ان سب باتوں میں قدرت کا، قسمت کا بھی کوئی عمل دخل ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں میں اسلام آباد جا رہا تھا۔ میں نے ایک ٹرک پر لکھا پڑھا کہ ”وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ نہیں ملتا۔“ میرے نزدیک وہ ٹرک پر لکھی بات بہت بڑی تھی۔ حضرت امام غزالی کا قول ہے شاید۔

انسان بہت جدوجہد کرتا ہے۔ لمبی زندگی گزارنے کے منصوبہ تشکیل دیتا ہے لیکن پھر مسجد میں اعلان ہوتا ہے کہ فلاں ولد فلاں قضائے الٰہی سے انتقال کر گیا ہے اور اس کا جنازہ فلاں وقت اٹھایا گا۔ قسمت اور قدرت کے کھیل ہیں جو ازل سے جاری ہیں۔ وقت بھی انسان کی قید میں نہیں رہا۔ انسان انہونی باتوں پر کنٹرول کے لیے بڑے جتن کرتا ہے لیکن وہ کام ہو کر رہتے ہیں۔ جہاز، ٹرین ، گاڑیاں اپنے وقت نکلتی ہیں، جن لوگوں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ گھروں میں اپنے پیاروں کے پاس جاتے ہیں اور جن کی قسمت میں نہیں لکھا ہوتا وہ

اچانک کسی انہونی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ایک کولیگ ہوتے تھے۔ سر پر انگریزوں والا ہیٹ پہنتے اور لمبا کور ان کا من پسند لباس تھا۔ ہم سے سینئر تھے۔ شیو بڑھی رکھتے اور ذرا بڑبڑاتے بھی رہتے تھے۔ جیسا کہ ہوتا ہے بڑی عمر کے لوگوں میں وہ جب بھی کسی بس یا گاڑی پر سفر کرتے ہمیشہ درمیان والی سیٹ پر بیٹھتے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ ایسا کر کے زیادہ Comfortable یا آسانی Feel کرتے ہیں۔

ایک دن ہم سب کہیں جانے لگے تو ہم نے ان سے کہا کہ آپ سینئر بھی ہیں اس لیے آپ اگلی نشست پر بیٹھ جائیں تو بغیر کچھ کہے نہایت ڈر کے انداز میں جلدی سے پچھلی سیٹ پر دبک کر بیٹھ گئے۔ اب ہم سب بڑے حیران ہوئے کہ انہیں کیا ہو گیا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ ”سر اگر آپ اگلی نشست پر بیٹھتے تو اس سے ہمیں خوشی ملتی اور آپ کے وقار میں اضافہ ہوتا۔“

اس پر وہ صاحب بڑا غصّہ کھا گئے اور ہمیں گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے ہم نے انہیں کبھی غصّے میں نہیں دیکھا تھا۔

ہمیں بڑی تشویش ہوئی کہ نجانے ہم سے کیا ایسی غلطی سرزد ہو گئی ہے کہ وہ اس

قدر Cool شخص گرمی کھا گیا ہے۔

ہم نے ان سے کہا کہ ”اگر آپ اپنے اس غصّے کی وجہ بتادیں تو ہم اس کے ازالے کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گے۔“

وہ صاحب کہنے لگے کہ ”تم لوگ مجھے آگے بٹھا کر مارنا چاہتے ہو۔“

ہم نے کہا کہ ”جناب وہ کیسے ؟“ (اب ہمیں بھی ذرا غصّہ آگیا کہ ہم نے تو کوئی ایسی ویسی بات کی ہی نہیں)

وہ کہنے لگے کہ میرے خاندان میں کئی ایسے لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں جو اس وقت مرے جس وقت وہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوتے تھے۔ سامنے سے ٹکر لگی اور وہ سب سے پہلے مارے گئے۔

انہوں نے ہمیں یہ بتا کر بھی حیران کر دیا کہ وہ فرنٹ سیٹ کی بجائے پچھلی سیٹ پر بھی نہیں بیٹھتے تا کہ پیچھے سے لگنے والی ٹکر کے بعد بھی وہ بچے رہیں۔ ہمیں ان کی بات سُن کر جہاں سخت حیرانی ہوئی وہاں اندر اندر سے ہنسے بھی لیکن ان ہنسی افشا نہیں ہونے دی تا کہ وہ کہیں مزید ہی نہ بگڑ جائیں۔

خواتین و حضرات! اب آپ کو یہ جان کر سخت حیرانی ہو گی کہ وہ صاحب بھی ٹریفک حادثے میں ہی خالقِ حقیقی سے جا ملے لیکن جب وہ حادثے کا شکار ہوئے وہ ایک بس کی درمیانی سیٹ پر بیٹھے تھے اور حادثہ جی ٹی روڈ پر ہوا۔ جس بس میں وہ صاحب سوار تھے اس کی سامنے سے آنے والے ٹرک کی ٹکر ہونے لگی تو ان کی بس والے ڈرائیور نے شاید اپنی سائیڈ بچانے کے لیے کٹ کیا ہو گا اور ٹرک اس بس کے بالکل عین وسط سے جا ٹکرایا جہاں وہ صاحب موت سے بچنے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے اور سب سے حیرانی اور تعجّب کی بات یہ ہے کہ اس ایکسیڈنٹ میں صرف وہ صاحب ہی دنیا فانی سے گئے جبکہ باقی تمام سواریاں بالکل سلامت رہیں۔

ایسے واقعات میں انسانی ذہن بہت حد تک بے بس واقع ہوا ہے حالانکہ اس نے چاند پر قدم رکھنے کا دعویٰ کیا ہے بلکہ وہ رکھ بھی چکا ہے۔ خونخوار جانوروں کو اس نے رام کر لیا ہے اور آواز سے بھی تیز جہاز بنا لیے ہیں۔ انسانوں کی ہلاکت کا وسیع پیمانے پر سامان اکٹھا کر لیا ہے۔ بڑے ایٹم بم تیار کر لیے ہیں اور ملکوں کی لڑائی کی یہ پہچان بن چکی ہے کہ جی وہ ایک سیکنڈ میں اتنے لاکھ یا اتنے ہزار انسانوں کو موت کے مُنہ میں دھکیل سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا روس جو پہلے

سوویت یونین تھا، اس قدر اسلحہ اکٹھا کر لیا تھا کہ اس کے پاس انبار لگ گئے تھے اور وہ سپر طاقت تھا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہاں بھوک اور غریبی نے ڈیرے ڈال دیئے اور اس نے وہ ہتھیار بیچ بیچ کر روٹی خریدنی شروع کر دی۔

ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ کسی بھی چیز کی بہتات قوموں یا معاشرے کے لیے بڑی نقصان دہ ہوتی ہے اور جب قومیں کسی ایک چیز کے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ وہ اس وقت گھاٹے کا سودا کر رہی ہوتی ہیں۔ زیادتی کسی بھی چیز کی خرابی کا نقصان بنتی ہے اور عبادت کے معاملے میں بھی یہی حکم ہے کہ اتنی کرو جس قدر روز یا معمول کے مطابق کر سکتے ہو۔ اپنی جانوں کو مصیبت میں ہی نہ ڈال لو۔ مجھے اپنے اس کولیگ کے فرنٹ سیٹ کے خوف سے یاد آیا کہ ہمارے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کو واقعی وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ شوق کچھ طبقوں میں بہت زیادہ ہے۔

ہمیں بوریوالہ کے قریب ایک گاؤں میں کسی شخص سے کام تھا۔ ہم ان کے پاس گئے اور کہا

کہ جناب اگر آپ مہربانی کریں تو ہمارے ساتھ چلیں آپ کی بڑی نوازش ہو گی۔ ہمارے پاس جو گاڑی تھی اسے میرا ایک دوست چلا رہا تھا اور میں فرنٹ سیٹ پر

بیٹھا تھا۔ اب ہمیں تو احساس ہی نہیں تھا کہ فرنٹ سیٹ کا معاملہ اس قدر بھی پیچیدہ اور سنگین ہو سکتا ہے۔ جب ہم نے انہیں ساتھ چلنے کے لیے کہا تو وہ کہنے لگے کہ "ہاں ہاں کیوں نہیں، تسیں چلو میں تہاڈے پچھے پچھے لگا آؤنا۔"

(ہاں ہاں کیوں نہیں، آپ چلیں میں آپ کے پیچھے پیچھے ہی آ رہا ہوں۔)

یہ سُن کر میں نے اپنے دوست سے کہا کہ چلو یار میرا وہ دوست اس شخص بارے آگہی رکھتا تھا۔ مجھے کہنے لگا یہ نہیں آئے گا۔ اسے فرنٹ سیٹ فوبیا ہے کہ آج تک کبھی کسی گاڑی یا موٹر سائیکل پر پیچھے نہیں بیٹھا۔ چاہے کوئی ایم پی اے یا ایم این اے (گاؤں میں اور ہمارے ہاں شہروں میں ایم پی اے ایم این اے کو علاقے کی بڑی شخصیت خیال کیا جاتا ہے نا اور اب جس طرح ناظم صاحب آئے ہیں) ہی کیوں نہ ہو تم اسے کہو کہ نہیں جناب ہم نے تو آپ کو اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔ آپ آیئے یہ چابی (گاڑی کی چابی) پکڑیں اور براہِ کرم ہمارے ساتھ چلیں۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ جناب یہ چابی لیں اور آیئے ہمارے ساتھ چلئے۔ آپ کی نوازش ہو گی۔

خواتین و حضرات! میرا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے چابی پکڑی اور ہمارے ساتھ چل

پڑے۔ یہ احساسِ تفاخر جہاں کسی حد تک ٹھیک ہے وہاں اس کی بڑی خرابی بھی ہے۔ اس سے گھمنڈ اور انا کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے جس کی ہمیں اجازت نہیں دی گئی ہے اور منع کیا گیا ہے۔ جو قومیں احساسِ تفاخر میں مبتلا ہو جاتی ہیں وہ بڑی کمزوریوں میں پڑ جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کسی انسان سے اس کا حسنِ احترام اور عزّتِ نفس ہی چھین لیں۔ یہ ہر انسان کا حق ہے۔ ہمیں اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم ایسے ہی جا کر بڑی عاجزی سے کسی کو دو چار تھپڑ جڑ دیں اور کہیں کہ بھئی ہم نے اس کا گھمنڈ ختم کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنا گھمنڈ ختم کرنے کے لیے اپنے ہی چہرے کو مار مار کر سُرخ کر لیں اور کہیں کہ ہم عاجزی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ایسے تو یہ نہیں ہوتا ہے۔ گھمنڈ اور وقار میں فرق ہوتا ہے۔ ہم کسی غریب یا ضرورت مند کو آسانی فراہم کریں اور بجائے کسی پر ظاہر کرنے کے دل ہی دل میں خوش ہوں کہ اے اللہ تیرا شکر ہے اس قابل ہوا کہ تیرے بندے کے کام آ سکا اور آپ مجھے اور نوازنا اور عزّت دینا کہ میں مزید اس کارِ خیر کو جاری رکھ سکوں اور مدد کر کے خوشی محسوس کرنا وقار ہے۔ اور اگر کسی کی مدد کر کے اسے بتائیں یا کسی کمزور یا غریب سے پورے ہاتھ کی بجائے صرف دو انگلیوں سے سلام لیں جیسا کہ بڑے لوگ عام طور پر کرتے ہیں۔ گاڑی کا شیشہ تھوڑا نیچے کیا، دو انگلیاں ملائیں اور شیشہ اُوپر چڑھا کر چلے گئے،

گھمنڈ ہے۔ یہ ناپسندیدہ چیز ہے۔ اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

خواتین و حضرات میں بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہوں۔ میں نے بھی کبھی کوشش نہیں کی کہ اپنے محلّے کے خاکروب کے کبھی گلے ملوں اس سے محبّت کی دو باتیں کروں۔ اس سے دکھ سکھ کی بات کروں۔ یا اپنے مالی کے پاس کیاری میں جا کر بیٹھ کر کہوں کہ "یار کام چھوڑ آ دو باتیں کرتے ہیں۔ آج کام نہیں کرنا۔ میں نے آپ کو وقت دینا ہے۔ کام پھر بھی ہوتا رہے گا۔"

میں ایسا نہیں کر سکا۔ مجھے یہ سعادت نصیب نہیں ہو سکی۔ میں بھی فرنٹ سیٹ کے چکر میں ہی رہا ہوں اور گھمنڈ کی چادر تان کر دوسروں سے بچتا بچاتا ہی رہا ہوں۔ مجھے وہ شخص یاد آ رہا ہے جو ایک بس سٹاپ پر کھڑا ہوا تھا اور اس کے سینے پر ایک بیج سا لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے لفٹ دے دی۔ وہ بڑا خوش ہوا اور کہنے لگا "صاحب آج کل کے دور میں آپ نے مجھے لفٹ کیسے دے دی۔ آج کل تو لوگ زخمی کو سڑک پر تڑپتا چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔" میں نے کہا کہ بس میں گزر رہا تھا ویسے میں اتنا اچھا آدمی نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ میں نے تمہیں اکیلے کھڑے دیکھا تو ساتھ بٹھا لیا۔ یہ آج سے کوئی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے اور وہ ۱۴ اگست کی شام تھی۔

وہ کہنے لگا کہ ”اس کے دفتر نے ۱۴ اگست کی جشنِ آزادی کے سلسلے میں ایک تقریب کا انعقاد کیا تھا تو جناب میں دفتر میں کلرک ہوں، سینئر کلرک، تو دفتروں والوں نے مجھے بھی یہ بیج دیا تھا۔“ (یہ اسے بیج کہہ رہا تھا جو مختلف تقاریب میں مہمانوں یا انتظامیہ کو خاص طور پر لگائے جاتے ہیں) وہ کہنے لگا کہ ”اس پر صاحب میرا نام بھی لکھا ہوا ہے۔“ وہ عجب سے احساسِ عزّت سے سرشار تھا اور وہ تقریب ختم ہو جانے کے بعد بھی اس نے اپنے سینے پر اسے ایسے سجا رکھا تھا جیسے اسے حکومت کی جانب سے کوئی ایوارڈ یا تمغہ مل گیا ہو۔ میں اس سینئر کلرک کی خوشی آج تک نہیں بھول پایا۔ وہ اور اس کی چمکتی آنکھیں اب بھی یاد ہیں۔

خواتین و حضرات! میں آج بھی محسوس کرتا ہوں کہ ہم اپنے لوگوں کو، اپنے مزدوروں کسانوں، مالیوں، ڈرائیوروں اور کلرکوں کو وہ عزّت و احساسِ توقیر نہیں دلا سکے ہیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا، جس کی انہیں ضرورت ہے۔ انہیں آج بھی پکی سڑکوں، کارخانوں اور بیروزگاری ختم کرنے کے زبانی یا عملی نعروں کی ضرورت اس قدر نہیں ہے جتنی انہیں توقیر اور اس فرنٹ سیٹ کی ضرورت ہے۔ جتنی اس شخص کو ضرورت تھی جس سے بوریوالہ میں ہمیں کام

تھا۔

قسمت پر یقین کے ساتھ ساتھ جس چیز پر ہمیں ایمان پکّا کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں کو عزّت عطا کریں۔ محبّت عطا کریں۔ ان کی تذلیل نہ کریں۔ اگر ہم یہ کام اپنے اپنے طور پر کریں تو پھر ہم اپنی ذات میں بابے ہیں، ہمیں کوئی بابا تلاش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اور ہم اس فرنٹ سیٹ کے حقدار ہیں اور اپنا سر اونچا کر کے وقار سے چل سکتے ہیں وگرنہ ہم گھمنڈ کے مارے ہوئے بھی ہوں گے جیسا کہ میں ہوں۔ آپ تو بہت اچھے ہیں لوگوں کو محبّت سے نوازتے ہوں گے۔ محبّت تقسیم کرتے ہوں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

اللہ میاں کی لالٹین

میں اتنا عرصہ آپ لوگوں سے جدا رہا لیکن اس طویل عرصے میں میری توجّہ ٹیلیویژن پر زیادہ رہی۔ میں ٹیلیویژن تو پہلے بھی دیکھتا تھا لیکن پچھلے کچھ مہینوں سے میں اسے کچھ زیادہ ہی دیکھنے لگا لیکن ٹی وی کے وہ پروگرام جن کا تعلّق اشتہاروں سے تھا جب بھی کوئی اشتہار لگتا تو میری پوتی پوتے مجھے کہنے لگے کہ دادا بھاگ کے آئیں وہ آپ کا اشتہار آ گیا، ہمارے ٹیلیویژن پر تقریباً اسّی فیصد اشتہار دھلائی کے واشنگ پاؤڈر اور کپڑوں سے متعلق چلتے ہیں۔ خیر شیمپو کے بھی کم نہیں ہیں اور وہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ایک بی بی آتی ہے اور کہتی ہے کہ میرے کپڑوں پر اتنا بڑا دھبّہ یا داغ لگ گیا، مجھے تو فلاں کی دعوت پر جانا تھا۔ اس پر دوسری بی بی یا اس کی سہیلی کہتی ہے کہ ”داغ لگا تو کوئی بات نہیں، کپڑے کو اس پاؤڈر ملے پانی میں غوط دو فوراً صاف ہو جائے گا۔“

وہ غوطہ دینے کے بعد دکھاتی ہے اور کہتی ہے کہ ”دیکھئے کس قدر صاف اور اُجلا

ہو گیا، میں نا کہتی تھی۔"

پھر یہ اشتہار بھی آتے رہے جن میں خاتون کہتی ہے کہ "پہلے میں بڑی محنت کرتی تھی، دھلتا نہیں تھا۔ میرا خاوند ایسی جگہ کام کرتا ہے جہاں کپڑے بہت زیادہ گندے ہو جاتے ہیں لیکن جب سے میں نے یہ واشنگ پاؤڈر استعمال کیا ہے، جھٹ جھٹ میں سارے داغ صاف ہو گئے۔"

خواتین و حضرات اس طرح کے اشتہار دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی۔

اس طرح ایک میرے دوست ہیں اور ان کی بڑی ہی پیاری بہو ہے۔ اس کا نام جویریہ ہے۔ انہوں نے حال ہی میں ایک کوٹھی بنائی ہے۔ یہ لڑکیوں کا شوق ہوتا ہے کہ جب گھر وغیرہ بن جاتا ہے تو وہ اسے Decorate کرنے یا اس کی تزئین و آرائش کی بابت سوچنے لگ جاتی ہیں۔ اب اس کے رہنے کا یا سونے کا کمرہ واقعی بہت خوبصورت اور غضب کا ہے اور اس کا ڈرائنگ روم اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری توجّہ Life کے مقابلے میں Living پر زیادہ ہے۔ ہم Living پر بہت زور دیتے ہیں۔

Life چاہے اس کے پیچھے لٹکتی آئے، یہ دیکھ کر بھی مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ

صفائی کی طرف، خوبصورتی ستھرائی اور حفظانِ صحت کی طرف ہماری بڑی توجّہ ہے۔ میں پھر پلٹ کر اپنا گھر دیکھتا ہوں جو پرانی وضع کا ہے لیکن کچھ ایسا بھی برا نہیں ہے۔

اس میں پرانی طرز کا فرنیچر ہے جو بڑا بھاری بھاری ہے اور Victorian طرز کا ہے۔ اب ہم جس جگہ بھی رہتے ہیں یہ ہماری دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جگہ بڑی صاف ہو۔ اچھی اور خوبصورت ہو لیکن چونکہ میں آپ سے Detergence کی بات کر رہا تھا تو میری یہ آرزو ہے اور یہ آرزو چند ماہ سے بڑی شدّت اختیار کر گئی ہے کہ جب بھی نماز پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور اللہ میاں کو اپنے گھر بلانے کا موقع ملتا ہے اور پھر جس جگہ میں اسے بلاتا ہوں اور جو میرے دل کا گوشہ ہے وہ نہایت تاریک، نمناک، بدبودار، سڑا ہوا ہے۔ اس میں ہر قسم کی گندگیاں اور کثافتیں بھری پڑی ہیں اور ہر قسم کی غلاظت وہاں موجود ہے۔ میں کسی ایسے Detergent کی تلاش میں ہوں جو کہ میرے دل کے اندر ویسی صفائی پیدا کر دے جیسی صفائی مجھے ان اشتہاروں میں نظر آتی ہے اور میں خوش ہوتا ہوں کہ ہم باہر کی یا بدنی صفائی کی طرف متوجّہ ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے دل نہایت پاک و صاف اور پاکیزہ خوشبودار اور وسعت

پذیر ہیں اور ان میں اللہ میاں کو آتے ہوئے واقعی کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ اللہ میاں بڑے رحیم و کریم ہیں۔ وہ جیسی کسی بھی جگہ ہو، کوئی بلائے تو وہاں تشریف لے آتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا لیکن ہم نے اور خاص طور پر میں نے اس بات کا نوٹس نہیں لیا اور کبھی اس بابت پروگرام نہیں بنایا کہ اس جگہ کی صفائی ستھرائی بارے سوچا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ ہم یا میں اس جگہ کو اس طرح تو صاف نہیں کر سکتے جیسے جویریہ بیٹی کا بیڈ روم یا ڈرائنگ روم ہے لیکن ایسی تو ہو جیسے میرے گھر کا کمرہ ہے۔ ہم نے کبھی ایسی کوشش کی ہی نہیں اور ہم ''گِدڑ پھوس'' (گھاس پھوں) ٹوٹے زینوں، بکھرے برتنوں، ٹوٹے اور پچکے ہوئے کنستروں، ادھڑی چارپائیوں، صندوقوں، نفرتوں، تکالیف، کدورت، گھمنڈ اور اناؤں سے بھرے گھر کو محبت، پیار، عاجزی کی چاشنی سے اور خوشبو سے مہکا دیں۔ ہم سے ایسا ہوتا نہیں ہے۔

ٹی وی پر صفائی کے اشتہارات دیکھ کر میرے دل پر بوجھ بڑھ جاتا ہے اور طبیعت پر طاری رہتا ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جب ہم فجر کی نماز پڑھ کر سیر کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں جھک کر اپنے جوتے پہننے پڑتے ہیں اور جب مسجد سے نکلنے سے پہلے جوتے پہن رہے ہوتے ہیں تو اللہ میاں بڑے کمرے سے

اُٹھ کر ہمارے پاس روز آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کہاں جارہے ہو؟ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ تو ہم میں سے ایک کہتا ہے کہ میں واپڈا دفتر جارہا ہوں آپ کو کیسے ساتھ لے جاؤں۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ جی میرا ٹیلیفون کا محکمہ ہے۔ میں آپ کو وہاں نہیں لے جا سکتا اور میرے جیسے ریٹائرڈ آدمی کہتے ہیں، آپ ہمارے گھر جا کر کیا کریں گے اور اس طرح ہم سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ اللہ میاں آپ یہیں رہیں ہم پھر کبھی آپ سے مل لیں گے اور ہم نے ظہر کے وقت آنا ہی ہے نا۔ تب آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔

آپ ایسا نہ کرنا کہ ہمارے گھروں میں ہمارے دفتروں میں آ جائیں کیونکہ ہمارا ”بھید“ آپ پر کھلنا نہیں چاہیے کہ ہم اپنے اپنے دفاتر میں کیا کرتے ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ کے ساتھ کے بغیر جتنے بھی کام ہوتے ہیں یا ہو رہے ہیں وہ بڑے ادھورے اور نامکمل رہتے ہیں۔

اللہ کو بالکل اپنے ساتھ ساتھ رکھنا اور اسے اپنی زندگی کا ایک حصّہ بنا کر رکھنا ہماری ذاتی اغراض کے لیے بھی ضروری ہے۔ بعض اوقات چھوٹے یا کم عمر زیادہ ہمّت، اعتماد اور Faith کے ساتھ کام کر جاتے ہیں جو کام بڑوں سے نہیں ہو

پاتا۔

بڑی دیر کی بات ہے ہم بہاولپور کے قریب ایک جگہ حاصل پور رہے، وہاں تھے۔ میرا بیٹا اور بہو تو اس علاقے میں "لال سنارا" پارک دیکھنے چلے گئے اور میرے پوتے کو اور مجھے ایک ایسی کوٹھڑی میں یا کمرے میں چھوڑ گئے جو حاصل پور کی بستی سے دور تھی اور اتفاقاً ایسا ہوا کہ ہمیں رہنا پڑا جہاں کبھی مویشی باندھے جاتے رہے ہوں گے یا ایسا کچھ سال رہا ہو گا۔ ہم وہاں اس لیے ٹھہرے کہ ہمیں وہاں سے اگلے پڑاؤ یا سفر کے لیے جانے میں آسانی تھی وگرنہ ہم شہر میں رہ جاتے۔ ہم دادا پوتا جس کمرے میں تھے اس کی ایک کھڑکی تھی جس کی سلاخیں تھیں پٹ نہیں تھے۔ پرانے انداز کی جیسے ہوئی تھیں۔ وہاں ایک ہی چارپائی تھی ہم دونوں اس پر لیٹ گئے۔

میرا پوتا مجھ سے باتیں کرنے لگا اور کہا "دادا اندھیرا بہت ہے۔"

میں نے کہا "ہاں بہت اندھیرا ہے۔"

کہنے لگا "اندھیرے میں کچھ بلائیں وغیرہ بھی آتی ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں اندھیرے میں بلائیں تو پھر آتی ہی ہیں۔"

وہ بولا کہ ”کیا ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟“

میں نے کہا کہ ”ان کا مقابلہ کر بھی سکتے ہیں نہیں بھی کر سکتے۔“

وہ مجھے کہنے لگا کہ ”دادی کہتی ہے کہ اللہ ساتھ ہوتا ہے۔“

میں نے اپنے پوتے سے کہا کہ ”بھئی تیری دادی زیادہ طاقتور ہے اور وہ ٹھیک سمجھتی ہے اور اس کا اللہ تو واقعی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ میں اور تم ذرا ایک نئے تجربے پر نکلے ہیں، شاید ہمیں اس کا اتنا پختہ یقین نہیں ہے جس قدر تمہاری دادی کو ہے۔“

ہماری باتوں کے درمیان چاند نکل آیا جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ ”دادا یہ اللہ میاں کی لالٹین ہے اور جس طرح ہماری ٹارچ بیٹھ گئی ہے کیا (اس کے سیل ختم ہو گئے تھے) اس طرح یہ اللہ میاں کی بتّی تو نہیں بجھے گی،“

میں نے کہا کہ ”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کبھی بجھ جایا کرتی ہے۔“

وہ بولا کہ ”دادا جس طرح ہم بتیاں بجھا کر سو جاتے ہیں کیا جب چاند کی یہ بتّی بجھے گی تو اللہ میاں بھی سو جائیں گے؟“

میں نے کہا کہ ”نہیں۔ اللہ کو نہ نیند آتی ہے نہ اُونگھ آتی ہے۔ وہ نہیں سوتا۔“

وہ حیران ہو کر پوچھے لگا کہ ”کیا وہ ہر وقت جاگتا رہتا ہے؟“

یہ سُنتے ہی اس نے ٹانگ میرے پیٹ پر رکھی اور خراٹے لے کر نیند میں چلا گیا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ جب اللہ جاگ رہا ہے تو مجھے پھر کس بات کی فکر ہے اور میں ساری رات اس کھڑکی کی طرف نگاہیں کر کے خوفزدہ سا ہو کر صبح کا انتظار کرتا رہا اور اس لئے وہ کمسن بچّہ خدا پر یقین میں مجھ سے بازی لے گیا۔

خواتین و حضرات! جس کو خدا کی قربت یا ساتھ نصیب ہوتا ہے۔ وہ چاہے زندگی کے کسی معاملے میں ہی ہو صرف ”روحانیت یا عبادت“ میں زندگی نہیں ہے۔ جب چلتے چلتے گاتے پھرتے یہ احساس ہو کہ خدا میرے ساتھ ہے تو اس کے بڑے فائدے ہیں۔ مادی بھی نفسیاتی بھی۔ بدنی بھی اور روحانی بھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ خدا کو تھوڑا سا Neglect کر دیتا ہے تو کمزور ہو جاتا ہے۔ ہم بچپن میں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ گاؤں کے بیس پچیس چھوٹے چھوٹے لڑکے مل کر کھیلتے۔ میں ان سب میں ذرا بھدا یا موٹا تھا اور میں ان کی نسبت بھاگ نہیں سکتا تھا۔ ایک دن میری باری آئی کہ وہ سب چھپیں گے اور میں

انہیں ڈھونڈوں گا۔ میں دیوار پر ماتھا رکھ کے اور اس کھیل کے تب کے قاعدوں کلیوں کے ساتھ پکارا کہ چھپ جاؤ لک جاؤ منڈیو۔

اب یہ سُن کر انہوں نے آواز دی تھی کہ "آجا پکڑ۔"

میں دیوار کے ساتھ ماتھا لگا کر اور وہ بولی یا الفاظ پکار کر کھڑا انتظار کرتا رہا اور اُدھر سے کوئی آواز نہ آئی اور کافی وقت گزر گیا۔

جب میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو وہ سارے بدبخت اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے تھے اور مجھے ویسے ہی اُلّو بنا کر وہاں کھڑا کر گئے تھے۔ اس پر مجھے شرمندگی کا احساس ہوا اور میں اونچی اونچی رونے لگا۔ یہ سُن کر ہماری تائی جس کا میں نے پچھلے پروگراموں میں بھی ذکر کیا ہے وہ بھاگی آئی اور مجھے کہنے لگی کہ کیا بات ہے کیوں روتا ہے۔

میں نے بتایا کہ میرے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ وہ اپنے پلّو سے میرے آنسو پونچھ کر کہنے لگی کہ "پتر کوئی بات نہیں ایسے ہی ہوتا ہے۔ پُت جو انسان ہے نا یہ اللہ کے ساتھ بھی ایسی آنکھ مچولی یا "لکن میٹی" کھیلتا ہے۔"

وہ کہنے لگی کہ "انسان 'لکن میٹی' عام طور پر کھیلتا رہتا ہے اور اللہ میاں کو باری پر

کھڑا کر کے خود بھاگ جاتا ہے اور پھر لوٹ کر نہیں آتا ہے لیکن خدا کے دل میں اپنی مخلوق کے لیے اتنی وسعت ہے کہ وہ انتظار کرتا رہتا ہے وہ کبھی تو لوٹے گا۔"

انسان کے دل میں خدا کی مہربانی سے ایک ایسا تار ضرور موجود ہے کہ وہ لوٹ کر خدا کی طرف ضرور آتا ہے۔ چاہے وہ کسی بھی روپ میں آئے۔

(پروگرام میں اشفاق احمد خان کو پانی پیش کیا جاتا ہے جس پر وہ شکریہ ادا کرتے ہیں)

تو میری بھی آرزو ہے کہ مجھے ایسی کوئی چیز ملے جسے میں اپنے دل کے اندر ڈالوں اور اشتہار میں جیسا لڑکیاں اُجلے پن کا دعویٰ کرتی ہیں میرا دل بھی صاف شفاف ہو جائے اور اس میں وہ خدا کی نہ بجھنے والی لالٹین کا سا ماحول پیدا ہو جائے اور خدا سے میری وہ آنکھ مچولی یا Hide and seek ختم ہو جائے جو کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ میرے دل کے سب داغ اور دھبے دُھل جائیں اور جانے سے قبل صرف ایک بار (زیادہ بار نہیں کیونکہ میں لالچی نہیں ہوں) خدا کو بڑی عزّت افزائی کے ساتھ جیسے ہم گھر میں اپنے قابلِ قدر مہمان کو کرسی پیش کرتے ہیں

بالکل ایسے ہی جیسے میرے بیٹے کی شادی پر بانو اپنے دوپٹے سے میرے سمدھی کے لیے کرسی پونچھتی اور ہم انہیں بٹھانے کے لیے بے چین پھرتے تھے۔

کیاویساہی احترام میں اللہ میاں کے لیے اپنے دل میں پیدا کر سکوں گا؟

یا پھر صبح کے وقت کبھی ایسا ہو کہ وہ کہیں کہ میں ساتھ چلنا چاہتا ہوں تو میں کہوں کہ اس سے بڑی خوش نصیبی میرے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔ بسم اللہ ساتھ چلئے۔ کیا وہ ساری شرمندگیاں اور کرتوتیں پسِ پشت ڈال کر میں اللہ میاں کو ساتھ لانے کا موقع حاصل کر سکتا ہوں؟

اگر آپ میں سے کسی کا تجربہ ہو تو مجھے گائیڈ کیجئے۔ (حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے) جیسے ہم اپنی گاڑی کا گیئر بدلتے ہیں اور اس کی رفتار میں تبدیلی کر سکتے ہیں آپ براہِ کرم میری رہنمائی فرمایئے۔

ایک خاتون: یہ سلسلہ تو چلتا ہے اور خدانخواستہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ ایسا بھی ضرور ہوتا ہے کہ ہم وقتی طور پر خدا سے تعلق کو گھٹا لیتے ہیں اور پھر ابھار بھی لیتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہوتا تو یہ انسانیت باقی نہ رہتی۔ اس تعلق میں اضافے کے لیے انفرادی کوشش ہوتی ہے۔

اشفاق احمد: یہی میں بات کر رہا تھا کہ جو ڈرائنگ روم میں نے خاص طور پر اللہ کے لیے تیار کیا ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس میں مَیں اپنے اللہ کو لا سکوں۔ بس میرا مسئلہ یہ ہے۔ میں کتابی طور پر تو بہت کچھ جان گیا ہوں اسے عملی طور پر کرنے میں مشکل ہو رہی ہے۔

ایک اور خاتون: جب آپ پلٹ کر ضمیر کی آواز سُن لیتے ہیں وہ آپ کے لیے سب سے اچھاDetergent ہے۔

ایک صاحب: حقوق العباد سب سے بہترینDetergent ہے۔

اشفاق احمد: میں حقوق اللہ تو ادا کر لیتا ہوں کسی طور لیکن حقوق العباد تو مشکل کام ہے۔ وہ تو میں نے چھوڑا ہوا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا کہ میں نصابی طور پر یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ میں جمعہ ایڈیشن بھی پڑھتا ہوں۔ اس میں بھی یہی باتیں ہوتی ہیں۔ اب میں انہیں اپلائی کرنا چاہتا ہوں اور وہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں اندر کا میک اپ کرنے کا خواہاں ہوں۔

ایک محترمہ گویا ہوتی ہیں: ہم زندگی کو اور لیول سے دیکھتے ہیں۔ ہمارا تجربہ اور ہے جبکہ کہ جبکہ کسی اور شخص کا تجربہ اور ہو گا اور وہ کسی اور نظر سے زندگی کو

دیکھ رہا ہو گا۔

اشفاق احمد: اگر ہم انسانوں کو یا آدمیوں کو پڑھیں گے تو ان پر بہت اچھی کہانی لکھ لیں گے لیکن اپنے اندر کی تعمیر کے لیے کچھ اور چاہیے۔

آپ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا اور کام کی باتیں معلوم ہوئیں لیکن سوئی جہاں اٹکی تھی اب بھی وہیں پر ہے۔ اب ہم ایک دوسرے سے اجازت چاہیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور اس بات کا شرف عطا فرمائے کہ ہم خدا سے Hide and Seek کھیلتے ہوئے اسے اس کی باری پر ہی نہ کھڑا کر کے چلے جائیں بلکہ اسے آواز دے کر بھی بلائیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف بھی عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

واشنگٹن سے شکوے، امریکنوں کے نام

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

عمر کے ایک خاص حصّے میں آدمی شام کے وقت کسی خاص کونے میں بیٹھ کر عجیب و غریب قسم کی باتیں سوچنے لگتا ہے اور آپ اپنے حساب کو چکانے کے لیے ہر اس چیز کو جانچتا اور آنکتا ہے جو ماضی میں اس کے ساتھ گزر چکی ہیں یا جن کے ساتھ ماضی میں اس نے اپنا تعلق اور رابطہ قائم کر کے وقت طے کیا ہے۔ مجھ پر ایسی کوئی کیفیت بھی طاری نہیں ہوئی تھی لیکن پچھلے چند مہینوں بلکہ چند برس سے مجھ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہونے لگی ہے جس کو ناسٹلجیا کہتے ہیں۔ اس بیماری یا کیفیت میں انسان کو اپنا گزرا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ انسان آج یا قریب کی بات بھولنے لگتا ہے اور ماضی بعید کی باتیں یاد کرنے لگتا ہے۔ اپنے پرائمری سکول اور مڈل کے زمانے کی Remote باتیں زیادہ وضاحت سے یاد رکھتا ہے۔

اس کیفیت سے دوچار ہونے کے بعد میں نے اپنے ساتھی ہم عمر دوستوں سے یہ

پوچھا کہ کیا یہ کیفیت ان پر بھی طاری ہوئی ہے تو تقریباً سب نے اس بات کا اعتراف کیا کہ انہیں بھی دُور کی باتیں زیادہ یاد آتی ہیں اور حال کی باتیں اتنی شدّت سے یاد نہیں رہتیں۔ انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ کل اٹھا کر خط کہاں رکھا تھا۔ میں نے کہا کہ اس کی تحقیق کرنی چاہیے۔ ہم تو اس علم سے ناآشنا ہیں۔ ہمیں تو علم ہی نہیں ہے کہ کیا ماجرا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم نے کئی ڈاکٹروں سے اس بابت پوچھا تو انہوں نے کہا کہ نہیں یہ ہمارے دائرہ کار میں نہیں ہے۔ پھر میں نے اپنے بابوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ”ہاں بس ہوتا ہے ایسے، اس کا ہماری سوچ کی لہروں سے تعلق ہوتا ہے۔“

پھر میں نے ماہرینِ نفسیات سے رجوع کیا کیونکہ یہ ان کے سوچنے کی چیز ہے۔ کئی سائیکالوجسٹوں نے میرے اس معمے کو حل کرنے کی کوشش تو کی لیکن ان کی بات کچھ میرے دل کو نہیں لگی۔ پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ نفسیات کی خاتون سربراہ ڈاکٹر صاحبہ کہنے لگیں کہ ٹھیک ہے ایسا ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ وہ مُسکرانے لگیں لیکن انہوں نے مجھے کچھ بتایا نہیں۔ جب ان کی مُسکراہٹ بڑی معنی خیز ہوئی تو میں نے کہا کہ ”بی بی دیکھیں مجھے اس کیفیت پر کوئی اعتراض

نہیں میں تو ایک طالب علم ہوں جو کچھ نہ کچھ جاننے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔ یہ میری شروع سے ہی عادت ہے اور میری طبیعت میں تجسس ہے آپ مجھے براہِ کرام بتائیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔"

انہوں نے کہا کہ "آپ یہ جان کر کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "آپ کو پتہ ہے اس کا؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے ان سے کہا کہ "پھر تو آپ اللہ کے واسطے مجھے یہ ضرور بتائیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔"

انہوں نے بدستور مُسکراتے ہوئے بتایا کہ صاحب دیکھیں، انسانی زندگی میں انسان جو ہے یہ چونکہ Complete پیدا نہیں ہوتا۔ ایک پھولوں کی جھاڑی جو ہے وہ جب بھی بیج پیدا کرے گی اپنے جیسا ہی کرے گی۔ اس کے جب بھی پھول نکلیں گے پہلے جیسے ہی نکلیں گے۔ ایک کتّا پورے کا پورا کتّا ہو گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ وہ کتّا کہے کہ سوری سر میں نے ابھی میٹرک نہیں کیا ہے۔ اس لیے میں اچھا کتّا نہیں ہوں۔ وہ وفادار ہی رہے گا۔ آپ کے حکم کا منتظر ہی رہے گا۔ مالک کو دیکھ کر دُم ضرور ہلائے گا۔ ایک گھوڑا گھوڑا پیدا ہوتا ہے۔ ایک گھوڑے کو بغیر

کسی Institution سے سیکھے پتا ہے کہ اسے کس پتھر پر قدم رکھنا ہے اور کس پر نہیں رکھنا اور آپ اپنا بہت ہی قیمتی بچّہ یا پوتا اس گھوڑے پر بٹھا دیتے ہیں۔ (ایسا ہوتا ہے نا جب آپ نتھیا گلی جاتے ہیں اور اپنے بچّوں کو گھوڑے پر بغیر کسی خوف کے بٹھا دیتے ہیں) وہ بڑی خطرناک جگہ ہوتی ہے لیکن گھوڑے کو پتہ ہوتا ہے کہ اسے اس بچّے کو بٹھا کر کس احتیاط سے چلنا ہے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے آپ کو ہر وقت تکمیل کے دائرے میں داخل کرتا رہتا ہے اور آگے چلتا رہتا ہے۔ وہ مکمل نہیں ہوتا۔ یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ کائنات کی اشرف مخلوقات کہلانے والی مخلوق میں کوتاہی ہے کہ وہ پورا نہیں ہے اور وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے۔

اس طرح انسان کا بچّہ انسان جو ہے یہ ٹائم کے اندر سے گزرتا ہے اور وقت ہی اس کا ماضی حال اور مستقبل ہوتا ہے۔ یہ ماضی کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے اور گھوڑے کی طرح پاؤں رکھتا جاتا ہے اور اس کی نگاہیں مستقبل کی طرف رہتی ہیں اور اس کی ساری ترکیبیں اور ترغیبیں مستقبل سے وابستہ ہوتی ہیں۔ چوتھی کا بچّہ دیکھتا ہے کہ اسے پانچویں جماعت میں جانا ہے۔ پھر پانچویں سے میٹرک میں جانا ہے۔ میٹرک کے بعد مجھے اپنی زندگی اس طرح ڈھالنی ہے ڈاکٹر بنتا ہے یا انجنیئر

بنتا ہے۔ تاجر بنتا ہے۔ اور وہ اپنے مستقبل بارے سوچتا ہے۔ چونکہ اس کی مستقبل کے ساتھ گہری وابستگی ہوتی ہے اور مستقبل ہی کی طرف نگاہ رکھتا ہے اس لیے یہ اپنے ماضی اور حال سے بے نیاز رہتا ہے حالانکہ اگر یہ اپنے آپ کو ایک تکمیل کے اندر رکھنے کا خواہش مند ہے اور Complete ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنے حال پر نظر کرنی چاہیے کہ آج اس وقت جو میرے ساتھ کیفیت ہے یہ کس وجہ سے ہے؟ کیسے ہے؟ اگر موجودہ صورتحال پر گہری نظر نہ رکھی جائے تو انسان ماضی کی یاد میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مستقبل سے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور پھر وہ کسی گھن گھیری اور مشقت میں اپنی ساری زندگی گزار دیتا ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ ”یہ باتیں تو ہمارے بابے بھی کہتے ہیں۔“

وہ کہنے لگیں۔ ”اشفاق صاحب آپ عمر کے اس حصّے میں ہیں کہ جب آپ اپنی پرانی تربیت کے زور پر مستقبل میں دیکھتے ہیں تو وہاں سوائے موت کے آپ کو کچھ نظر نہیں آتا اور ہر پلان اور منصوبے کو بناتے وقت ایک بوڑھا آدمی ایمانداری کے ساتھ سوچ رہا ہوتا ہے کہ آگے موت کی انتظار کرتی ہوئی کھائی ہے۔ آپ چونکہ ذہین آدمی ہیں اس لیے خوف زدہ اور ڈری ہوئی شخصیت بھی ہیں اور جب بھی کوئی کواڑ کھولتے ہیں، بات موت کی فکر کے ساتھ ہی منتج ہوتی

ہے اور انسان اس سے خوف زدہ ہو کر مُنہ پیچھے کی طرف کر لیتا ہے اور مستقبل کا ڈراؤنا کواڑ کھولنے کی بجائے وہ ماضی کی طرف چلا جاتا ہے اور اس ڈر اور خوف والے دروازے کو مکمل طور پر بند کر لیتا ہے اور Right About Turn مُنہ پیچھے کی طرف کر لیتا ہے اور ماضی سے ہی اُمّید کی کرنیں ٹٹولنے لگتا ہے۔" ان کی (ڈاکٹر صاحبہ کی) یہ بات بالکل ٹھیک اور خوبصورت تھی۔ وہ کہنے لگیں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں وہ اپنے ماضی کی ان یادوں سے فائدہ بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ اگر وہ ان یادوں کو اپنی موجودہ زندگی کا ایک حصّہ بنا کے ان کے اوپر تفاخر کرنے لگیں تو ان کے لیے یہ وقت گزارنا بڑا آسان ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحبہ کی باتیں بجا تھیں۔ کیوں جب ہم اپنے ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا ماضی کچھ اتنا ناقص بھی نہیں تھا جتنا ہمیں بتایا جا رہا ہے۔ اب تقابلی مطالعہ میں میرے اور میرے پوتے کے سکول میں بڑا فرق ہے۔ میری تعلیم کا جو سلسلہ تھا اس میں اور آج کی تعلیم میں بڑا فرق ہے۔ میری تربیت کے جو چوکھٹے تھے اور آج کی تربیت کا جو چوکھٹا ہے اس میں نمایاں فرق ہے۔ (پروگرام کے دوران اشفاق صاحب کو بُھنے ہوئے چنے پیش کیے جاتے ہیں جن کی وہ تعریف کرتے ہیں)۔

جن لوگوں نے اپنے ماضی کو نیک بنا کر اور اس سے شرمندگی نہ اختیار کر کے اپنی زندگی میں اس ماضی کو دخیل کیا ہے تو وہ یقیناً کامیابی کے ساتھ اپنا سفر طے کریں گے اور خوشی کے ساتھ اس کھلے ہوئے پھاٹک میں داخل ہوں گے جس میں سب داخل ہوں گے۔ میری خواہش ہے کہ ہم بغیر کسی فکر پریشانی کے ٹاٹا بائی بائی کرتے ہوئے گزر جائیں اور پھاٹک میں داخل ہوں۔

جب میں اپنا ماضی یاد کرتا ہوں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا ماضی جس میں میرا اسکول، ماں، باپ، بہن، بھائی ہیں اس میں ایک ایسی اچھی تصاویر موجود ہیں جو میری بڑھاپے کی اور آخری زندگی بسر کرنے کے لیے بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں اپنے ماضی پر شرمندہ ہرگز نہیں ہوں باوجود اس کے کہ ہمارا گھرانہ غریب تھا۔ ہم کوئی بڑے امیر آدمی نہیں تھے۔ میری ماں کو بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ اتنا زیادہ کہ آج کی جو خواتین کے حقوق کی تحریکوں کی جو بڑی بڑی لیڈر ہیں اگر انہیں دیکھیں تو بے ہوش ہو کے گِر جاتیں۔ میری ماں دو بھینسوں کا دودھ دوہتی تھی۔ پھر ان کا چارہ ایک بڑے چکر والے ٹوکے پر سے کترتی تھی اور اس کی بڑی خواہش ہوتی تھی اور کہتی تھی کہ اس ٹوکے کے مُنہ پر چارہ لگا دو۔ ہم ایک بار تو لگاتے تھے پھر کھسک جاتے تھے۔ پھر وہ خود ہی ٹوکے کے مُنہ پر

چارے کی "پولی" لگاتی اور خود ہی اس چکر کو "گیڑتی" (گھماتی) تھی۔ وہ یہ سارا کام بڑی خوش دِلی سے کرتی تھی۔ اس کے ماتھے پر کبھی سلوٹ نہیں آئی، وہ تھکی ضرور ہوتی تھی لیکن بے زار نہیں ہوتی تھی۔ میں اکیلی اپنی ماں کا ذکر نہیں کرتا ہوں۔ اس وقت وہاں جتنی بھی مائیں تھیں اتنا ہی کام کرتی تھیں۔ ہمارا محلّہ، ہمارا قصبہ، لوگ، ہم چھوٹے دوست ماؤں کے حوالے سے ہی جانے جاتے تھے۔ ایک ستندر کی ماں ہوتی تھی۔ ایک بلوندر کی ماں تھی۔ بلوندر کی ماں کو بلوندر کی ماں ہی کہتے تھے۔ مصطفی کی ماں، جمیل کی ماں، یہ شناخت تھی۔ وہ بڑی پختہ اور عمل میں ثابت قدم ہوتی تھیں۔ وہ ایک بڑا ظلم کرتی تھیں کہ رو رعایت نہیں کرتی تھیں۔ اگر میں مثال کے طور پر اپنی ماں سے کہتا کہ میں ساتویں میں ہو گیا ہوں تو وہ کہتیں "گھمیاراں دا منڈا اٹھویں وچ ہو گیا اے (کمہاروں کا بیٹا آٹھویں جماعت میں چلا گیا ہے) مجھے یاد آ رہا ہے کہ میرے بڑے بھائی پڑھنے میں ہم سے بہتر تھے (ہم جو دو چھوٹے تھے)۔ وہ تعلیم کے معاملے میں بہت مستعد بھی تھا۔ اس کا مقابلہ اس کے ہم جماعت بلونت کمار سے تھا۔ وہ فرسٹ آتا تھا۔ میرا بھائی سیکنڈ آتا تھا۔ میرے والد نے میرے بھائی سے کہا کہ یار شرم کر وہ دُبلا پتلا سا نالائق لڑکا ہے اور تو موٹا تازہ صحت مند ہے۔ تمہارا سیکنڈ آنا تو کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ میرے بھائی نے بہت زور لگایا اور محنت کی اور فرسٹ آ گیا۔

فرسٹ آنے پر انہیں سُرخ گوٹے میں لپٹی ہوئی کتاب بطور انعام ملی۔ وہ انعام لے کر ابّا جی کے پاس آیا اور کہنے لگا دیکھیں ابّا جی میں فرسٹ آیا ہوں اور بلونت کمار پیچھے رہ گیا ہے۔

ابّا جی نے یہ سُن کر کہا کہ یہ انعام تمہیں کس نے دیا ہے۔ بڑا بھائی فخر سے کہنے لگا کہ جی گومل چند نارائن نے دیا ہے (وہ اس وقت کے کوئی بڑے آدمی تھے)۔ میرے ابّا نے وہ انعام اس کے ہاتھ سے لے کر پرے رکھتے ہوئے کہا کہ گول چند نارائن سے انعام لینا کون سی بڑی بات ہے۔ تم گومل چند نارائن ہو کر دکھاؤ۔ یہ ایک چیز تھی جو بظاہر لگتی تھی کہ دل ٹوٹ گیا۔ یہ ہو گیا وہ ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔ اس زمانے میں سائیکالوجی نہیں ہوتی تھی۔ ماں بیٹے کا اور باپ بیٹی سے اولاد کا ایک سیدھا رشتہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے تعلق سے ایسے موڑ لیتے تھے ڈھال لیتے تھے جیسا کمہار یا کوئی کوزہ گر چاک پر مٹّی کو اپنی مرضی سے ڈھال لیتا ہے۔ اسی طرح وہ والدین اپنی کم تعلیم کے باوصف اسے موڑ کر اپنی مرضی کے مطابق کر لیتے تھے اور جب اس کو بجا کر دیکھا جاتا تھا تو کسی طرف سے اس کی آواز خراب نہیں ہوئی تھی اور وہ کی طرف سے پلا ٹیڑھا یا بھینگا نہیں ہوتا تھا۔ یہ ساری خوبیاں ان لوگوں میں موجود ہوتی تھیں اور وہ ہمارے ساتھ مل کر بچّوں کے ساتھ مل کر

اتنی ہی محنت کرتے جتنی بچّے اپنی طرز پر کرتے تھے۔ ہمیں مولڈ کرتے تھے کہ ہمیں ان سے کوئی گلہ یا شکایت نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت کے کسی بچّے نے نہ نہیں کہا کہ اے ماں باپ اگر تو نے مجھے اس وقت ٹوکا ہوتا تو میں آج جرائم پیشہ نہ ہوتا۔ ایک بار روٹی کھاتے ہوئے میری ماں کا لقمہ زمین پر ِگر گیا تو انہوں نے اسے اُٹھا کر ماتھے سے تین دفعہ لگایا اور کھالیا۔ میری بہن جو ہم سے بڑی تھی اور زیادہ پڑھی ہوئی تھی اور وہ ان دِنوں خواتین، تہذیبِ نسواں وغیرہ کے رسالے پڑھا کرتی تھی ماں کو نیچے سے لقمہ اُٹھا کر کھاتے دیکھ کر چلّانے لگی۔ اماں جراثیم، اماں جراثیم۔ یہ تم کیا کر رہی ہو۔ زمین سے اُٹھا کر نہیں کھاتے۔ اماں کہنے لگیں کوئی بات نہیں۔ اب میں نے کھا لیا ہے، کچھ نہیں ہوتا۔ میں اب محسوس کرتا ہوں کہ میری ماں جراثیم کے مقابلے میں خدا سے زیادہ ڈرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اس رزق کی بے ادبی نہیں ہونی چاہیے۔ اصراف نہ ہو۔ جب اس ماں جی کو دیکھتے ہیں تو خوشی بھی ہوتی ہے اس کی بات میں اخلاق کا پہلو نمایاں ہوتا تھا اور اخلاق کا راستہ بتایا جاتا تھا۔ اب ایسا رواج نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ ہمارے ہاں علم و تعلیم تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور ہم نے ایسے Method اختیار کر لیے ہیں جو شاید آگے چل کر اتنے کام نہیں آئیں گے لیکن ایک قوم اس دنیا میں ابھی بھی موجود ہے جو اخلاق پر قائم ہیں۔ اس قوم کے گاؤں میں

ابھی بھی اخلاقی قدریں موجود ہیں، جو ہم نے اپنے بچپن میں دیکھی تھیں۔ آپ کو یہ سُن کر تعجّب ہو گا اور حیرانی ہو گی کہ وہ قوم امریکی لوگ ہیں۔ امریکہ کی حکومت اس کا واشنگٹن ڈی سی اور وائٹ ہاؤس مختلف ہے۔ اس کے رہنے والے اور دیہاتوں کے باسی ان حکومتوں سے برعکس ہیں، وہ اپنی اخلاقی اقدار پر آج بھی قائم ہیں جو ہم نے اپنے بچپن میں دیکھی تھیں۔

پچھلے سے پچھلے برس میں کینساس کی ریاست میں گیا۔ وہاں بڑے پی ایچ ڈی پڑھے لکھے موجود ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ ایک مرتبہ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ کھانا کھانے سے قبل ان کا بڑا ابّا یا والد دُعا پڑھتا ہے۔ جس میں کہتا ہے کہ اللہ تیری مہربانی ہے کہ تو نے ہم کو رزق دیا ہے۔ وہ دُعا کافی لمبی ہوتی ہے اور سب تعلیم یافتہ بچّے ویسے ہی بیٹھے ہوتے ہیں اور وہ سب دُعا کے بعد کھانا شروع کرتے ہیں۔ ان کی آپسی میل ملاپ کی باتیں سب اخلاقی اقدار پر پوری اُترتی ہیں۔ میں ایک بار امریکہ کی وسکونسن سٹیٹ کی ایک جگہ سن پریری گیا۔ وہاں اعلیٰ درجے کی مکئی کی چھلیاں ہوتی ہیں۔ وہ بڑے کمال کی اور مزیدار ہوتی ہیں۔ سن پریری میں ۲۲ اگست کو کارن فیسٹیول ہوتا ہے۔ وہاں لوگ خواتین و حضرات بچّے بوڑھے لڑکیاں بوڑھیاں اعلیٰ درجے کے کپڑے پہنے شریک ہوتی

ہیں۔ لڑکے باجے بجا رہے ہوتے ہیں۔ ہم ہوں تو کہیں کہ یہ مکئی کی چھلیاں کیا ہیں، ہم ایسے ہی باجے بجاتے پھریں لیکن وہ اس فیسٹیول کو دھوم دھام سے منا رہے ہوتے ہیں۔ وہاں فیسٹیول کی جگہ بڑی سجائی ہوتی ہے اور دور دراز کے گاؤں سے لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں۔ فیسٹیول میں اُبلی ہوئی چھلیاں ہوتی ہیں، ساتھ مکھن اور کالی مرچ بڑی مزیدار ہوتی ہیں۔ جب میں نے میلے میں شرکت کی، ساری چیزیں کھانے کو ملیں اور لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو وہ مجھے بڑے شوق اور تجسس سے ملتے اور دیکھتے رہے۔ میں نے ایک لمبا کرتا پہنا ہوا تھا اور نیچے رنگ دار لاچا جس طرح کا انجمن (اداکارہ انجمن ان کی اور سلطان راہی کی فلمی جوڑی بڑی مشہور تھی) فلموں میں پہنا کرتی تھی، پہنا ہوا تھا۔ وہ مجھے پوچھتے کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو پاکستان کا پتا نہیں تھا اور میں انہیں جب بتاتا کہ افغانستان کے ساتھ اس طرح انہیں Location کا پتا چلتا۔ افغانستان کا ان سب کو علم تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ افغانستان نے روسیوں کو بھگایا ہے۔ وہ پاکستان بارے مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ نے انگریزی کیسے سیکھی تو میں نے انہیں بتایا کہ پاکستان میں بھی پڑھے لکھے ہیں۔ وہاں کوئی ان پڑھ نہیں ہے۔ اگر تم وہاں کوئی ان پڑھ تلاش بھی کرو گے تو تمہیں نہیں ملے گا۔

امریکی عوام معصوم ہے۔ انہیں نہیں معلوم کہ حکومت کیا کر رہی ہے۔ انہیں جو بتایا جاتا ہے سادگی سے یقین کر لیتے ہیں۔ انہیں اگر بتایا جائے کہ یو این او میں جمہوریت کے منافی کام بھی ہو رہے ہیں اور عہدوں سے پھرا جا رہا ہے تو وہ سارے کے سارے دیہاتی اور شریف لوگ ضرور احتجاج کریں گے۔ اگر احتجاج نہیں کر سکیں گے تو ہمیں تسلّی ضرور دیں گے۔ دل جوئی ضرور کریں گے اور دلی افسوس کریں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم صرف حکومتوں کے ساتھ وابستہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم سب سے کوتاہی ہوتی ہے۔ ہم وائٹ ہاؤس کی طرف اور واشنگٹن کی طرف دیکھتے ہیں۔ امریکہ کے دیہاتوں سے رابطہ نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے حکومتوں کے کام حکومتیں جانیں لیکن میں آپ ہم سب، ہمارا کہیں نہ کہیں فرض بنتا ہے کہ ایک پیسے کا ایک خط لکھ کر ان کو بتائیں کہ کیسے عہد شکنی ہو رہی ہے۔ ہمارے اوپر کیا کیا گزری ہے تو وہ ہم سے بڑھ کر بات کریں گے۔

آپ کی تشریف آوری کا شکریہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

شاہی محلّے کی ابابیلیں

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

جب سرکاری حکم ملتا ہے یا کوئی بھی حکم ملتا ہے تو اس کی بجا آوری کے لیے انسان کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں لیکن چونکہ حکم بجالانا ہوتا ہے اس لیے آدمی مشکل مقامات سے بھی گزرتا ہے۔ میں اکثر آپ سے بابوں کی باتیں کرتا رہتا ہوں جن کا تعلّق روحانیت سے ہے لیکن بابوں کی شکل صورت اور Shape تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ آپ اندازنہیں لگاسکتے کہ یہ آدمی جو میرے قریب سے گزرا ہے اور ایک معمولی حیثیت کا آدمی ہے یہ بھی روحانیت کی دنیا میں کوئی اپنا منفرد مقام رکھتا ہے یا یہ ہوا کا جھونکا جو بظاہر ہوا کا جھونکا ہے اس کے اندر بھی کوئی ایسا پیغام تھا جس کو میں سمجھ نہیں سکا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی بات تھی۔

خداوند تعالیٰ نے اپنی پاک کتاب میں پرندوں کا بڑا ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر

مجھے اس ہدہد پر بڑا پیارا آتا ہے جو سورۃ سبا میں حضرت سلیمان کے دربار میں موجود نہیں تھا۔ موجی مزاج تھا۔ جانے کہاں گیا ہوا تھا اور حضرت سلیمان نے غصّے ہو کر کہا تھا کہ "وہ ہدہد کہاں ہے۔ اسے پیش کیا جائے۔"

خیر۔۔۔۔۔۔ یہ پرندے جو ہیں یہ خاص طور پر میرے ملکے سے ذاتی تجربے کے مطابق یہ روحانیت کے پیامبر ہوتے ہیں۔ اکثر آپ کے بڑے بابا پارکھ یہ کہتے رہے ہیں کہ پرندوں کو دانا ڈالنا چاہیے۔ کچھ گھروں میں اس طرح کا خاص اہتمام ہوتا ہے اور پرانی مائیاں بیٹھ کر خشک روٹی کے ٹکڑوں سے بھورے چورے بناتی رہتی ہیں اور پھر انہیں چڑیوں کو ڈالتی ہیں۔

خواتین و حضرات! اب چڑیاں بے مقصد نہیں آتی ہیں گھروں میں۔ ان کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ان کا بھی کوئی پیغام ہوتا ہے۔ ان کی کوئی زبان ہوتی ہے۔ بھلے ہم اسے نہ سمجھ سکیں لیکن ان کا گھر میں تشریف لانا ان کا ہماری منڈیر پر بیٹھنا اور پھر چلے جانا بڑی فلاح کی بات ہوتی ہے۔ پرندوں کے ساتھ انسانوں کا بڑا پرانا تعلّق ہے۔ اتنا پرانا کہ ایک مرتبہ ہاتھیوں والے مکّہ پر ہاتھی لے کر حملہ کرنے آ گئے تھے اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت سے جو ابابیل تھے انہوں نے اپنی طرف سے جیش تیار کر کے ان ہاتھی والوں کو مار بھگایا تھا۔

یہ ابابیل میری زندگی میں بہت قریب رہا ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی جب میں ولایت میں تھا۔ جب میں ولایت میں ایک اُستاد کی حیثیت سے گیا ہوا تھا تو ابابیل شام کے وقت ہمارے گھر کے قریب گرجوں کے ارد گرد منڈلایا کرتے تھے۔

اگر آپ حرم شریف تشریف لے گئے ہوں تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ خاص طور پر شام کے وقت اور مغرب کے بعد وہاں جو ابابیل آتے ہیں اور جس طرح سے وہ چکر کاٹتے ہیں اور طواف کرتے ہیں وہ بھی دیکھنے کے قابل منظر ہوتا ہے۔ جیسے ہمیں حکم ہے کہ کعبہ کو دیکھنا بھی عبادت ہے تو وہاں بیٹھ کر اس ماحول میں ان ساری چیزوں کا جائزہ لیتے رہنا بھی ایک عبادت ہے۔

ہمیں جو ماحولیات والے بار بار ذکر کرتے ہیں کہ آپ اپنے درختوں اور پرندوں کا خاص خیال رکھیں کیونکہ یہ ہماری زندگیوں میں داخل ہیں اور یہ زندگی کے ترازو کو بیلنس میں رکھنے کے لیے بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ایک بار ٹیلیویژن پر آغا بشیر صاحب جو ہمارے باس تھے انہوں نے مجھے بلا کر یہ کہا کہ ہمارے پاس گانے کا جو حصّہ ہے وہ بڑا کمزور ہے اور کوئی خصوصی گائیکی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ جا کر گانے والوں کو ان کے گھروں میں

انٹرویو کر کے، جانچ کے پسند کرو اور پروگرام ریکارڈ کراؤ۔ اب میں موسیقی یا گائیکی بارے کوئی خاص علم بھی نہیں رکھتا تھا لیکن اب اس کا حکم تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ "اس مقصد کے لیے کہاں جانا ہوتا ہے؟"

انہوں نے کہا کہ "ہمارے لاہور کے علاقے میں ایک شاہی محلہ ہے وہاں آپ کو جانا ہوگا۔"

ان کی یہ بات سُن کر میں ذرا لرزا، وہ ساتھ ہی بولے کہ "یونس کلرک آپ کے ساتھ جائے گا۔ یہ ان کے ایڈریس وغیرہ نوٹ کرتا رہے گا۔"

میں شام کو گھر آیا، لیٹا، سویا، طبیعت پر ایک بوجھ تھا۔ انسان پر کئی طرح کا بوجھ ہوتا ہے۔ ہمارے اوپر سب سے بڑا تکبّر کا بوجھ ہوتا ہے اور ہم یہ جانے بغیر کہ خدا کے نزدیک کون بڑا ہے اور کون گھٹیا ہے فیصلے خود ہی کرتے رہتے ہیں۔ میں بھی طبیعت پر بوجھ لے کر ایسے ہی فیصلے کیے جارہا تھا۔

اگلے دن میں حکم کے مطابق شاہی محلّے گیا۔ ہمارا کلرک بھی میرے ساتھ تھا۔ میں بڑی ہمّت اور کوشش کر کے گیا کہ اگر وہاں لوگ مجھے دیکھیں تو کیا سوچیں گے کہ یہ صاحب کہاں پھر رہے ہیں۔

خواتین و حضرات! ایک جو جھوٹی سچّی عزّت ہوتی ہے نا، میں نے اس کو بھی پھلانگا اور ایک گھر میں داخل ہوا۔ ان لوگوں نے یہ جان کر یہ پی ٹی وی سے آئے ہیں بڑی محبّت اور ادب سے استقبال کیا اور وہ جو کچھ بھی گائیکی کے بارے میں جانتے تھے بتایا۔ ہم انہیں نوٹ کرتے رہے۔ اب یہ میرے لیے بھی بڑا عجیب تجربہ تھا۔

خواتین و حضرات! جب ہم وہاں ایک گھر میں گئے تو وہاں ایک ڈیوڑھی تھی اور وہ بالکل خالی تھی۔ ہمیں اس ڈیوڑھی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جانا تھا۔ جب میں اس ڈیوڑھی میں گیا تو میں نے ایک عجیب و غریب چیز دیکھی کہ چھت کے ساتھ ایک پرانی وضع کا نہایت خوبصورت غالیچہ لگا ہوا ہے۔ زمین پر تو غالیچے بچھے دیکھے تھے۔ چھت پر ان کا لگا ہونا واقعی معنی خیز تھا۔ وہ غالیچہ کچھ پرانا تھا اور اس کے رنگ مدھم پڑ چکے تھے اور وہ ایک طرح ''گھسمیلا'' سا تھا لیکن وہ دریدہ حالت میں چھت کے ساتھ لگا ہوا کافی دبیز قسم کا غالیچہ تھا۔ میں کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا اور خیال کرنے لگا کہ یہ ڈیکوریشن کے لیے ہو گا۔ ہم نے اس کی طرح ڈیکوریشن بارے کہیں پڑھا نہیں ہے۔ اتنے میں ایک صاحب سیڑھیاں اُتر کر ڈیوڑھی میں آئے، وہ بڑے بھاری بھر قسم کے آدمی تھے۔ وہ نہایت سنجیدہ قسم

کے تھے۔ وہ ہم سے آنے کی وجہ دریافت کرنے لگے۔ ہم نے وجہ بتائی تو وہ ہمیں اُوپر لے گئے۔ عباس صاحب ان کا نام تھا۔ اُوپر گئے تو وہاں ایک بی بی ملیں۔ میں نے ان سے جاتے ہی کہا کہ "نیچے ڈیوڑھی میں آپ کی چھت کے ساتھ جو اتنا اچھا غالیچہ لگا ہوا ہے وہ میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ کیسی ڈیکوریشن ہے۔"

اب اور اس نے بتایا کہ "یہ غالیچہ نہیں ہے۔ یہ ابابیلوں کے گھونسلے ہیں جو وہ چھت کے ساتھ چپکا کے لگاتی ہیں۔ اس نے بتایا کہ ایک زمانے میں ہمارا یہ گھر ابابیلوں کی آماجگاہ تھا اور بیسیوں ابابیل اس میں آباد تھے۔ اب یہ ویران ہو گیا ہے۔ جیسے کوئی گاؤں قریہ یا شہر کھنڈر ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کھنڈر ہو گیا ہے۔ اب ابابیل یہاں نہیں رہتے۔ وہ چھوڑ کر یہ جگہ جا چکے ہیں۔"

خواتین و حضرات! اب میں اپنا کام تو بھول گیا اور اس بات میں دلچسپی لینے لگا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کیوں آئے تھے اور کیوں چلے گئے۔ اس نے کہا کہ "بھائی صاحب ابابیل ہمیشہ وہاں گھونسلا بناتا ہے جہاں اچھا لحن، اچھی سوچ اور اچھی آواز نکلتی ہو۔ جہاں اچھا سُر اور لحن نہ ہو وہاں پر یہ گھونسلا نہیں بناتا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس مسجد کا مؤذن سُریلا ہو اور جہاں پر قرأت کا سماں بندھا رہتا ہوں وہاں ابابیل گھر بناتے ہیں۔"

اس بی بی نے مجھے کہا کہ "آپ نے دیکھا ہو گا کہ شاہی مسجد میں بہت ابابیلوں کے گھر ہیں۔ اسی طرح گرجوں میں جہاں بہت اچھا آرگن بجتا ہے اور جہاں سُریلے پادری ہوتے ہیں وہاں پر ان کے گھر ہوتے ہیں یا پھر ایسے گھرانے جہاں سُر کا چلن عام ہو۔" وہ کہنے گی کہ "یہ میرا گھر تھا اس میں میری تین خالائیں تھیں جن سے اچھی گائیکائیں پاکستان کیا پورے برصغیر میں کوئی نہیں تھی۔ وہ تینوں کی تینوں فنِ گائیکی پر کمال رکھتی تھیں اور وہ تینوں کی تینوں 'شُدہ راگ' جانتی تھیں اور ان میں سے ایک ماسی سہرا تھی وہ 'دھوتک راگ' بھی گاتی تھی۔"

اور اس نے مزید بتایا کہ اس کی ماسی سرتاج جنوب کی گائیکی کی ماہر تھی اور بڑی بڑی دُور سے شوقین مزاج لوگ ان کا گانا سُننے کے لیے آتے تھے اور جب وہ تینوں بیٹھ کر ریاض کرتی تھیں (وہ کہنے لگی کہ میں تو زیادہ بس روٹی ہانڈی میں رہتی۔ گانے بجانے کے کام میں زیادہ شریک نہیں ہوتی تھی) تو ہمارے گھر کے باہر ابابیل منڈلانے لگے۔ جب ان کا ریاض بہت بڑھا تو انہوں نے منڈیروں پر بیٹھنا شروع کر دیا اور گھونسلے ڈالنے شروع کر دیئے اور جب تک وہ تینوں زندہ رہیں گھونسلے آباد رہے اور جب اس گھر سے سُر نکل گیا تو یہ گھر بے آباد ہو گیا۔

مجھے یہ سُن کر بڑی حیرانی بھی ہوئی، دکھ سا بھی ہوا اور مجھ سے اس پیچیدگی کی گرہ

بھی نہ کھلی کہ کیا ایسے ہوتا ہو گا۔۔۔۔ اس خاتون نے (اس کا نام خورشید تھا) بتایا کہ عباس صاحب میرے خاوند ہیں۔ میری دو بچیاں ہیں۔ وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ دونوں ہی نرسیں ہیں اور ہم خوش و خرم رہتے ہیں۔"

اس نے بتایا کہ "چونکہ یہ گھر اس آبادی میں ہے اور ہمارا جدّی پُشتی گھر ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتے اور ہم میں سکت نہیں ہے کہ کہیں اور گھر لیں۔ اس لیے ہم رہتے تو یہیں ہیں لیکن ہمارا آبائی پیشہ نہیں رہا ہے۔"

وہ کہنے لگی کہ "اب ہماری 'پر چھتی' کے ایک کونے میں ابابیلوں نے ایک گھر بنایا ہے اور ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ چلو دو ابابیل تو آئے اور ان کی کچھ برکت ہو گی۔"

وہ کہنے لگی کہ "ہم ان دو ابابیلوں کے آنے پر بڑے خوش تھے۔ انہوں نے وہاں انڈے دیئے پھر بچّے نکالے۔ ایک دفعہ شاہی مسجد کے گنبدوں کے پیچھے سے خوفناک کالی گھٹا آئی اور اتنی تیز چلی کہ اس نے یہ سارا علاقہ ہلا کر رکھ دیا اور ان ابابیلوں کا جو گھونسلا تھا وہ ٹوٹ کر نیچے گر گیا۔ اندھیری رات تھی اور وہ ابابیل بھی نہ آئے۔ ان کے جو بچّے تھے وہ ہم نے ایک ڈبّے میں رکھ دیئے اور اس

ڈبّے میں کچھ روئی بھی رکھی کہ اگر ان کے والدین صبح آئے تو سنبھال لیں گے لیکن میرا خاوند مجھے کہنے لگا کہ اس نے قصّے کہانیوں میں پڑھا ہے۔ اگر بوٹ (پرندوں کا ایسا بچّہ جس کے ابھی پر نہ نکلے ہوں) کو آدم بو لگ جائے اور اس کے ماں باپ جان جائیں کہ آدم زاد کا اس کو ہاتھ لگا ہے تو وہ ٹھونگے مار مار کر اسے خود ہی مار ڈالتے ہیں اور وہ تو ایک عام اور اچھے آدمی کا ہاتھ ہوتا ہے اور اے بیوی ہم تو ناپاک لوگ ہیں۔ ہمارا ہاتھ کیا ہمارا سارا وجود ہی ناپاک ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اس کے ماں باپ شاید انہیں اب قبول نہ کریں۔"

وہ کہنے لگی کہ "ہمیں جیسی کیسی عبادت آتی تھی میں اور میرا خاوند کرتے رہے۔ ابھی ہماری بچیاں چھوٹی تھیں۔ ہم خدا سے ہی دُعا کرتے رہے کہ یا اللہ ان جانوروں کو پتہ نہ لگے کہ ہم کیسے اور کون لوگ ہیں اور کس قدر ناپاک لوگ ہیں۔"

اس نے بتایا کہ " صبح ان بوٹوں کے والدین وہ ابابیل آئے۔ انہوں نے اپنی چونچوں میں چوغے (دانا دُنکا) بھرے ہوئے تھے اور وہ آتے ہی ڈبّے میں پل پڑے جہاں ان کے بچّے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہماری دُعا قبول ہو گئی ہے۔"

اس بی بی خورشید نے بتایا کہ "ان ابابیلوں نے ہم پر اس قدر مہربانی کی کہ وہ اکیس برس تک ہمارے گھر آہلنا (گھونسلا) ڈالتے رہے۔ وہ، اُن کے بچّے، ان کے پوتے پوتیاں اور ان کی اگلی نسل۔ وہ سارے یہاں رہے۔"

اس نے بتایا کہ "عباس صاحب کچہری میں نقل نویسی کا کام کرتے ہیں۔ بچّوں نے ایف ایس سی کیا اور ہم نے انہیں نرسنگ کے کام پر لگا دیا ہے کہ چلو مخلوقِ خدا کی کچھ خدمت کریں گی اور گھر میں برکت رہے گی اور جو باقی گھر میں برکت تھی یہ ہمارے ابابیل لائے تھے۔"

وہ کہنے لگی کہ "ابابیل اتنا پاکیزہ پرندہ ہے کہ ہمارے لیے یہ بالکل بابے کا درجہ رکھتا ہے۔"

خواتین و حضرات! اس گھر کے اندر ایک گھرانہ آباد تھا جس کی ایک اپنی سُر اور گرائمر تھی اور اپنا ہی لہجہ تھا۔

اس واقعہ اور ملاقات کے بعد میں ٹی وی پر مصروف ہو گیا اور ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔

پچھلی گرمیوں میں ایک دن اچانک مجھے ان سے ملنے کا خیال آیا کہ وہ کس قدر

محترم اور پاکیزہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کو نئے انداز میں تبدیل کیا ہے۔ میں ان کے گھر گیا تو ایک اور ہی صاحب نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ "یہاں عباس صاحب رہتے تھے؟"

وہ کہنے لگے کہ "جی وہ تو گھر بیچ کر چلے گئے اور شاید انہوں نے جوہر ٹاؤن وغیرہ میں اپنا گھر بنالیا ہے۔"

میں نے ان سے کہا کہ "اگر آپ کو ان کا کوئی ایڈریس معلوم ہو تو بتا دیں۔"

انہوں نے کہا کہ "نہیں ہمیں علم نہیں ہے۔"

میں نے گھر کے نئے مالک سے پوچھا کہ "یہاں ابابیل رہا کرتے تھے؟"

وہ بولا "وہ کیا ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا کہ "ابابیل ایک پرندہ ہوتا ہے۔"

انہوں نے جواب دیا کہ "ہمارے گھر میں ایسی کوئی واہیات نہیں ہے۔ ہم نیک لوگ ہیں۔ ہمارا کیا کام کبوتر بازوں وغیرہ سے۔"

خواتین و حضرات اب مجھے علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہوں گے؟ کہاں رہتے ہیں؟

کیا وہ اکیلے ہی وہاں گئے ہیں یا ان کے ساتھ ان کا وہ پاکیزہ اور مطہر گھرانہ بھی ساتھ گیا ہے۔

الم تر کیف فعل ربک باصحب الفیل ○ الم یجعل کیدہم فی تضلیل ○ و ارسل علیھم طیرا ابابیل○ ترمیھم بحجارۃ من سجیل○ فجعلھم کعصف ماکول○

ترجمہ:۔ شروع اللہ کے نام ہے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کیسا سلوک کیا تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ۔ کیا اس نے ان کی تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا۔ اس نے بھیجے ان پر پرندے غول کے غول جو پھینکتے تھے ان پر پتھر کنکر کی قسم کے، پس کر دیا ان کو گویا بھُس کھایا ہوا۔

ابھی تک مجھے علم نہیں ہو سکا کہ کیا وہ ابابیلوں کو بھی ساتھ لے گئے ہیں یا نہیں لیکن ایک بات جو میں نے بی بی خورشید سے ادیب ہونے کی حیثیت سے کی کہ ”اس معاشرے کا مرد بڑا ظالم ہے۔ وہ کسی ایسے پیشے پر لگا دیتا ہے جس پیشے پر آپ اور آپ کے ساتھی لگے رہے ہیں“

اور یہ بات سُن کر خورشید بی بی کہنے لگی کہ ”ہم آپ ادیبوں اور صحافیوں کا شکریہ

ادا کرتے ہیں جنہوں نے یہ بات پھیلا رکھی ہے کہ زمانے کا دباؤ اور معاشرت کا پریشر اس قدر ہوتا ہے کہ ہم یہ پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔"

اس نے کہا کہ "در حقیقت یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ ہمارے ساتھ ہی ایک لاکھ تیس ہزار اور بیبیاں بھی ہیں جو ایسے ہی پریشر میں بلکہ اس سے بھی زیادہ پریشر میں ہوتی ہیں وہ 'بھانڈے مانجنا' برتن صاف کرنا اور لوگوں کے گھروں میں روٹیاں پکانا قبول کر لیتی ہیں لیکن یہ پیشہ اختیار نہیں کرتی ہیں۔ یہ ہماری اپنی چوائس ہوتی ہے اور اپنی ہی کوتاہی ہے ورنہ ان ایک لاکھ بیس ہزار میں ہم بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ یہ سب دباؤ کے تحت نہیں ہوتا۔"

اس نے کہا کہ "اسلام ان عورتوں پر اور ان کے اگلی دنیا میں درجات بلند ہوں جنہوں نے درست راستے کی چوائس کی۔ جو دکھ سہتی ہیں، مصیبت میں مبتلا رہی ہیں لیکن انہوں نے ایسا رُخ اختیار نہیں کیا جیسا رُخ میں نے میری دوسری بہنوں نے اختیار کیا تھا۔"

خواتین و حضرات! میں سمجھتا ہوں کہ اللہ جس کی روح کو اُجالنا چاہتا ہے یا بھٹی پر چڑھانا چاہتا ہے انہیں ابابیلوں کے جوڑے کو رکھنے کے لیے توبہ کی صلاحیت عطا

کر دیتا ہے۔

یہ ابابیل گرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کی چونچ لمبی اور آواز سریلی ہوتی ہے۔ کمزور سی ہوتی ہے لیکن اتنا بڑا پیغام اور نعمت لے کر ایک گھرانے پر وارد ہو سکتی ہیں اور اس کی کایا پلٹ سکتی ہیں۔

غور طلب بات ہے۔ خداوند تعالیٰ کہتا ہے کہ تم کیوں غور نہیں کرتے۔ میری زمین کی سیر کرو اور باہر نکل کر دیکھو کہ کون کون سی چیزیں تمہیں فائدہ عطا کر سکتی ہیں۔ جس طرح سخت گرمی کے دنوں میں ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آپ کے ہزاروں ائیر کنڈیشنز اور پنکھوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

جو خوش نصیب اور مراعات یافتہ لوگ ہیں وہ اللہ کی طرف رُخ کر کے اور دیوار کے ساتھ ڈھولگا کر استقامت اور خوش دلی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں میں اللہ کی رحمت اور نعمت کو جس روپ میں بھی آئے اسے قبول کرتا ہوں چاہے میں اسے برداشت کر سکوں یا نہ۔

ہم سب کی خواہش ہے کہ ہمارے وجود کے ویرانے میں بھی رحمت کے ایسے ابابیل آکر آباد ہو جائیں اور گھونسلا ڈال لیں اور ایسا گھونسلا ڈالیں کہ پھر وہ ہماری

کئی نسلوں تک چلتا رہے۔

ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ ”جو کوئی آدمی دُعا کے لیے کہے اور تم اس کے لیے دُعا کرنے لگو تو اس کا تصور ضرور ذہن میں لاؤ کہ ایسی اس کی شکل تھی، ایسا اس نے مفلر ڈالا ہوا تھا، ایسی اس کی عینک تھی، ایسے کپڑے تھے اور سوچ کر کہیں کہ یااللہ مجھے اس شخص کا نام تو یاد نہیں ہے یہ معلوم نہیں ہے، تیرے حضور میں دُعا کرتا ہوں کہ اس کی مشکلات دُور کر دے۔ تیری بڑی مہربانی۔“

آپ کی بڑی مہربانی کر آپ تشریف لائے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

(اس ”زاویے“ میں اشفاق صاحب نے ابابیل کو مذکر اور مؤنث دونوں طرح سے لیا ہے۔ اگرچہ ابابیل مؤنث ہے لیکن یہاں جیسے اور جہاں بھی اسے استعمال کیا گیا ہے، بھلا لگتا ہے۔)

وجود کا ”بچّہ جمورا“

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

یہ میں جو اکثر بابوں کی باتیں کرتا ہوں اور ان کے قصّے آپ سے بیان کرتا ہوں اس کا مقصد آپ کو کچھ سمجھانا مقصود ہوتا ہے۔ یہ بابے لوگ جو ہوتے ہیں ان کے جو ڈیرے اور درس گاہیں ہوتی ہیں اور جہاں بیٹھ کر یہ اپنے انداز کے لوگوں کو درس دیتے ہیں۔ ان درس حاصل کرنے والے لوگوں میں ہم آپ جیسے لوگ ہی ہوتے ہیں اور وہ بابے بھی ہم آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں بھی جب غصّے کا موسم آئے غصّہ بھی کر لیتے ہیں اور جب دکھ کا موسم آئے تو انہیں دکھ بھی ہوتا ہے۔ وہ Tragic بھی ہوتے ہیں۔ Comic بھی ہوتے ہیں لیکن فرق صرف یہ ہے کہ انہوں نے انسانی خوبیوں یا خرابیوں کا ازالہ نہیں کیا ہوتا بلکہ ان کا امالہ کیا ہوتا ہے اور انہیں ایک رُخ دیا ہوتا ہے اور وہ ایسا رُخ ہوتا ہے کہ اگر انہیں غصّہ آئے تو جس طرح ہم نے نئی سڑکیں بنائی ہیں اور ان میں پانی

کے نکاس کے لیے نالیاں بنائی ہیں ان بابوں نے بھی اسی طرح اپنی ذات کے اندر ایسے جھرنے چھوڑے ہوئے ہوتے ہیں جن سے غصّہ باہر نکلتا ہے اور دکھ کا کسی طرح امالہ ممکن ہوتا ہے۔ ان ڈیروں پر ایسے معاملات بھی پیش آتے رہتے ہیں جیسے دنیا کی اور درس گاہوں اور اجتماعات پر آتے ہیں۔

ایک دفعہ ڈیرے پر بابا جلال اور حیدر میں بڑی لڑائی ہوئی۔ بابا جلال وہاں سبز کپڑے پہن کر serve کیا کرتے تھے۔ لوگوں کو روٹیاں لا لا کر کھلاتے تھے۔ پانی کا جگ لیے پھرتے تھے جبکہ

حیدر بابا بھاری بھر کم جسامت کے تھے۔ وہ تندور میں روٹی لگاتے تھے۔ اب جو آدمی تندور کے پاس روٹی لگاتا ہے اور آگ پر دیر تک بیٹھتا ہے تو ظاہر ہے اس کے مزاج میں کچھ گرمی آ ہی جاتی ہے۔ وہ بڑی محبّت سے روٹی لگاتے تھے جس سے بہت خوبصورت خوشبو آتی تھی۔ ہم وہ روکھی روٹی بھی کھاتے تھے تو جی خوش ہو جاتا تھا۔

بابا جلال Serve کرتے کرتے اتنے تھک جاتے تھے کہ یقیناً ان کے اندر کوئی ایسی ٹیڑھ پیدا ہونے کا خدشہ موجود رہتا تھا جو کہ اکثر اوقات ہو جاتی ہے۔ اور

ان کی عمر بھی خاصی تھی۔ اس مرتبہ جب بابا جلال اور بابا حیدر کے درمیان جھگڑا ہوا تو اس نے سنگین صورت اختیار کرلی۔ تندور سے روٹی نکالنے والی لمبی سی کھرپی بابا حیدر کے ہاتھ میں تھی۔ وہ گرم بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے غصّے میں وہ تندور سے باہر نکالی اور زور سے بابا جلال پر چلائی۔ وہ خوش قسمتی سے بچ تو گئے لیکن انہوں نے بھی غصّے میں آکر روٹیاں زمین پر پھینک دیں اور وہ روتے ہوئے شکایت کی غرض سے باباجی کے پاس آئے اور ساری بپتا سنائی۔

باباجی نے کہا کہ ہم اس کی سرزنش کرتے ہیں۔ باباجی نے میری ڈیوٹی لگائی کہ "جاؤ تم حیدرو بلا کر لاؤ۔"

میں نے کہا کہ "جی بہت اچھا۔"

اب میں ڈرتے ڈرتے اس کے پاس گیا۔ وہ تندور کے پاس بڑا گرم بیٹھا تھا۔ ایک تو باہر سے آگ دوسرا غصّے میں اس کی طبیعت کے اندر بھی تندور جل رہا تھا۔ میں نے جا کر پہلے تو اسے سلام کیا اور پھر کہا کہ "آپ کو حضور سائیں صاحب بلاتے ہیں۔"

کہنے لگا "اچھا چلو چلتے ہیں۔"

میں نے کہا کہ ”حضور نے مجھے حکم دیا ہے کہ ساتھ لے کر آئیں۔“

کہنے لگا ”اچھا۔“

بابا حیدر حضرت صاحب کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا ”ہاں جی سرکار۔“

لیکن حضرت صاحب سر جھکا کر بیٹھے رہے اور انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر کہا۔ میں نے بھی بابا جی سے کہا کہ ”بابا حیدر آ گئے ہیں۔“

اس پر انہوں نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئے ”یہ تم کس کو لے آئے ہو۔“

میں نے کہا کہ ”جس کو جو آپ نے حکم دیا ہے۔“

کہنے لگے ”نہیں نہیں۔ یہ تو تم اس کا خول اُٹھا لائے ہو، وہ جو اصل اس میں سے بچّہ جمورا نکلا ہوا ہے وہ پکڑ کر لاؤ۔“

میں نے کہا کہ ”حضور یہی ہے بس۔“

وہ فرمانے لگے کہ جب آدمی کا بہت دل تنگ ہو جائے، غصّے میں ہو، شدّت میں

ہو، تو وہ اپنا وجود چھوڑ دیتا ہے اور جب آدمی اپنا وجود چھوڑ دیتا ہے تو برہنہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کے اُوپر کوئی بھی چیز حملہ کر سکتی ہے۔ اپنے بچاؤ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے وجود کے اندر رہیں اور جب آپ کے اُوپر کوئی ایسی بپتا پڑنے والی ہو، کوئی ایسی مصیبت گزرنے والی ہو جس کا اندیشہ ہو تو پھر آپ کو حق پہنچتا ہے کہ ٹٹول کر دیکھیں۔ جس طرح کیلے کے چھلکے کے اندر کیلا رہتا ہے اگر اس کو نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیں تو وہ پھر کیلا نہیں ہے۔ پھر تو اس کی کوئی اور نوعیت ہو گی۔ اس پر پھر کوئی بھی چیز اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اپنے آپ کو بچا کر رکھنے کا راز یہ ہے کہ جب بھی آپ کے اوپر کوئی ایسی افتاد پڑے خاص طور پر غصّے کی حالت میں اور جب آپ بہت گرم ہو جائیں اور آپ ''ہتھل'' ہو جائیں کہ آپ کے پاس کوئی دلیل نہ رہے، تو غور کریں کہ کہیں میں اپنے وجود سے نکل کر باہر تو نہیں کھڑا ہو گیا اور اگر ایسا ہے تو فوراً چھلانگ مار کے واپس وجود میں گھس جائیں۔ جونہی آپ وجود کے اندر یا برہنہ پن سے واپس جائیں گے آپ محفوظ ہو جائیں گے لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ میں آئے روز اخبارات میں پڑھتا ہوں کہ ایک بھائی نے بغیر کوئی دلیل مانگتے بہن کو قتل کر دیا۔ ساس بہو میں صحن میں پانی پھینکنے پر جھگڑا ہو گیا۔

خواتین و حضرات! یہ ساس بہو کا جھگڑا بھی بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ شکر ہے کہ میں کبھی ساس بنا ہوں نہ بہو لیکن مجھے اخبارات سے ضرور پتہ چلتا ہے کہ ساس بہو سے زیادہ ایک اور خوفناک چیز ہوتی ہے اور اسے نند کہتے ہیں۔ ساس تو پھر بھی معاف کر دیتی ہے۔ نندیں معاف نہیں کرتیں۔ یہ کس لیے سب ہوتا ہے، وجہ ساری وجود سے باہر آنے کی ہے۔ بہو بھی وجود سے باہر آ جاتی ہے اور ساس بھی باہر نکل کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

اب میں نے بابا حیدر سے کہا کہ بھائی صاحب واپس چلیں۔ وہاں جا کر ہم بیٹھے رہے۔ بابا حیدر کا غصّہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ میں نے بھی انہیں بابا جلال کو معاف کر دینے کی درخواست کی اور کہا کہ خدا کے واسطے آپ اپنی "ڈانگری" پہن لیں وجود کی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں پھر ان کی انگلی پکڑ کر باباجی کے پاس گیا۔ اب بابا حیدر اپنے وجود کے اندر تھے اور انہوں نے آتے ہی باباجی سے کہا کہ سرکار مجھ سے غلطی ہو گئی معافی دے دیں۔

خواتین و حضرات! وجود کے اندر جانے سے آدمی کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا

ہے کہ اس کی عقل اس کا ساتھ دینے لگتی ہے وگرنہ نہیں دیتی۔ ہمارے ہاں ایک اکبر کوچوان ہوتا تھا۔ یہ ہمارے کالج کے زمانے کی بات ہے۔ وہ بڑا ذہین سا آدمی تھا۔ اسے سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اکثر اوقات کارپوریشن کے اندر جو میٹنگز ہوتی تھیں، ان میں ضرور جایا کرتا تھا۔ ہم اس سے کالج میں پوچھتے کہ "اکبر یار تیرا وہاں کیا کام۔ وہاں تو باتیں اردو انگریزی میں ہوتی ہیں۔"

وہ کہنے لگا "بھاجی میں وہاں بہت کچھ سیکھتا ہوں اور آدمی کو ایسی باتیں سُن کر بڑی عقل آتی ہے۔ آپ کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ آپ لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہاں جا کر سُنا کریں۔ ہم نے کہا کہ تمہیں وہاں پر سمجھ کیا آتی ہے۔"

وہ کہنے لگا کہ "جی میں وہاں فیصلہ دینے جاتا ہوں کہ کون سی بات ٹھیک ہے اور کون سی بات غلط ہے۔"

میں نے کہا "بابا تم کیسے پتہ کر لیتے ہو۔"

ہمارے ساتھ ایک لڑکا نریندر ہوا کرتا تھا۔ وہ بہت ذہین تھا۔ وہ اس سے کہتا کہا کہ "اکبر تم کو کیسے پتہ چلتا ہے کہ کیا صحیح اور کیا غلط ہے۔ تم پڑھے لکھے تو ہو نہیں۔"

تو وہ کہنے لگا کہ "جی جو پارٹی میز پر مکے مارتی ہے اور اس کا چہرہ لال سُرخ ہو جاتا ہے۔ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے، وہ غلط ہوتی ہے اور دوسری ٹھیک ہوتی ہے۔" بات پھر وہیں وجود کے اندر رہنے اور باہر نکلنے والی ہی ہے۔ جو وجود سے باہر نکل کر "ٹپوسیاں" مارتے ہیں یا کیلے کی طرح چھلکے سے باہر جاتے ہیں، وہ غلط ہوتے ہیں۔ اس جانب توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب ہم شروع میں ڈیرے پر جاتے تھے تو وہاں مختلف قسم کے لوگ آتے تھے۔ ناچنے گانے والے اور ہم ان کی تصویریں بنایا کرتے تھے۔ اس وقت بابا جی کہا کرتے تھے کہ دیکھ کیمرہ اپنے کیس میں زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ سارنگی یا ساز جو ہے وہ اپنی تھیلی یا غلاف میں زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔ تلوار اپنی میان میں زیادہ بہتر ہے۔ اگر یہ چیزیں باہر آ جائیں گی تو خدشہ اور خطرہ ہے کہ ان پر اس فضا کا اثر پڑے جس میں آپ نے انہیں کھول کر رکھا ہوا ہے۔ جونہی آپ کے اوپر ایسی کیفیت وارد ہو۔ ٹھیک ہے کنٹرول کرنا مشکل ہے۔ میں کنٹرول کرنے کے لیے نہیں کہتا لیکن آپ کو ضرور پتہ لگنا چاہیے کہ یہ میرا Case تھا اور میں اس سے اب باہر نکل چکا ہوں یا چکی ہوں اور میرا اپنے وجود کے اندر رہنا بہت ضروری ہے۔

میں آپ پر یوں بھی زور زیادہ دیتا ہوں کہ آپ کا جو قومی مزاج ہے وہ ذرا سا تیز

ہے۔ دوسری قوموں کے مقابلے میں اور جب گھبراہٹ کا موقع آتا ہے تو آپ جلدی گھبرا بھی جاتے ہیں۔ پھر جب کوئی دباؤ پڑتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ ہم مجتمع ہو کر اس دباؤ سے بچنے کے لیے یہ کام کریں گے جس میں ڈسپلن ہو گا۔

قائد اعظم محمد علی جناح نے جب یہ کہا کہ "Unity, Faith and Discipline" اس وقت ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہم نے کہا کہ قائد اعظم نے جو اتحاد بارے کہا ہے تو ٹھیک ہے اس کی ضرورت ہے اور ایمان بھی لیکن یہ جو ڈسپلن ہے یہ کیا فضول بات ہے۔ ہم کوئی فوجی ہیں یا وردی میں ہیں لیکن اب جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے میں سوچتا ہوں کہ اتحاد اور ایمان تو بعد میں آئے گا، ڈسپلن کی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں شدّت سے ضرورت ہے۔ ہم دوسری قوموں کے مقابلے میں ذرا اپنے خول سے جلدی باہر آجاتے ہیں۔

جب ہم کرکٹ میں کسی دوسری ٹیم سے پِٹ رہے ہوتے ہیں اور ہمارا باؤلر بال کرنے جاتا ہے تو ساری قوم اس کے بال پھینکنے تک ہو وووو۔۔۔۔ کرتی ہے۔ ایسا اور کوئی قوم نہیں کرے گی۔ آپ نے بھی یہ بات دیکھی ہو گی وہ باؤلر پوری توجّہ مانگ رہا ہوتا ہے۔ جب ہم لوگوں سے کہتے ہیں کہ قائد اعظم نے ہمیں ڈسپلن کا کہا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ جب وقت پڑے گا تو دیکھ لیں گے۔

خواتین و حضرات! جب وقت پڑتا ہے تو ان کا رویہ سلطان راہی کی طرح کا ہوتا ہے۔ وہ جس طرح پنجابی فلموں میں گنڈاسا پکڑے کسی چیز کو خاطر میں نہیں لا رہے ہوتے ہیں ویسے ہی ہم کرتے ہیں۔ زندہ قوموں پر جوں جوں وقت پڑتا ہے وہ زیادہ مہذب، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ خیال کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہیں۔

بدقسمتی سے ہماری اس طرح کی ٹریننگ ہوئی ہی نہیں ہے۔ پی ٹی وی کی بھی ذمّہ داری تھی کہ وہ اپنا کردار ادا کرتا۔

ہمارے بابے جو ہیں وہ بہت شدّت کے ساتھ اس بات کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کا ڈسپلن سکھانے کا ایک اپنا ہی انداز ہوتا ہے۔ وہ جوتا اُتارنے میں بھی ڈسپلن کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ ڈیروں پر جوتے رکھنے کا ایک الگ انداز ہوتا ہے۔ جب وہاں سے باہر نکلتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے کہ کسی شخص نے سارے جوتے درست سمت میں سیٹ کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کھانے میں ڈسپلن سکھایا جاتا ہے۔

لاہور میں الحمراء آرٹ کونسل ہے جہاں ڈرامے وغیرہ ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہاں پر ایک بڑی سی سفید رنگ کی اور ایک نیلے رنگ کی گاڑی آپس میں ٹکرا

گئیں۔ ٹکراؤ زیادہ خوفناک بھی نہیں تھا۔ گاڑیاں رُک گئیں۔ ایک گاڑی میں ایک میرے جیسی داڑھی والے لحیم شحیم مولوی صاحب برآمد ہوئے، جبکہ دوسری سے ٹائی سوٹ والے صاحب باہر نکلے اور آپس میں نہایت سخت الفاظ کا تبادلہ کرنے لگے۔ لوگ بھی اکٹھے ہونا شروع ہوگئے۔ لوگوں کو بغیر پیسوں کے ہی دیکھنے کو ڈرامہ مل گیا۔ کیونکہ ہال کے اندر تو پیسے دینے پڑتے ہیں۔ اب جو مفت ڈرامہ مل رہا ہے تو جی اُسے کون چھوڑے۔ میں بھی وہاں کھڑا ہو گیا۔ وہاں سفید گاڑی سے جو نیلی گاڑی ٹکرائی تو اس پر نیلا رنگ آگیا۔ وہاں ایک ایسا شخص کھڑا تھا جو کامیڈی ڈراموں میں ایکسٹرا کا رول کرتے ہیں۔ وہ دور تماشہ دیکھتا رہا اور کار والے مولوی صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگا "مولوی صاحب یہی وہ مقام ہے جہاں دین اور دنیا ملتے ہیں۔"

اب دونوں صاحبان نے اپنا اصل وجود اپنی موٹروں میں رکھ دیا تھا اور وہ برہنہ ہو کر بغیر چھلکے کے کیلوں کی طرح باہر آ کر لڑنے لگے۔ بجلی کے تار جب تک اپنے خول میں رہتے ہیں اچھے ہوتے ہیں، خدمت کرتے ہیں۔ پنکھے چلاتے ہیں، ہوا دیتے ہیں، روشن کرتے ہیں، لیکن جب باہر ہوتے ہیں تو جان کا نقصان کرتے ہیں۔ خرابی ہمیشہ پیدا ہوتی ہے جب انسان کو اپنی ذات پر اختیار نہیں رہتا اور وہ

اپنے قالبوت سے باہر آجاتا ہے۔ جو اپنی بے چینی کی کیفیت میں اپنے اوپر تھوڑا سا اختیار مضبوط رکھتا ہے، وہ زندگی میں ضرور کامیاب رہتا ہے اور اس کا مشکل وقت چلا جاتا ہے۔ اس حوالے سے مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔

ایک دفعہ ایک چور ایک گھر میں آگیا۔ اس گھر کی مالکن بڑی موٹی تھی اور دو اڑھائی من کی تھی اور جو اس کا خاوند تھا وہ دُبلا پتلا تھا۔ چور جب آیا تو اس کے قدموں سے تھوڑا کھڑکا یا شور پیدا ہوا۔ اسی اثنا میں اس موٹی عورت کی آنکھ کھل گئی اور وہ اپنی چارپائی سے اُٹھی اور کہا کہ تیری ایسی کی تیسی۔ اس نے چور کو بازو سے پکڑا اور وہ چور بیچارہ پھسل کر زمین پر جونہی گرا وہ عورت اس کے اوپر بیٹھ گئی۔ اب اس کا بیٹھنا تھا کہ چور کی چیخیں نکل گئیں۔

اس عورت نے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنے دبلے پتلے خاوند سے کہا کہ جلدی سے پولیس کو لے کر آؤ۔ خاوند جلدی سے اپنا جوتا تلاش کرنے لگا کبھی ایک کمرے میں جا کے تو کبھی دوسرے میں۔

اس کی بیوی کہنے لگی کہ میں نے تمہیں تھانے جانے کو کہا ہے اور اِدھر بھاگے پھرتے ہو۔

اب وہ بیچارہ ویسے ہی بھاگم بھاگ میں لگا رہا لیکن باہر نہ گیا۔ چور بے چارہ بھی آخری دموں پر تھا۔ اس کی بیوی نے چیخ کر کہا کہ تم جاتے کیوں نہیں۔

خاوند نے جواب دیا کہ وہ اپنا جوتا تلاش کر رہا ہے جو اسے نہیں مل رہا ہے۔

اس پر وہ چور جو دبا پڑا تھا بولا "بھا جی یہ میرا جوتا پہن لو اور جلدی جاؤ۔"

اس نے اس لیے کہا کہ یہ جلدی جائے اور اس کی موٹی عورت سے جان چھوٹے۔ اب اس چور کو پولیس سے خوف کم اور اس موٹی عورت سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا جو اس کے اوپر بیٹھی تھی۔

خواتین و حضرات! اس چور نے موٹی عورت سے کہا کہ آپا جی ذرا اُٹھنا میں اپنا جوتا دے

دوں اور وہ اُٹھ بیٹھی۔

اس لطیفے میں اصل بات یہ وہ چور حواس باختہ نہیں ہوا تھا اس نے اپنے وجود پر قابو پایا ہوا تھا۔ اگر اس کے برعکس ہوتا تو یا موٹی عورت تلے پڑا مر جاتا یا پولیس پکڑ کر لے جاتی۔

اگر ہم اپنے وجود کو قالبوت کا قیدی کر لیں تو بڑی آسانیاں ہیں۔ آپ جونہی وجود سے نکلیں گئے مشکلات آئیں گی۔ آپ ضرور تجربہ کر کے دیکھئے گا۔ آپ کے آنے کا بھی شکر اور ناظرین کی بھی بڑی بڑی مہربانی کہ آپ بھی توجّہ اور محبّت سے پروگرام کو دیکھتے ہیں، سنتے ہیں۔ اس کا دَین تو میں دے ہی نہیں سکتا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ بڑی آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے اور یہ شرف بھی عطا فرمائے کہ ہم اپنے وجود کے بچّے جمورے کو قابو کر سکیں اور اسے باہر نہ نکلنے دیں۔ اللہ حافظ۔

"ڈبو" اور "کالو"

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

یہ بابے جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں اور جن سے آپ کم واقف ہیں لیکن ان کے نام آپ جانتے ہیں، یہ بڑے ہنس مکھ، خوش طبع اور بذلہ سنج قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو زندگی میں کوئی ایسا بابا ملے جو طبیعت کا سخت اور مزاج کا گرم اور سخت گیر ہو تو سمجھئے گا کہ وہ بابا نہیں ہے۔ اس نے یہ پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ بھلے وہ طبیعت کا اچھا ہی انسان ہو۔ باہوں میں تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچانے کی اللہ نے ایسی صلاحیت دی ہوتی ہے کہ بعض اوقات حیرانی ہوتی ہے۔ یہ چھوٹی سی بات سے اتنا بڑا نتیجہ کیسے اخذ کر لیتے ہیں۔ انسان یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہے۔ انہیں اچھی بات، اچھا وجود، اچھے چہرے، اچھا موسم، اچھے پرندے، اچھا وقت اس قدر مرغوب ہوتا ہے اور اتنا مطلوب ہوتا ہے کہ وہ اسے اپنی زندگی کے دائرے سے باہر جانے ہی نہیں دیتے ہیں۔ میں اپنے بابا جی

کو اپنے بچپن کے واقعات سُنایا کرتا تھا۔ انہیں میرا ایک واقعہ ایسا پسند تھا کہ انہوں نے دو تین چار مرتبہ فرمائش کر کے سُنا اور جب ڈیرے پر نئے لوگ آتے تھے تو وہ مجھے وہ والا واقعہ سُنانے کا ضرور حکم دیتے اور مجھے اندیشہ ہوتا تھا کہ میں اس میں کہیں کسی ایسے مقام پر پھسل نہ جاؤں کہ مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہو اور ڈر رہتا کہ کہیں بیان کرنے میں کوئی کسر رہ نہ جائے۔ ایک دفع فیصل آباد اور ساہیوال کے کچھ جاگیر دار قسم کے لوگ ڈیرے پر آئے ہوئے تھے۔ تو مجھے بابا جی نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اشفاق وہ واقعہ سُنائیں جب آپ چھوٹے ہوتے چٹھی رساں کے ساتھ چلتے تھے۔

خواتین وحضرات! مجھے یاد ہے اس وقت میری عمر کچھ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ کوئی چار سال ہوگی۔ ابھی سکول داخل نہیں ہوا تھا لیکن مجھ میں ہوش کے آثار اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ تھے اور جو Photographic Images میرے تصرف میں آتے وہ ذہن سے جاتے نہیں تھے۔ ہمارے گاؤں کی طرف جو راستہ آتا تھا وہ سُرخ اینٹوں کا تھا اور میرے والد صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ سڑک نہیں ہے بلکہ یہ سولنگ بنائی گئی ہے۔ ہم بڑے خفیف اور شرمندہ ہوتے تھے اور میرے والد ہمیشہ اونچے شملے والی پگڑی باندھ کر

بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ سڑک ہم نے دیکھی ہے۔ دوسری طرف میں، میرے بہن بھائی اتنے بدنصیب تھے کہ ہم اکثر سوچا کرتے کہ جانے سڑک کیسی ہوتی ہے۔ اس زمانے میں سڑکیں کم ہی ہوا کرتی تھیں۔ ہم اس زمانے میں سولنگ (سُرخ اینٹوں کو منظم انداز سے کھڑا کر کے بنایا گیا راستہ) تک ہی ہم ابھی پہنچے تھے۔ وہ انگریز کا دور تھا۔ وہ ذرا تیزی سے کام کرتے تھے۔ انگریز کو اس بات کا بڑا شوق تھا اور وہ ڈاک کے نظام پر خصوصی توجّہ دیتا تھا اور پوسٹل سسٹم کی بہتری اس کی ترجیحات میں شامل تھی اور اس نظام کو مؤثر بنانے کے لیے سڑکوں اور بہتر راستوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا وہ جلدی میں پکی سڑک کی جگہ سولنگ بنوا دیتا تھا کہ ڈاک کا نظام متاثر نہ ہو۔ وہ ڈاک کے نظام کو کامیاب اور ترقّی یافتہ دیکھنے کا خواہاں رہتا تا کہ دور دراز کے لوگوں کا ضلع کے ساتھ رابطہ قائم کرے۔ ظاہر ہے انہیں اس طرح سے حکمرانی میں آسانی ہوتی ہو گی۔

ہمارا گاؤں اچھا خاصا بڑا تھا۔ اس کا بازار بھی بڑا تھا اور میرا خیال ہے، اس کون حق پہنچا تھا کہ اس کی طرف آنے والی سڑک کی اور سرمئی رنگ کی ہوتی لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس سولنگ والی سڑک پر ایک بس ہمارے گاؤں آیا کرتی تھی۔ ہم اس بس کو لاری کہتے تھے۔ لاری کو آپ پرانے زمانے کی شور مچاتی

ہوئی بس کہہ سکتے ہیں۔ اس لاری کے ڈرائیور کو یہ خاص حکم تھا کہ اس کی سپیڈ تیز نہیں کرتی۔ اگر پچیس میل فی گھنٹہ سے اس کی رفتار تیز ہو جاتی تو چالان کر دیا جاتا تھا اور سرکاری ملیشیا اس ڈرائیور کو خارج کر دیتی تھی۔ اس طرح وہ پرانی سی لاری مسافروں سے لدی پھدی روتی پیٹتی گھڑ گھڑ کرتی آتی تھی۔ صبح دس بجے کے قریب گیڈر بار، ڈوڈا کالونی سے چلتی تھی کیونکہ وہاں ایک بڑا کارخانہ تھا اور وہاں سے ایک ڈاکیا ڈاک کا تھیلا لے کر ہمارے گاؤں اس لاری سے آیا کرتا تھا۔ وہ لاری مسافر اُتار کر ہمارے گاؤں سے آگے چلی جاتی تھی اور پھر وہ شام کو لوٹی تھی تو ہمارا ڈاکیا یا ہرکارہ اس میں بیٹھ کر واپس چلا جاتا تھا۔

جب ہمارے گاوں وہ ڈاکیا ڈاک لے کر آتا تو اس کے کندھے پر ایک تو تھیلا لٹکا ہوا ہوتا تھا۔ خاکی وردی اس نے پہنی ہوئی اور ایک چمڑے کا بیلٹ اس نے سینے سے کمر کی طرف باندھا ہوتا تھا اور وہ بڑی شان سے چلتا تھا۔ جب وہ بس سے اُترتا تو ہمارے گاؤں کا ایک دکاندار جس کا نام سردول سنگھ تھا اسے سب ”سردول سنگھ وڑیوں والا“ کہا کرتے تھے۔ وہ مویشیوں کے لیے کھل بنولا، بھوسہ اور چوکر وغیرہ بیچتا تھا۔ اس ڈاکیے کا نام سلطان تھا۔ جب وہ سلطان ڈاکیا لاری سے اُتر کر آتا تو سردول سنگھ اونچی آواز میں ہاتھ لہرا کر کہتا تھا کہ

سبحان اللہ سلطان

تیری سب توں اُونچی شان

تیرا اللہ نگہبان

بسم اللہ جی آیاں نوں سلطان

وہ سلطان چٹھی رسان کو دیکھ کر نظم پڑھتا اور سلطان اسے سلام کرتا ہوا اس کی دُکان میں آ جاتا۔ اس دُکان کے سامنے ایک سبزی فروش کا چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر سلطان چٹھی رساں اپنا وہ خوبصورت سا تھیلا رکھتا۔ اس میں سے خطوط کے دو بڑے بڑے پیکٹ نکالتا اور انہیں رسی سے الگ الگ باندھ دیتا جبکہ اپناڈاک کابڑاتھیلاسبزی فروش کے پاس رکھ دیتا۔

خواتین و حضرات !جب وہ ڈاکیا وہاں سے چلنے لگتا تو دو کتّے ''ڈبو'' اور ''کالو'' اس کے پاس آ جاتے۔ ڈبو کی کمر پر ایک چٹاخ کانشان تھا جبکہ کالو کالے رنگ کا تھا۔ وہ دونوں آوارہ کتّے تھے لیکن انہیں جانے کیسے پتہ چل جاتا کہ سلطان چٹھی رساں لاری سے اُتر چکا ہے اور وہ وہاں پہنچ جاتے۔ ڈبو ڈاکیے کے دائیں جانب جبکہ کالو اس کے بائیں آ کر بیٹھ جاتا۔

وہ ڈاکیا ان دو پیکٹوں میں سے ایک ڈبو کے مُنہ میں دے دیتا تو دوسرا پیکٹ کالو کو دے دیتا۔ دونوں آوارہ کتّوں میں معلوم نہیں اس قدر نظم، تابع فرمانی اور اطاعت و سلیقہ کہاں سے آ جاتا کہ وہ اپنے اپنے پیکٹ اُٹھائے چل پڑتے جبکہ سلطان چٹھی رساں ان دونوں کے درمیان میں چلتا۔ دائیں ہاتھ کی جتنی بھی آبادی تھی اس کی چٹھیاں پہلے تقسیم ہوتیں اور ہر گھر پر کھڑے ہو کر ڈاکیا کالو کے مُنہ سے پیکٹ لیتا، خط چھانٹ کے دیتا اور پھر اسے باندھ کر کالو کو دے دیتا۔ جب آخر تک پہنچ جاتے پھر واپسی پر ڈبو کے پیکٹ کی باری ہوتی اور ڈبو بھی احسن انداز میں اپنی ڈیوٹی دیتا۔ دونوں نہایت با ادب انداز میں خطوط ختم ہونے پر ڈاکیے کے قریب دُم سمیٹ کر بیٹھ جاتے۔ وہ ان کتّوں کو کیا دیتا تھا، ان کے ساتھ کیا شفقت برتتا تھا، میں نہیں جان سکا۔ میں تو اس وقت چھوٹا تھا لیکن بہت متجسس تھا اور کتّوں کی اس کے سامنے تابع فرمانی دیکھ کر ہم سلطان کو اپنا ہیرو سمجھتے تھے۔

جس طرح آپ کی فلموں کے ہیرو اور ہیروئن شان ریما وغیرہ ہیں اسی طرح ہمارے گاؤں کا شان جو تھا وہ سلطان چٹھی رساں تھا اور ہم سارے اس کی محبّت میں مبتلا تھے۔ وہ بڑائی شفیق انسان تھا۔ وہ سر پر طرے والی پگڑی باندھتا تھا۔ وہ

خط تقسیم کر کے باقی ماند خطوط تھیلے میں واپس رکھ دیتا۔ تھوڑی دیر وہاں سستاتا۔

خواتین و حضرات! جب تک اس کی لاری نہیں آجاتی اس وقت تک وہ دونوں کتّے کالو اور ڈبو اس کے حضور میں نائب قاصد کی طرح بیٹھے رہتے اور وہ اس کے جانے تک اپنی جگہ سے ہلتے نہیں تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ بڑی زور کی آندھی چلی اور ہمارے گاؤں کے درخت بہت زور سے کھڑکھڑائے اور شراٹے دار ہوا چلی۔ میری نانی جو تھیں، وہ چھوٹے قد کی بہت پیاری خاتون تھیں۔ ان کے پاس تین جوڑے ہوتے تھے۔ ایک وہ دھو کر سوکھنے کے لیے ڈال دیتیں، ایک پہنا ہوا ہوتا تھا جبکہ ایک انہوں نے اپنے تکیے کے نیچے رکھا ہوا ہوتا تھا اور میری نانی اس زمانے میں بھی کپڑے استری کے بغیر نہیں پہنتی تھیں۔ ان کے پاس ایک سلور کا لوٹا اور ایک تسبیح تھی۔ وہ اس آندھی کی بابت کہتی تھیں کہ یہ بڑی خوفناک آندھی آئی ہے۔

وہ میرے ابّا جی سے کہتیں کہ "کاکا ضرور کہیں کوئی قتل ہو گیا، کوئی بندہ مر گیا ہے۔" جواب میں ابّا جی نے کہا کہ "نہیں خالہ، کوئی قتل نہیں ہوا سب اللہ کا فضل ہے۔"

لیکن وہ اپنے مؤقف پر قائم رہتیں۔ ان کا ڈر ان کی زندگی کا ایک خاصا تھا۔ وہ انسان کے بارے میں بہت زیادہ محسوس کرتی تھیں۔ اس زمانے میں کوئی قتل تو ہوتا ہی نہیں تھا۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسی بات ہوتی۔ اس زمانے میں تعلیم بھی اتنی عام نہیں تھی۔ جب تعلیم عام ہوئی اور اخبار چھپنے لگے تو اب ماشاء اللہ (طنزیہ انداز میں) بارہ چودہ قتل روز پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ ابّا نے امّاں سے کہا کہ کوئی قتل نہیں ہوا لیکن اُن کے دل کو بے چین تھی اور وہ کہنے لگیں کہ ”کسی انسان پر ضرور کوئی حادثہ گزرا ہے۔“

خواتین و حضرات! اگلے دن جب لاری رُکی تو ڈاک کا تھیلا لے کر جو چٹھی رساں اُترا اس کا نام عبد الرّزاق تھا اور وہ سلطان نہیں تھا۔ اس نے آکر ویسے ہی اپنا تھیلا سبزی فروش کی دُکان پر رکھا، ویسے ہی اس نے دو پیکٹ نکالے جیسا کہ اس کے کولیگ نے اسے بتایا تھا۔ سردول سنگھ دوڑیوں والے نے کہا کہ ”سلطان نہیں آیا۔“ اس نے بتایا کہ رات اچانک حادثہ گزرا اور پتہ نہیں اس پر کسی بیماری کا حملہ ہوا اور وہ فوت ہو گئے ہیں۔ اور انگریز کا یہ اصول ہے کہ ڈاک نہیں رُکنی چاہیے تو اب اس ڈیوٹی پر میں حاضر ہو گیا ہوں۔ اس نے بتایا کہ سلطان میرا سینئر تھا۔ میں اس کے ساتھ دو تین مرتبہ یہاں ڈاک تقسیم بھی کر چکا ہوں۔ مجھے کالو اور

ڈبو کا بھی پتا ہے۔ وہ بڑی دیر تک بیٹھا کالو اور ڈبو کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئے۔ پھر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں تو لوگوں نے کہا کہ ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔ کل رات تک تو وہ یہاں تھے پھر علم نہیں کدھر چلے گئے۔

خواتین و حضرات! جب سلطان کے ساتھ وہ حادثہ گزرا ہو گا تو پتہ نہیں انہیں کیسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اب وہ ہمارا محبوب یار یہاں سے جا چکا ہے۔ اب ہمارا بھی اس علاقے میں رہنا ممکن نہیں۔ غالباً انہوں نے ایسا ہی خیال کیا ہو گا۔ ڈبو اور کالو کو لوگوں نے بھی تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملے۔ چٹھیاں تو بعد میں بھی تقسیم ہوتی رہیں لیکن اس گاؤں کی ساری رونق اور ردھم اور محبّت کی ایک زندہ داستان تھی وہ معدوم ہو گئی۔

میں جب باباجی کے حکم پر کہانی سُنا چکا تو پھر باباجی کہتے کہ دیکھ اس میں بھی ایک راز ہے کہ جب تک ایک شخص جو کہ سلطان چٹھی رساں کے نام سے ایک سیدھی سڑک پر چلنے والا تھا اس کی حفاظت کے لیے دائیں اور بائیں دو خیال چلتے تھے۔ وہ بتاتے کہ دھیان، خیال اور مراقبہ ایک ہی چیز کا نام ہے اور وہ دھیان جو ہے وہ آپ کی حفاظت کرتا ہے۔ دھیان کالا بھی ہوتا ہے، دھیان سفید بھی ہوتا ہے، یہ چتکبرا بھی ہوتا ہے اور ڈبہ بھی لیکن جب ایک آدمی تہیہ کر لیتا ہے اور وہ

اُونچی آواز میں پکار کر کہتا ہے کہ "اہدنا الصراط المستقیم" تو پھر اس کو سیدھا راستہ دکھایا جاتا ہے۔ جو خود اپنی کوشش کرتا رہتا ہے کہ میں سیدھے راستے کو بنالوں گا یا بنالوں گی یا میں اتنا وظیفہ کر کے حقیقی راستے کو ڈھونڈلوں گی اور وہ پکار نہیں ہوتی۔ جیسے جہانگیر بادشاہ کے ایوانِ عدل میں زنجیر کھینچ کر گھنٹی بجائی جاتی تھی اسی طرح جب تک اللہ کے دربار میں زنجیر کھینچ کر گھنٹی نہیں بجائی جائے گی اور بڑے چاؤ اور مان کے ساتھ نہیں کہا جائے گا کہ دکھا مجھ کو سیدھا راستہ میں تو اندھا اور بے کار ہوں۔ میں توان پڑھ ہوں۔ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ اب یہ تیری ذمّہ داری ہے کہ مجھے سیدھا راستہ دکھا۔ اے اللہ میری کمزوریاں تو تجھ پر عیاں ہیں۔ بابا جی کہتے کہ اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کی کوشش مت کریں۔ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں۔

آپ نوجوان ہیں۔ آپ نے گاؤں میں بڑھے بابوں کو دیکھا ہو گا۔ وہ صبح سویرے کھیس کی بکل (موٹی چادر اوڑھ کر) مار کے باہر دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے ہوتے ہیں اور جب ان کا کوئی پوتا پوتی پاس سے گزرتی ہے تو جھپٹ کر پکڑ لیتے ہیں اور گود میں بٹھا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تیری ماں کو تو کچھ عقل ہی نہیں ہے۔ شکل دیکھی اپنی، مُنہ بھی نہیں دھویا ہوا اور وہ اپنے اس کھیس کو تھوک لگا لگا کر

اس پوتے یا پوتی کا چہرہ صاف کرتے رہتے ہیں، جس طرح بلّی اپنے بلونگڑے کو چاٹ کر خوبصورت بنا دیتی ہے۔ وہ دادا بھی اپنے پوتے یا پوتی کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ ایسے ہی جب آپ خدا کی حضوری میں یا اس کی جھولی میں چلے جاتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں کہ مجھے آپ ہی عطا کرو۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں۔ میں اپنی خود صفائی نہیں کر سکتا تو پھر یقیناً خدا کی خاص توجّہ ملتی ہے۔ جب سلطان ایک راستہ اختیار کر کے ایک سیدھی راہ پر چلتا ہے تو پھر اس کو دونوں طرف سے مدد پہنچتی ہے۔

بابا جی کہتے تھے کہ "یہ سلطان نہیں یہ دھیان ہے اور یہ دھیان نہیں، یہ مراقبہ ہے کیونکہ دھیان کے بغیر آپ کچھ نہیں ہیں۔"

خود زور لگانے یا اپنے بوٹ کے تسمے پکڑ کر زور سے کھینچنے سے آپ اپنے آپ کو ہوا میں نہیں اُٹھا سکتے۔ اس کے لیے جسم کو ڈھیلا چھوڑنے کی ضرورت ہے۔ کوئی دوسرا آپ کو بانہوں میں اُٹھا کر اُونچا اُچھالے گا تو ہی آپ ہوا میں جائیں گے، لیکن اپنا زور لگا کر نہیں۔ اپنا زور اس قدر ہے کہ جو آپ کو بتا دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق آپ پکار کر کہیں گے کہ مجھے تو یہ چیز عطا کی جائے۔ میں اس عطا کا طلبگار ہوں تو بات بنے گی۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری چاہتوں میں اور کئی چاہتیں مل

جاتی ہیں اور وہ چاہت ماند پڑ جاتی ہے جس کے لیے ہم یا کوئی اور انسان اتنی ساری خواہش لے کر دنیا میں آیا ہے۔

اور اگر دیکھا جائے تو آدمی کے ساتھ ہوتا کیا ہے۔ وہ نہ کچھ ہوتا ہے۔ زندگی میں کچھ پاتا ہے۔ بس آتا ہے اور جاتا ہے اور اگر آدمی کا آنا اور جانا اسی طرح سے ہے جس طرح کہ ہمارا لگا ہوا ہے تو پھر اشرف المخلوقات ہونے کا کوئی مزہ نہیں آتا۔ مزہ تو تب ہے کہ ہم ان جانوروں سے جو کہ بہت نچلی سطح پر ہیں، اُوپر ہو کر رہیں۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ وہ جانور جو ہم سے بہت نچلی سطح پر ہیں، اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق چلے جاتے ہیں، گاتے جاتے ہیں، کسی پرندے کو کینسر یرقان کا خوف نہیں۔ اسے گانا آتا ہے۔ وہ ہم سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ اس کا رجوع اللہ کی طرف زیادہ ہے۔ میری یہ بڑی تمنّا ہے کہ ہم بھی اپنا رجوع اللہ سے کر لیں، جس کا ہم نے اللہ سے وعدہ کیا تھا لیکن ہم ہر معاملے میں ناشکرے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم کوئی اپنی مرضی سے تو پیدا نہیں ہوئے۔ میں جب پیدا ہوا تو میں نے خدا سے کہا کہ نہیں میں نے نہیں جانا۔ وہاں گرمی بڑی ہے، دھول ہے، لیکن حکم ہوا کہ نہیں جانا پڑے گا۔ تو میں نے کہا کہ چلیں اچھا لیکن مجھے اگر جانا ہی ہے تو اے آر وائی گولڈ کے گھر پیدا کرتا لیکن مجھے ایک

معمولی سے ڈاکٹر کے گھر پیدا کر دیا جو پانچ روپے فیس لیتا تھا۔ یہ بھی خرابی ہوئی۔

پھر میں نے اللہ میاں سے کہا کہ مجھے پیدا ہی کرنا ہے تو مجھے فروری میں پیدا کرنا، ذرا موسم اچھا ہوتا ہے۔ اس میں زچہ بھی اچھی رہے گی اور بچّہ بھی لیکن مجھے اگست میں پیدا کر دیا گیا۔

میری ماں کہتی ہے کہ تو نے گرمی کے گندے موسم میں پیدا ہو کر مجھے بہت ستایا ہے۔ پھر میرے ساتھ ایک اور زیادتی ہوئی کہ مجھ سے پوچھے بغیر میرا نام رکھ دیا گیا۔ مجھے کنسلٹ کرنا چاہیے تھا کہ "کاکا جی تہاڈا کیہہ ناں رکھیے۔" اب ایک تاریخ ایسی آئے گی جس تاریخ کو مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔

ہمارے یہ رویّے عجیب طرح کے ہیں۔ رجوع اللہ کی طرف نہیں ہے، اپنے معاملات اور خواہشات کی طرف زیادہ ہے۔ حالانکہ اللہ نے ہمیں جو پرچہ زندگی حل کرنے کے لیے دیا ہے اس کو حل کرنے کی ترکیب نبی اکرم ﷺ کے ذریعے ہمیں دے دی گئی ہے لیکن اسی مقام سے میری کوتاہی شروع ہو جاتی ہے کہ ہم اس ترکیب پر عمل نہیں کرتے۔ میں آپ سے بھی رائے لوں گا کہ میں اس کوتاہی سے باہر نکلنے کے لیے کیا کروں؟ میں ڈاکٹر کی دی ہوئی دوائی لیتے

وقت پر چۂ ترکیب ضرور دیکھتا ہوں۔ پر چۂ زندگی حل کرتے وقت خدا کے دیئے گئے احکامات یا دی گئی ترکیب کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

ہم زندہ قوم ہیں

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

محبتوں کے سلسلے بھی بڑے وسیع سلسلے ہوتے ہیں، نہ دیکھے کی بھی بڑی محبّت ہوتی ہے، پاس اور قریب رہنے والے بھی بڑے پیار سے پیش آتے ہیں اور جو دُور کے لوگ ہوتے ہیں جن سے کبھی پہلے ملاقات نہیں ہوئی ہوتی اس پروگرام کے ذریعے یا کسی اور وجہ سے ایسی محبتیں بکھیر جاتے ہیں کہ آدمی ان کا دیا دے نہیں سکتا۔

پچھلے دنوں مجھے ملنے کے لیے ایک صاحب تشریف لائے۔ ان سے بڑی دیر تک باتیں ہوئیں۔ میں نے گفتگو کے درمیان میں اُن سے پوچھا کہ باوجود اس کے کہ ہم باتوں کے سلسلے میں

بہت آگے نکل گئے ہیں میں یہ تو آپ سے پوچھ نہیں سکا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں اور آپ کا کیا نام ہے۔

کہنے لگے ”میں سیالکوٹ سے آیا ہوں۔“

میں نے کہا کہ ”سیالکوٹ کا تو بہت اُونچا مقام ہے اور ہم سارے لوگ سیالکوٹ کو سلام بھی کرتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے ملک کا ایک واحد علاقہ ہے جہاںUn-Employmentزیرو ہے۔“

وہ صاحب کہنے لگے کہ ”جی ہاں بالکل ایسے ہی ہے بلکہ ہم تو لوگوں کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں کہ تمہیں کام دیا جائے۔ ہم گاؤں میں چلے جاتے ہیں لیکن کاریگر نہیں ملتے۔“

میں نے ان سے دریافت کیا کہ ”آپ کیا کرتے ہیں؟“

کہنے لگے ”جی ہم ہاکی بناتے ہیں۔“

میں نے کہا ”کھیلنے والی ہاکی۔“

انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

میں متجسس ہو کر اُن سے پوچھنے لگا کہ ”جی یہ ہاکی تو ایک خاص قسم کی لکڑی کی ہوتی ہے اور وہ تو کشمیر وغیرہ سے شاید منگوائی جاتی ہے۔“

وہ کہنے لگے کہ ”نہیں۔ آپ شاید کرکٹ کے بلّے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ شاید کشمیر سے

آتی ہو گی۔ ہاکی کی لکڑی یہیں سے ملتی ہے۔ وہ شہتوت کی ہوتی ہے اور ہمارے ہاں کا شہوت بڑے غضب کا ہے اور اس کی ہاکی بہت اچھی بنتی ہے۔“

میں نے کہا کہ ”آپ شہتوت کی لکڑی کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔“

انہوں نے کہا کہ ”ہمارا جو ہاتھ سے لگایا ہوا جنگل چھانگا مانگا ہے یہ ہمیں بہت شہتوت دیتا ہے اور اب خانیوال سے ماورا کچھ اور جنگل بھی شہتوت کے ہیں۔“

ان کا کہنا تھا کہ شہتوت کی بہت پیلے رنگ کی لکڑی ہوتی ہے اور اس میں انتہائی لچک ہوتی ہے۔ ہم اسے جیسے موڑنا چاہیں آسانی سے موڑ لیتے ہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ ”ہاکی کی صنعت میں غیر ممالک میں آپ کا مدِّمقابل کون ہے؟“

خواتین و حضرات میں ایک متعصّب پاکستانی ہوں اور ہمیشہ یہ دیکھتا ہوں کہ کہاں ہم پر زد پڑ رہی ہے۔ (مُسکراتے ہوئے)

وہ کہنے لگا کہ "باہر ہمارا کوئی مدِ مقابل نہیں ہے۔"

"باہر والوں کو ہاکی بنانی ہی نہیں آتی۔" انہوں نے جواب دیا۔

اس بات پر میں بہت چونکا۔ وہاں اور بھی لوگ موجود تھے وہ بھی چونکے بغیر نہ رہ سکے۔

ہم نے کہا کہ آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ کچھ سوچ کر بات کریں۔ انہیں ہاکی کیوں نہیں بنانی آتی۔ وہ ایٹم بم بنا لیتے ہیں۔

اس نے کہا "سر انہیں ہاکی بنانی نہیں آتی، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ مجھے کیوں جھڑکیاں دے رہے ہیں۔"

ان کا کہنا تھا کہ "دنیا کی بہترین ہاکی صرف سیالکوٹ میں بنتی ہے اور یہی ہاکی عالمی معیار کی ہوتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انٹر نیشنل سٹینڈرڈ کی ہاکی جو اولمپک میں استعمال ہوتی ہے وہ اکیس اونس کی ہوتی ہے۔ اسے بناتے ہوئے اگر وہ بائیس اونس کی بن جائے تو اسے بیرون ملک چھیل کر یا ریتی لگا کر ۲۱ اونس کا کیا جاتا ہے۔ اگر وہ ۲۰ اونس کی بن جائے تو پھر جلانے کے ہی کام آئے گی نا! لیکن ہمارے کاریگر جو ہیں جب وہ ہاکی بنا رہے ہوتے ہیں تو نہیں ان کا تجربہ اور ہاتھ بتا

دیتا ہے کہ وزن کی کیا کیفیت ہے۔"

میں نے کہا "سر یہ کیسے؟"

وہ صاحب بولے کہ "آپ کیوں حیران ہوتے ہیں۔ آپ کے ریڈیو ٹی وی پر پرانی وضع کے گانے والے جب سُر لگاتے ہیں تو ایسی کھینچ کے لگاتے ہیں کہ کوئی ایک گریڈ اوپر نا نیچے۔ کیا مجال ہے کہ ذرا برابر بھی فرق پڑ جائے تو ان پرانے بابے کاریگروں کے لیے وزن کا خیال رکھنا کون سی مشکل بات ہے۔ کاریگر جو بھی ہاکی بنا کر رکھے گا ہم تولتے جائیں گے وہ اکیس اونس کی ہو گی۔"

میں نے کہا کہ "انڈیا بھی بناتا ہے ہاکیاں؟"

انہوں نے بتایا کہ "وہ سکولوں کالجوں کے لڑکوں کے لیے بناتے ہیں۔ عالمی معیار کی نہیں بناتے ہیں۔ انٹرنیشنل سٹینڈرڈ کی ہاکی صرف سیالکوٹ میں بنتی ہے اور یہ ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔"

میں نے کہا کہ "یار یہ تو کمال کی بات ہے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔"

میں نے اسے یاد دلایا کہ "ہم نے ایک مرتبہ ٹیلیویژن پر ایک ڈاکومنٹری فلم

بنائی تھی۔ اس میں ہم نے یہ بتایا تھا کہ عالمی معیار کا فٹ بال صرف سیالکوٹ میں بنتا ہے۔ فٹ بال کی ٹکڑیاں پرانے بابے جو ہیں وہ چمڑے کی ایسی کاٹتے ہیں کہ جب وہ ان کے ٹانکے لگائے جاتے ہیں تو اس کی گولائی میں عین گنیے میں آتی ہے اور آخری بات جو ہے جو ہم نے اپنی فلم میں بھی دکھائی تھی وہ یہ کہ جب ساری Stitching ہو جاتی ہے اور ان ٹکڑیوں کو جوڑنے کے لیے آخری ٹانکا لگتا ہے تو وہ سیالکوٹی کاریگر اس حساب سے لگاتے ہیں کہ جب اسے کھینچتے ہیں وہ ٹانکا پلٹ کر اندر چلا جاتا ہے باہر نہیں رہتا۔ ہم نے کیمرے کا کلوز اپ لے کر اس آخری ٹانکے کی حکمت سے آشنائی کرنا چاہی اور کاریگر سے کہا کہ بار آخری ٹانکا ذرا آہستہ سے لگانا۔ اس نے آہستہ بھی کیا۔ ہم نے کلوز اپ کیمرہ کیا لیکن جب اس نے کھینچ کیا تو ٹانکا پلٹ کر اندر چلا گیا اور اس کا مشاہدہ نہ کر پائے۔"

ان کاریگروں نے بتایا کہ :جی یہ خاندانی طریقہ چلا آرہا ہے۔ ہم نے کسی کتاب سے نہیں پڑھا اور یہ فن باپ دادا سے چلا آرہا ہے۔ یہ ساری باتیں سُن چکنے کے بعد اور ان سے مختلف قسم کے سوالات کرنے کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ "پھر کیا بات ہے۔ اتنا سب کچھ کر چکنے کے بعد ہمارے ہاں تفاخر کی کیوں کمی ہے۔ ایک فخر ہوتا ہے نا جی اپنے آپ پر وہ کیوں نہیں ہے۔ آپس کے تعلقات

page missing 145

”آپ پاکستان کیوں جا رہے ہیں؟“

انہوں نے کہا کہ ”ہم اس لیے جا رہے ہیں کہ پاکستان میں دنیا کی سب سے اُونچی چوٹی کے ٹو ہے اور ہم اسے سَر کرنا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ طرۂ امتیاز اطالوی لوگوں کے سر رہے۔“

میں نے کہا کہ ”سر اُونچی تو ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔“

انہوں نے کہا ”نہیں۔“

کچھ جغرافیہ دان یہ بھی کہتے ہیں اور جو نئی Calculation کی گئی ہے، ساؤنڈ کے گولے سے اس سے پتہ چلا ہے کہ کے ٹو ماؤنٹ ایورسٹ سے دو فٹ اونچی ہے۔ (ابھی تک ایک متنازعہ بات ہی ہے)۔

خواتین و حضرات اب اس کے ٹو کو نہ میں جانتا تھا، نہ اب کبھی ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں کے ٹو کے ملک کا رہنے والا یا رہنے والی ہوں۔ نہ ہم اپنی شناخت نانگا پربت،

راکاپوشی، ترچ میر کے سلسلوں والے ملک پاکستان کے باسی کے طور پر کرواتے ہیں۔

ہمارے ہاں چونکہ فزکس کے طالب علم بیٹھے ہیں اور میں اس بات پر تھوڑا سا فخر ضرور کروں گا کہ آپ کی بدولت اور کسی ایک امّاں بوڑھی کے سہارے ایک فخر اور تفاخر کا مظاہرہ جو میں نے دیکھا اس نے مجھے بڑا حیران کیا۔ پچھلے دِنوں آج سے کوئی بارہ تیرا دن پہلے (یہ پروگرام ۱۹۹۹ء میں ریکارڈ کیا گیا) میں سعودی عرب گیا، عمرے کے لیے۔ آپ اگر وہاں پر جائیں اور انشاء اللہ ضرور جائیں گے، وہاں ائیرپورٹ پر اُترتے ہی جب وہاں کے حکّام کو پتہ چلتا ہے کہ یہ پی آئی اے کی فلائٹ آئی ہے تو وہ ہمارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ ہمیں قطار میں کھڑا کرتے ہیں۔ وہ جو کسٹم والے ہوتے ہیں وہ بڑے سخت لوگ ہیں۔ ہم وہاں ۸ بجے قطار میں کھڑے ہوئے اور ۱۱ بجے وہ بندہ آیا۔ پہلے اس نے آکر چائے پی پھر کہنے لگا کہ "ایک ایک کر کے آؤ۔"

وہ اس طرح ایک ایک کر کے سب کا سامان چیک کرنے لگا۔ وہ سب کا سامان اِدھر اُدھر بکھیر کر چیک کرنے لگا (بڑی ذلّت کی بات ہے) ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔

اب جب میں عمرہ کے لیے گیا تو مجھے علم تھا کہ گھنٹوں قطار میں کھڑا رہنا پڑے گا۔ میں نے اپنی بیوی (بانو قدسیہ) سے کہا کہ ”بھئی ہو جاؤ تیار ان کو Face کرنے کے لیے۔“ ہم قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اس مرتبہ میں ایسی چھڑی لے کر گیا تھا جس کے سہارے بیٹھا جا سکتا ہے۔ اس چھڑی کو کھولیں تو وہ چھوٹی سی کرسی بن جاتی ہے۔ وہ قطار آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور اس عربی اہلکار کا رویہ ویسا ہی تھا جیسا کہ میں نے پانچ برس پہلے دیکھا تھا۔

پیارے بچّو! جب ہم قطار میں کھسکتے ہوئے اس کسٹم والے کے پاس پہنچے جو سامان کے ساتھ بے ترتیبی اور بدتمیزی کر رہا تھا۔ وہاں ہمارے آگے ایک مائی کھڑی ہوئی تھی۔ جب اس کی باری آئی اور اہلکار اس کی ٹین کی صندوکھڑی (صندوقچی) کھول کر دیکھنے لگا تو وہ امّاں وڈھی سخت انداز میں کچھ عربی زبان کے الفاظ بولی۔ اس کے بولنے کا لہجہ بالکل عربی لوگوں کی طرح تھا۔ میں اور میری بیوی نے اسے پلٹ کر دیکھا کہ یہ ایک دیسی عورت ہے جو ہمارے ساتھ آئی ہے۔ یہ کیسے کڑ۔۔۔ کڑ۔۔۔ کڑ۔۔۔ عربی بول رہی ہے۔ اس کے جواب میں اس کسٹم والے نے شکراً شکراً کہہ کر اس کی صندوکھڑی بند کر دی اور وہ بھی امّاں آگے چلی گئی۔ یہ میرے لیے بڑی حیران کن بات تھی۔ میں نے اپنا کام چھوڑ کر اس سے کہا ”بی

بی ایک منٹ رُک جانا۔"

میں نے اس سے کہا کہ "پہلے مجھے تم یہ بتاؤ کہ تم نے اتنی اعلیٰ درجے کی خوبصورت اور رواں عربی کیسے سیکھی؟"

کہنے لگی "اوس دفع ہونے کفیل کولوں سکھی اے۔"

میں نے کہا "وہ کیا ہے؟"

کہنے لگی کہ "وہ مکہ شریف میں، وہ درزی کا کام کرتی ہے اور اس کا کفیل اس سے کپڑے سلواتا ہے۔ جب وہ وقت پر پیسے نہیں دیتا تو میں اس سے جا کر لڑائی کرتی ہوں۔ اس کی بیوی اور بچّوں کے سامنے اس کے گلے "صافہ" (کپڑا) ڈالتی ہوں اور میری کفیل کے ساتھ آئے روز لڑائی سے عربی بولنے کی پریکٹس ہو گئی ہے۔"

وہ کہنے گی کہ "میں اٹھارہ برس سے پیسے نکلوانے کے لیے عربی بول رہی ہوں۔"

بچّو یہ تو ایک اَن پڑھ اور درزی وڈھی امّاں کی کہانی تھی۔

ہاں تو میں نے اس سے پوچھا کہ "تو نے اس کسٹم والے کو کیا کہا تھا؟"

کہنے لگی کہ میں نے اس سے کہا تھا کہ "دیکھ میں اس ایٹمی پاور والے ملک کی باشندہ ہوں۔ میرے سامان کو احتیاط سے ہاتھ لگانا۔"

میں نے کہا کہ "تجھے کیسے پتہ چلا؟"

وہ کہنے لگی "اسیں پٹا کہ نئیں چلایا۔"

(ہال میں قہقہے) اس طرح وہ امّاں السّلام علیکم کر کے گزر گئی۔

امّاں وڈھی کے واقعہ کے بعد جب ہم اس ایٹمی دھماکے کو کیے ہوئے ایک سال گزار چکے تھے اور ہم نے ۲۸ تاریخ کو اس دن کو ٹی وی پر منایا تو میرے آس پاس کے لوگ کہنے لگے "یار کیا شیخی بگھار رہے ہو۔" اور دھماکوں کے بعد ایک دوست میرے پاس آئے اور کہنے لگے "اشفاق احمد تو یہاں سے چلا جا تجھے تو اللہ نے اس بوڑھی عمر میں بھی بڑی صلاحیتیں دی ہیں، تو جہاں بھی جائے گا وہ تجھے رکھ لیں گے تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "خدا کا خوف کرو۔ میں یہاں بہت سوکھا ہوں۔ خوش ہوں۔"

کہنے لگے "نہیں نہیں۔" انہوں نے میرے سامنے پاکستان کا ایسا مایوس کُن نقشہ

بنا دیا کہ میری ساری طاقت ماؤف ہو گئی اور میں گھبرا گیا۔ مجھے بالکل چوہا سا بنا دیا۔

جب وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا "یار تو جا کیوں رہا ہے۔ بیٹھ میرے پاس۔"

تو کہنے لگا "مجھے جلدی ہے۔"

میں نے کہا "کیا جلدی ہے؟"

وہ بولا کہ "میں نے ڈیفنس میں ایک نئی کوٹھی شروع کی ہے اس لیے سیمنٹ کا بندوبست کرنا ہے اور مجھے کسی نے وعدہ کیا ہوا ہے۔"

میں نے اس سے کہا "بدبخت کے بچّے تو دوسری کوٹھی بنا رہا ہے اور مجھے یہ رائے دے رہا ہے کہ یہاں سے چلا جا۔"

اس طرح کے بے شمار بندے ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ ہماری زندگی جو ہم گزارتے ہیں اس کے پیچھے ایک گروہ ہے۔ ایک دھندلا گردہ ہے۔ چلئے میں اس کی نیّت پر بھی شک نہیں کرتا۔ اس کی بے یقینی اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں

کی بات کرتا ہوں کہ اس کو یقین ہی نہیں آتا ہے۔ وہ اس قدر ڈرا ہوا طبقہ ہے۔ اسے اپنا مستقبل بڑا تاریک نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آپ اور آپ کے مستقبل کے بارے میں بھی یہی حکم لگاتا ہے۔ یہ دھندلا سا طبقہ وہ ہے جو بڑا Well Placed ہے، اچھا کماتے ہیں۔ ہم اور آپ سے زیادہ دولت مند ہیں اور زیادہ نیک نام ہیں۔ اخباروں میں ان کا ہم سب سے زیادہ ذکر چھپتا ہے اور وہ معتبر ہو کر رہتے ہیں لیکن پاکستان کے بارے میں، معلوم نہیں پاکستان نے ان کا کیا بگاڑا ہے وہ یہی مایوسی کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کا جو طریقہ کار ہے وہ یہ ہے کہ وہ آپ کی کوئی نیگیٹو بات لے کر اسے اچھالتے رہتے ہیں حالانکہ ہر ملک کی خرابیاں ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر وہ گھوسٹ سکولوں کا ذکر کریں گے۔ جی ہاں اس قسم کے سکول تھے، بالکل تھے۔ اس سے ہمیں بہت نقصان پہنچا ہے۔ بوٹی مافیا تھی اور ہمیں اس کے خلاف بڑی Fight لڑنا پڑی۔ اس کو ختم کرنے کے لیے ہم نے جان لڑا دی۔ وہ لوگ ہماری دو تین منفی چیزیں گنوا کر ہمیں مایوس کرنے کے لیے ہمارے اچھے پوائنٹس کو بھی کہانی قصّہ ہی قرار دیں گے اور اس مراثی کی بیوی کا کردار ادا کریں گے جو بیچارہ ہوا میں اُڑنے لگتا ہے اور اس کی بیوی بھی اس اُڑتے

ہوئے شخص کو دیکھتی رہی اور حیران ہوتی رہی لیکن جب اس کو پتہ چلتا ہے کہ وہ اُڑنے والا شخص اس کا شوہر تھا تو ناک مُنہ چڑھا کر کہتی ہے کہ اسی لیے ٹیڑھا ٹیڑھا اُڑ رہا تھا۔ اس ٹیڑھ پن نے ہم سب کی زندگیاں متاثر کی ہیں۔ آپ کے چہرے جو کھِلے ہوئے ہونے چاہئیں تھے، یہ کھِلے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ کیفیّت تو اعتماد کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ زندہ قومیں اپنی خوبیوں کے اعتماد کو اپنا سہارا بنا کر ساری زندگی اس کے ساتھ لگا دیتی ہیں۔

آپ کو کبھی گوروں کی کرکٹ ٹیم کو دیکھئے گا۔ وہ ہاری ہوتی ہے لیکن اُن کے چلنے کا انداز تفاخر پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کے چہرے سے نہیں لگتا کہ وہ ہار رہے ہیں بلکہ وہ شاہانہ انداز میں دکھائی دے رہے ہوتے ہیں۔ اب میری بھی شہنشاہیت ہے، میرے بھی اپنے صنم خانے ہیں، لیکن آپ ہی کی یونیورسٹیوں میں ایسے لوگ بھی بیٹھے ہیں کہ آپ صبح سویرے تنگڑے ہو کر جاتے ہیں لیکن وہ آپ کی پھونک نکال دیتے ہیں۔ ہمارے سائنسدانوں، سرجنوں کا کسی کے ساتھ مقابلہ کر لیں۔ ہمارے بینکر ہیں جنہیں دنیا مانتی ہے لیکن اس سب کے باوجود مایوسی کی باتیں کی جاتی ہیں۔ آخر کیوں؟ ایسی مایوسی کی باتیں آسودہ حال لوگوں کی طرف سے آتی ہیں۔

لیکن اگر اس سارے دباؤ کے باوجود ہم کہیں کہ ہم اپنی ساری اور تمام تر خامیوں کے باوصف انہیں تسلیم کرتے ہوئے اپنے مقام پر کھڑا ہوں اور یہ ملک اور میری سرزمین ہے۔ Prussia کی فتح کے بعد جب نپولین فریڈرک کی قبر پر گیا تو اس نے دیکھا کہ فریڈرک کی تلوار اس پر لٹک رہی ہے۔ اس نے اُتروائی اور کہا کہ میں اسے پیرس کے عجائب گھر کی نذر کر دوں گا کیونکہ ایسی تاریخی تلوار عجائب گھر میں ہونی چاہیے تو اس کے ساتھ جو جرنیل تھا اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا کہ ”سر ایسی نامور تاریخی تلوار تو آپ کے پاس ہونی چاہیے“۔

اس پر نپولین نے اپنی تلوار پر ہاتھ مارا اور کہا کہ ”کیا میرے پاس میری تلوار نہیں ہے کہ میں کسی کی اُٹھاتا پھروں۔“

جب ہم میں یہی رویّہ پیدا ہو گا اور آپ اس شخص سے نفرت کا اظہار کریں گے جو آپ کے ملک کے بارے میں، آپ کے بارے میں، آپ کے ابّا جی کے بارے میں ذرا سا بھی منفی سوچ پر مبنی رویّہ اختیار کرے گا تو اس کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(ہال میں ایک صاحب بولتے ہیں)

اس حوالے سے ہمارا میڈیا ہی کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے کہ وہ لوگوں کی برین واشنگ کرے لیکن ہمارے پرنٹ میڈیا سے لے کر الیکٹرونک میڈیا تک شُعوری، یالاشُعوری، کسی بھی وجہ سے یہ بات فکس کرتا جارہا ہے کہ پاکستانی کہیں نہ کہیں کمتر ہیں۔

اشفاق احمد: آپ کی بات بہت توجّہ طلب ہے لیکن اب ہم کیا کریں؟

کیا ہم اس بوڑھی درزن کی طرح بن سکتے ہیں؟ آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ ایک بلند تر قابلِ فخر قوم ہیں۔ آپ بھی باہر نکل کر ان اسلامی ممالک کو دیکھیں جو پاکستان کو بڑا بھائی کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نے بڑے کمال کا ایک کام (ایٹمی دھماکے) کیا ہے۔ ہم نے ایک نہیں بڑے کمال کے کئی کام کیے ہیں۔ بچّو! ہم قابلِ فخر لوگ ہیں۔ اگر ہم سے کہیں کوئی کوتاہی یا لغزش ہو رہی ہے تو ہم فوراً رُکیں اور کہیں کہ ہم زندہ قوم ہیں، پائندہ قوم ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

Values and Censorship

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

اب اس عمر میں پہنچ کر جب میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو اتنا لمبا راستہ طے ہو چکا ہے کہ دُور جہاں سے یہ سفر شروع کیا تھا اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا۔ ایک لمبی سیدھی لکیر ہے جو نظر تو آتی ہے اور جس کے واقعات بھی ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھے ہوئے آگے تک چلے آتے ہیں لیکن اس بات کا کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ اتنا سارا لمبا سفر طے کرنے کے بعد آخر آپ نے اس کا نتیجہ کیا نکالا ہے۔

میں عرض کر رہا ہوں کہ میرے ذہن میں ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء اور اکتیس بتیس کے واقعات گردش کر رہے ہیں جن میں مَیں سکول جا رہا ہوں۔ میری تختی ہے، میرا بستہ ہے، پھر اس کے بعد میرے لیے ۱۹۳۵ء بہت ہی اہم سال تھا کہ ہمارے بادشاہ سلامت جارج پنجم (اس وقت برِّصغیر میں انگریز حکمران تھا اور ہمارے ہاں نو آبادیاتی نظام رائج تھا) کی سلور جوبلی منائی جا رہی تھی اور بڑی

دھوم سے منائی جا رہی تھی۔ اس وقت ہم سب لوگ، یعنی بچّے بہت خوش تھے۔ ہمیں تالی بجانے کے نئے نئے طریقے سکھائے گئے تھے اور گورا فوج کا دستہ ہمارے گھر کے سامنے پریڈ کر رہا تھا اور ہم اس سے مرعوب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے ویسے ہی چلے تھے۔

وہ بھی ایک عجیب و غریب زمانہ تھا۔ آپ لوگوں نے اس طرح کا غلامی کا زمانہ نہیں دیکھا جو ہم دیکھ چکے ہیں۔

اس سلور جوبلی کی ساری یادیں میرے ذہن کے چوکھٹے میں پوری توانائی کے ساتھ اور پوری جزویات کے ساتھ قائم ہیں۔ اس موقع پر ہمارے سکول میں لڈّو بنے تھے۔ تین تین لڈو خاکی لفافے میں ڈال کر ہر طالبعلم کو دیئے گئے تھے۔ پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک۔ پھر رات کے وقت سارے قصبے میں ایک مشاعرہ بھی ہوا تھا اور مجھے میرے والد سمجھاتے تھے کہ مشاعرہ کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ اکٹھے ہو کر کیا بولتے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ ایک شخص بولتا ہے تو سب واہ واہ کر اُٹھتے ہیں۔

اس مشاعرہ میں ہمارے سکول ٹیچر محسن صاحب جو فارسی کے اُستاد تھے نے

ایک لمبی نظم پڑھی اور مجھے اب یاد آتا ہے کہ اس کا پہلا شعر یہ تھا:

سلور جوبلی شان ہے آئی

دو دن کی تعطیل دلائی

اُٹھو، اُجلے کپڑے پہنو

خوشی مناؤ بھائیو، بہنو

(اس وقت انگریز کو خوش کرنے کے لیے اس قسم کی چیزیں یا قصیدے پڑھے جاتے تھے)

خواتین و حضرات پھر بالکل سکرین کے اُوپر زمانہ بدلتا گیا اور اب بھی بدلتا چلا جا رہا ہے۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا کہ اس وقت ایک بہت بڑے ہندو سیٹھ لالہ نتھو رام تھے۔ ان کے پاس ایک بگھی تھی جس کے آگے دو گھوڑے جوتے جاتے تھے۔ پھر اچانک زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ اُن کی بگھی کے آگے سے گھوڑے ہٹ گئے لیکن وہ بگھی پھر بھی چلتی رہی۔ ہم بڑے حیران تھے کہ یا اللہ اس کے آگے گھوڑا تو ہے نہیں، پھر یہ چلتی کیسے ہے؟

لیکن وہ سارے شہر کا چکر کھاتی تھی اور ہم لوگ بڑے بوڑھے تالیاں بجاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ بھاگتے تھے اور لالہ جی اس کے اندر بیٹھ کر مزے کر رہے ہوتے تھے۔ اسی بگھی پر ربڑ کا بھونپو (باجا) پاں پاں کی آواز بھی نکالتا تھا۔ ہم نے گھر میں آکر اپنی ماں کو بتایا کہ اب بگھی تو بدل گئی ہے اور گھوڑا اس کے آگے نہیں ہے لیکن چلتی پھر بھی ہے تو میری ماں نے بتایا کہ ہاں ایسی بگھیاں بھی ہوتی ہیں۔

اس وقت زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہا تھا اور میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور اس تیزی کے اندر لپٹا ہوا سفر کر رہا تھا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ وہ بگھی بدل گئی ہے۔ ہم اگلی جماعتوں میں چلے گئے اور اس وقت انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتے تھے۔ کوئی گورا جب گزرتا تو ہم اس کو بڑے تپاک کے ساتھ سلام کرتے تھے۔ کبھی وہ جواب دے دیتا تھا، کبھی جواب نہیں دیتا تھا۔ پھر اچانک ایک اتنی بڑی تبدیلی آئی کہ ہمارے ضلع میں ایک ڈپٹی کمشنر آ گیا جو "گورا" (انگریز) نہیں تھا اور میرے والد نے گھر آکر خوشی کے ساتھ میری والدہ کو بتایا کہ ایک نیا ڈپٹی کمشنر آیا ہے اور وہ گورا نہیں ہے اور اس کا نام اختر حسین ہے۔ دوسری انہیں یہ خوشی تھی کہ وہ مسلمان تھا۔ اب ہم سب کی طلب تھی کہ جس میں مَیں،

میرے ساتھی، سکول ٹیچر اور ہیڈ ماسٹر صاحب بھی شامل تھے، کہ اختر حسین کو دیکھنا چاہیے کہ کسی شکل وصورت کا آدمی ہے (یہ وہی اختر حسین تھے جو پاکستان بننے کے بعد پنجاب کے گورنر بنے)۔

ایک مرتبہ ہماری دُعائیں قبول ہوئیں اور وہ ہمارے قصبے کا دورہ کرنے آئے، تب ہم سب سکول کے لڑکے اُن کے استقبال کے لیے اچھے اچھے کپڑے پہن کر آئے تھے۔ سکاؤٹ اپنی وردیوں میں بالکل چاق وچوبند انہیں سلامی دے کر اُن کی کرسی کے آگے سے گزر رہے تھے۔ سب سے خوشی کی بات یہ تھی کہ ڈپٹی کمشنر صاحب کا جو اسسٹنٹ کمشنر تھا وہ ایک گورا تھا جو ان کے پیچھے بڑے ادب کے ساتھ چل رہا تھا۔ اختر حسین صاحب پانچ قدم آگے اور وہ پانچ قدم پیچھے چلا تھا۔ اس وقت ہمارے علاقے کے لوگ خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے کہ ہمارا "دیسی ڈپٹی کمشنر" آگے جارہا ہے اور گورا اس کے پیچھے پیچھے جارہا ہے اور اختر حسین صاحب اکثر بیچ میں رُک رُک کر اسے کہتے کہ Timothy Look Here تو وہ کہتا Yes Sir۔

ہمیں یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ وہ اس گورے اسٹنٹ کو حکم بھی دے سکتے ہیں اور وہ اسے مانتا بھی ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ پھر ہمارے قصبے میں جہاں کہ

بجلی نہیں تھی وہاں ایک عجیب مظہرِ قدرت ہوا کہ وہاں پر ''بولتی فلم'' آئی۔

گاؤں میں منادی ہوئی کہ ایک تصویر ہے جو بولتی بھی ہے۔ ہم سب بے چین تھے کہ اسے دیکھیں۔ اعلان کیا گیا کہ ریلوے اسٹیشن کے قریب بڑے میدان میں وہ بولتی اور حرکت کرتی تصویریں دکھائی جائیں گی۔ چنانچہ وہاں پر ایک بہت بڑا پروجیکٹر لگا دیا گیا۔ وہ نہایت بھدی قسم کا تھا۔ اس پر وہ ریل چڑھائی گئی اور ایک آپریٹر بڑے شہر سے منگوایا گیا۔ اس کے پانچ چار اسسٹنٹ تھے۔ وہاں سے دُور ایک جنریٹر لگا کر اور اس کی تاریں پھینک کر بجلی کا بندوبست کیا گیا اور سامنے سکرین تانی گئی۔ ہمارا سارا قصبہ، عورتیں، بچّے، بوڑھے، ''منجیاں'' (چارپائیاں) ڈال کر وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

جب اس سکرین کے اُوپر تصویر نظر آتی تھی تو وہ واقعی بولتی تھی اور اس تصویر کا نام تھا لیلیٰ مجنوں۔ ان حرکت کرتی تصویروں میں ایک لڑکی لیلیٰ تھی اور ایک لڑکا مجنوں تھا جسے لوگ پتھر مار رہے تھے اور ہم حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بیچ میں گانے بھی آتے تھے۔ وہ ریل (فلم کا فیتا) دس منٹ کے لیے چلتی تھی اور پھر اس کو بدلا جاتا تھا اور اسے بدلنے میں تقریباً آدھ گھنٹے صرف ہوتا تھا، سارے شائقین و ناظرین پھر اپنے مُنہ اسکرین کی بجائے پیچھے پڑے پروجیکٹر کی

طرف کر لیتے تھے اور ریل بدلتے منظر کو دیکھنے کا بھی بڑا مزہ تھا۔ آدھ گھنٹے کا تماشا دیکھنا اور پھر دس منٹ کا سامنے سکرین پر تماشا دیکھنا۔

اب اس میں مَیں آپ کو جو ضروری بات بتانے لگا ہوں وہ یہ کہ اس فلم میں Self Imposed Censorship تھا، وہاں سنسر شپ باقاعدہ طور پر تو تھی نہیں لیکن ہمارے ذیلدار گرونام صاحب، انہوں نے سنسر کا بندوبست کیا تھا تا کہ لوگوں کے اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑے۔ وہ پیتل کی ایک گاگر (گھڑا نما برتن) اور ہاکی لے کر وہاں کھلے میدان میں موجود تھے اور جب کوئی ایسا سین آتا تھا جس میں لیلیٰ مجنوں کے قریب ہو جاتی تھی اور گانا گانے لگتی تو ذیلدار صاحب کا گر بجاتے تھے اور ان کے گاگر بجانے کی ڈناڈن ٹن ٹنڈن کی آواز پورے مجمع میں سُنی جاتی تھی تو ہم سب آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ یہ بُرا سین ہے اور اخلاق پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ لٰہذا آنکھیں بند کر لی جائیں۔

خواتین و حضرات! ہم سب اپنی آنکھیں ایمانداری کے ساتھ بند کر لیتے تھے۔ کسی نے بھی کانی آنکھ سے نہیں دیکھا کہ کیا سین چل رہا ہے۔ وہاں حکومت کی طرف سے کوئی سنسر شپ نہیں تھی۔ معاشرے نے خود ہی اپنے اوپر وہ سنسر بٹھایا ہوا تھا۔ جب دوبارہ گاگر بجنے کی آواز آتی تو سب آنکھیں کھول لیتے تھے۔

بچّو! زمانہ قدم بہ قدم ایسی ترقّی، اسے ترقّی کہہ لیں، فلاح کہہ لیں یا پھر پتہ نہیں اسے آپ کیا کہہ لیں، کی طرف جا رہا تھا اور تیزی سے چلا آ رہا تھا۔

پھر اسی زمانے کے اندر میں نے دیکھا کہ انسان چاند پر گیا اور اس نے چاند پر جا کر Message دیا اور ہم نے پھر اس پیغام کا مطالعہ تجسس کے ساتھ شروع کر دیا۔ چاند کی زمین سے ایسا مواد اکٹھا کیا گیا۔ اس کا زمین پر لا کر تجزیہ کیا گیا۔ جب چاند کے اوپر یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور اس علم کی جزویات اور تفصیلات ہم تک پہنچائی جا رہی تھیں۔

تو مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا ہے جب میں فرانس میں تھا تو وہاں ایک فرانسیسی نے ایک لیکچر دیا تھا (میں زیادہ تو فرانسیسی نہیں سمجھتا تھا لیکن کچھ کچھ پلّے پڑتا تھا) جس میں اس نے بتایا کہ ہماری فرانس کی نیشنل لائبریری میں ایک کتاب ہے وہ ابنِ عربی کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ کتاب اور کہیں نہیں ہے اور اس کتاب کا نام "فتوحاتِ مکیہ" ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ کتاب ہمارے پاس محفوظ ہے۔ آج کل وہ فرانس کے قومی عجائب گھر میں ہے اور اس میں شیخ اکبر (شیخ اکبر ایک بہت بڑے صوفی تھے) لکھتے ہیں کہ "اللہ کے فضل و کرم سے اور اس کی مہربانیوں کی فراوانی کی بدولت مجھے چاند کی سیر کرائی گئی ہے اور اللہ نے مجھ پر کچھ ایسا رحم و

کرم کیا ہے اور جب میں چاند پر پہنچا تو میں وہاں جا کر بہت حیران ہوا اور میری سِٹی گم ہوئی کہ چاند وہ تو نہیں ہے جو ہم زمین پر کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔"

کہنے لگے کہ "اے میرے ہم نشینو! اے میرے ساتھیو! اے میرے ہم وطنو! اے مجھے سُننے والو! تم یقین کرنا کہ چاند کی سطح بڑی کھنگریلی ہے اور کالی سیاہ ہے اور اس میں بے شمار گڑھے پڑے ہوئے ہیں اور اس پر چلنا بہت دشوار ہے۔ اگر ایک قدم اٹھاؤ تو دوسرا بڑی مشکل سے رکھا جاتا ہے۔ پتہ نہیں اس میں اللہ کی کیا حکمت ہے اور اس کی جو فضا ہے وہ عجب طرح کی ہے۔ اگر چاند پر آپ انگلی کھڑی کریں تو انگلی ایک طرف سے ٹھنڈی جبکہ دوسری جانب سے گرم ہو جائے گی۔"

خواتین و حضرات! ابنِ عربی کی یہ کب کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور اس کا یہ ایک سبق ہے۔ لوگوں نے ان پر بہت آوازے کسے کہ چاند جو ایک نور کا ہالہ ہے، جو ساری دنیا کو روشنی عطا کرتا ہے۔ اس بابت یہ بابا کیا کہہ رہا ہے کہ وہ کھنگر جیسا ہے اور اس پر گڑھے پڑے ہوئے ہیں اور داغدار ہے۔

ابنِ عربی کے حوالے سے لیکچر اور چاند پر قدم رکھنے والے انسانوں کا زمانہ بھی

گزرا۔ میں ایک ایسا خوش قسمت آدمی ہوں کہ ان ادوار میں سے گزرا۔ چاند پر انسانی قدم پڑنے کے واقعہ کے بعد پھر زمانہ بڑی تیزی سے آگے بڑھنا شروع ہو گیا اور الیکٹرونک ڈیوائسز میں یہ بہت آگے چلا گیا۔

اب جب کہ یہ ایک مقام پر پہنچ گیا ہے اور یہ مزید آگے جمپ لینے کے لیے تیار ہے تو ہر شخص کی زبان پر ایک ہی بات ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ انداز بدل گئے ہیں۔ اطوار بدل گئے ہیں۔ اب وہ پہلے جیسی باتیں نہیں رہیں۔ اب ہمیں اپنا آپ سنبھالنے کے لیے خود کو وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کرنا ہو گا۔ میں بہت ہی اونچی آواز میں اپنے گھر میں کھڑا، لٹکا ہوا تولیہ اُتارتے ہوئے اپنی بیوی سے شکایت کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ "اب وہ پرانی قسم کی کھونٹی نہیں چلے گی۔ اس میں تولیہ پھنس جاتا ہے۔ اب مجھے ایسی پھرکی والی کھونٹی چاہیے جیسی میں نے ولایت میں دیکھی تھی۔ کیونکہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ تبدیلی آگئی ہے۔"

اس نے باورچی خانے سے بڑی زور دار آواز میں کہا کہ "ہرگز تبدیلی نہیں آئی ہے۔ زمانہ اللہ کے علم کے مطابق ویسے ہی چل رہا ہے۔ یہ ساری چیزیں جو تبدیلی و تغیّر کی ہیں، یہ فنا ہو جائیں گی۔ صرف میرا اللہ رہ جائے گا۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔"

میں نے کہا کہ ”بی بی Values تبدیل ہو گئی ہیں۔ قدریں بدل چکی ہیں۔“

اس نے کہا کہ ”یہ کبھی ہو نہیں سکتا، میرے اللہ کے فرمائے ہوئے کلمات تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اگر اس نے عدل کی ایک Value مقرر کر دی ہے تو قائم رہے گی۔ ہم چاہے بے عدل و بے انصاف ہو جائیں لیکن عدل کی قدر قائم رہے گی۔ سچ کی Value بر قراری رہے گی۔ جمال کی قدر ویسی ہی رہے گی۔ اگر ہم بدصورت ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب نہیں ہے کہ حسن و جمال کی قدر و قیمت کم ہو گئی ہے۔ یہ کہنا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے تو غلط ہے۔ ہاں اس کے کچھ تقاضے ضرور تبدیل ہوئے ہیں۔“

خواتین و حضرات! اس ہمیشہ قائم اور زندہ رہنے والے خدا نے جو انسان کو بنایا ہے وہ ویسے ہی رہے گا۔ باقی ہم چاہے تقاضے جس قدر مرضی بدل لیں ہم اپنی مرضی سے تو پیدا نہیں ہوتے۔ ہم سے پوچھا تو گیا نہیں کہ ہم کیسے بننا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری طوطاناک بنانے سے پہلے پوچھا گیا کیسی ناک درکار ہے؟ آنکھیں بلوری بنا دیں۔ ہمیں کالی چاہئیں تھیں۔ (مسکراتے ہوئے) ہم جب بن چکے تو ہم ایک خالی کوزہ کی طرح تھے۔ پھر ہم نے اپنے رب سے کہا کہ جناب ہم بن تو چکے اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ کیسے کرنا ہے؟ تو اللہ خداوند نے کہا کہ یہ ترکیب تمہارے

نبیوں کو بتادی ہے۔ نبیوں کو انسان کی صورت اس لیے بھیجا گیا کہ ہم کہیں ڈر ہی نہ جائیں۔

حکم دیا کہ تمہارے نبی جو کام بتائیں ویسے کرتے جانا، تمہاری بڑی فلاح ہو گی؟

ہم نے کہا کہ "سر ہم ترقّی چاہتے ہیں۔"

اب خدا کے نزدیک ترقّی اور فلاح دو مختلف چیزیں ہیں۔

ہم عالیشان گھروں میں لمبے ستونوں کو ترقّی کہتے ہیں۔ پوش علاقوں میں رہائش کو ترقّی بولتے ہیں لیکن رہ فلاح نہیں ہے، خیر نہیں ہے۔ پوری دنیا کا انسان ترقّی کے باوجود سکون کے ایک لمحے کے لیے تڑپتا پھرتا ہے، اس لیے کہ اس کا تمام رُخ ترقّی اور Progress کی طرف ہے۔ فلاح کی طرف نہیں ہے۔

خواتین و حضرات! فلاح کے اندر ترقّی کی چپ موجود ہوتی ہے لیکن ترقّی کے اندر فلاح موجود نہیں ہوتی۔ بچّو! قدریں نہیں بدلیں۔ آپ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کمال کا آدمی ہے، رشوت لیتا ہے۔

یہ بڑے غضب کا آدمی ہے، لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔

یہ کتنی اچھی عدالت ہے کہ اس نے آج تک انصاف نہیں کیا۔

آپ کبھی نہیں کہیں گے، دل سے نہ مُنہ سے۔

آپ چاہیں گے وہ اقدار جن کا تحفہ آپ کو دیا گیا تھا یا جو مباح ہیں۔ جو بندہ کسی بہانے یا چالاکی سے ایک اللہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے، میں عبادات کی یہاں بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں کوئی زیادہ ماتھا رگڑنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ بات کر رہا ہوں کسی دن کسی وجہ سے، کبھی سیر کو نکلے ہوئے، کسی کوئل کو بولتے ہوئے سُنتے ہوئے اگر آپ اللہ سے وابستہ ہو جائیں چاہے کچھ ساعتوں کے لیے، تو آپ کے اندر اس قدر طاقت آ جائے گی کہ وہ آپ کے کئی سو سال نکال سکتی ہے لیکن ہم اپنی سوچ کے مطابق اور نبیوں کے حکم کے خلاف عبادت سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اللہ سے وابستہ نہیں ہوتے۔ اگر قدریں بدلی ہوتیں تو ہم ایک ڈرائیور کی تلاش میں یہ کسی سے کبھی نہ کہتے کہ ”ہمیں ایک ایماندار ڈرائیور کی ضرورت ہے۔“

بلکہ یہ کہتے کہ ”یار کسی بے ایمان ڈرائیور کی تلاش ہے، کوئی ایسا ڈرائیور ڈھونڈ کر لا دو جو کام چور ہو، پٹرول چُراتا ہو اور پرزے بھی چوری کرتا ہو۔“

بچّو! قدریں نہیں بدلیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور نہ صرف آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے بلکہ یہ ہمّت بھی عطا کرے کہ ہم خود پر ایک سنسر شپ لاگو کریں جو سرکاری نہ ہو بلکہ اپنے مواخذے کی سنسر شپ ہو اور ہم اپنی معاشرتی اقدار کو سنبھالے رکھنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اللہ حافظ۔

"حرام بکرا"

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

یہ اب انفارمیشن کا عہد ہے۔ یوں تو جب سے پاکستان بنا ہے اور قائداعظم سے لے کر اب تک معلومات کا سلسلہ چلتا رہا ہے۔ یہ انفارمیشن ایک مشکل عمل ہے۔ اس پر مشرق و مغرب میں کام ہوتا رہا ہے اور بڑے لوگ اس سے متعلق حصولِ علم کے لیے سرگرداں رہے ہیں لیکن مشرق میں مَیں آپ سے جن بابوں کا ذکر عام طور پر کرتا رہا ہوں وہاں پر بابے کچّے کوٹھوں اور کچّی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر سوچ کی لہروں کو بہت دُور دُور تک پھینکتے رہے۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ ہم انہیں پڑھ نہیں سکے۔ کئی دہائیوں سے معلومات کی چڑیاں اُڑتی رہی ہیں اور کئی دفع تو اس کا ٹڈی دل بھی آتا رہا ہے۔ اب تو ہمیں حکم دے دیا گیا ہے کہ یہ صدی ہی انفارمیشن کی ہے اور اس میں ہمیں بندھی بندھائی اور گھڑی گھڑائی معلومات ملتی رہیں گی۔

میں جب اپنے بابا حضرت سائیں فضل شاہ صاحب نور والے کا ذکر کیا کرتا ہوں تو وہاں ایک دفعہ جب کہ میں پڑھ لکھ کر ولایت سے آیا تھا اور بڑا لائق نوجوان تھا۔ انہوں نے کہا کہ زندگی چاہے کوئی زمان ہو، کوئی وقت ہو اور کیسا بھی مقام کیوں نہ ہو یہ ضروری نہیں ہے کہ نیکی سے نیکی سرزد ہوتی رہے اور برائی سے برائی سرزد ہوتی رہے۔ اب یہ اسی بات تھی کہ مانی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ ہم نیکی کا نتیجہ نیکی اور برائی کا بدلہ برائی ہی گردانتے ہیں۔

ہم جو سب اُن کی محفل میں بیٹھے تھے، بضد ہو گئے کہ آپ ہمیں بتائیں کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے میں آپ کی آسانی کے لیے یوں کہہ دیتا ہوں کہ نیکی کو بھی اور بدی کو بھی ہر وقت خطرہ ضرور موجود رہتا ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ بہت اچھے آدمی ہو گئے ہیں۔ بڑے تہجد گزار ہو گئے ہیں۔ آپ نے نیکی اور پاکیزگی کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی ہے اور اب آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہم پھر بھی نہیں مانے۔

خواتین و حضرات! جو ڈیرے ہوتے ہیں وہاں مرغیاں، بکریاں، لنگر، دیگچے

موجود ہوتے ہیں۔ وہاں ایک بکرا دیوار پر اگلی دو ٹانگیں رکھے اُونچا پڑا لنگر کھا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بابا جی نے کہا کہ دیکھ یہ بکرا ہے۔ یہ پاک ہے اور طیب ہے اور حلال ہے اور پاکیزگی کا symbol ہے۔ لیکن اس کی پاکیزگی کو خطرہ بدستور لاحق ہے۔

ہم نے کہا ”یہ کیا بات ہوئی؟“

وہ کہنے لگے کہ ”یہی پاک، طیب حلال بکرا اگر ”جھٹکا“ (ذبح کے علاوہ ایک ہی وار میں گردن اُتارنے کا غیر مُسلموں کا طریقہ) ہو جائے تو آپ اس کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے اور آپ کے لیے یہ گوبر میں تبدیل ہو جائے گا۔ نجاست بن جائے گا۔ تو خطرہ ہر وقت موجود ہے۔“

پچیس چھبیس برس پہلے کی یہ سُنی ہوئی بات زبان کے کسی خانے میں ٹکی ضروری تھی لیکن پھر میں نے اس کے بارے میں کبھی جگالی نہیں کی۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ہمارے دوست شہزاد احمد نے ایک لکھی ”شوماخر“۔ شہزاد اقتصادیات کا ماہر ہے۔ انہوں نے ایسی کتابوں کا سلسلہ کافی عرصہ سے شروع کر رکھا ہے۔ ایک عرصے کے بعد ان کی یہ کتاب پڑھ کر میں بہت چونکا کہ جب کی

بات واضع نہیں ہو پائی تھی اور وہ بات لوٹ کر میرے پاس آ گئی ہے اور یہ اب بھی مجھ سے پکڑی نہیں جاتی اور میری گرفت میں نہیں آتی۔

انہوں نے اپنی اس کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "اب بہت سے لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ معاشرے کی اخلاقی بنیاد نئ ہونی چاہیے اور اب اخلاق کی بنیادیں نئے سرے سے اُٹھائی جانی چاہئیں کہ کیا اب یہ انصاف و عدل پر رکھنی چاہئیں اور جدید خطوط پر انہیں استوار کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ گناہوں کے باعث بلند تر ہو جاتے ہیں اور نیکیوں کے باعث ذلیل ہو جاتے ہیں۔"

خواتین و حضرات! یہ سوچنے والی بات ہے ایسی باتیں انفارمیشن والے تو نہیں بتاتے۔

شہزاد احمد صاحب مزید لکھتے ہیں کہ "یہ قول میرا نہیں ہے بلکہ شیکسپئر کا ہے اور اس کے ایک مشہور ڈرانے میں یہ بات ہے۔"

وہ لکھتے ہیں کہ "ضروری نہیں کہ نیکی ہمیشہ اچھی ہو اور برائی ہمیشہ بری ہو۔"

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک آدمی اچھی بات کرے یا کام کرے لیکن اس کا نتیجہ برا ہو۔

وہ لکھتے ہیں کہ "جب تک کسی نیکی میں باطن کی قوّت موجود نہ ہو، محض ظاہری طور پر ہو تو وہ انتہائی کمزور نیکی ہوتی ہے۔"

میں نے عہدِ حاضر میں باطن کی نیکی یا قوّت کا جو سب سے بڑا مظاہرہ دیکھا وہ ماؤزے تنگ (چینی رہنما) میں دیکھا۔ وہ مثبت اور لوگوں کی بھلائی کا کام کرتا تھا اور اپنے باطن کی بیٹری چارج کرنے کے لیے وہ لانگ مارچ کرتا تھا۔ لوگوں سے ملتا تھا۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہمارے کسی محکمے کا بڑا کہتا ہے کہ جی میں فلاں شکایت کے ازالے کے لیے یا فلاں کام کے لیے چپہ چپہ وطنی خود گیا یا فلاں دُور دراز علاقے میں گیا لیکن خواتین و حضرات! اُس کے اِس سفر سے کبھی خیر نہیں پڑتی۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس لانگ مارچ کی بنیاد نہیں رکھی۔ اس نے باطن کی طاقت سے استفادہ نہیں کیا ہوتا۔ جب میں نے شہزاد احمد صاحب کی کتاب میں لکھی یہ خوبصورت بات پڑھ لی اور میں نے اس پر غور کیا تو مجھے تیس پینتیس سال پرانا بابا جی کا واقعہ یاد آ گیا اور جب وہ بکرے والی مثال کا واقعہ یاد آیا تو مجھے اپنی ذات سے متعلق ایک واقعہ یاد آ گیا۔

۱۹۴۸ء میں مَیں پچیس سالہ کڑیل جوان تھا۔ بی اے کر چکا تھا۔ پاکستان کو بنے چند ماہ ہوئے تھے اور میں ایک جگہ چھوٹی سی نوکری کر رہا تھا۔ ان دِنوں میں مَیں نے سوچا کہ مجھے صحافی بننا چاہیے اور مجھے علم سیکھنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ اس میدان میں نام پیدا کروں۔

ان دِنوں مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میں رائٹر بن سکتا ہوں۔ گو یہ وہم بعد میں دُور ہو گیا لیکن آدمی نوجوانی میں کئی بے وقوفیاں کرتا ہے۔ ان دنوں مغربی پاکستان کے نام سے ایک اخبار نکلتا تھا اور اس کے ایڈیٹر میرے اُستاد تھے جو "حاجی یکل بطورۃ" کے نام سے کالم لکھتے تھے۔ حالانکہ ان کا اپنا نام حاجی صالح محمد صدیق تھا۔ مجھ سے ذرا بڑے تھے۔ اُن کا چھریرا بدن تھا۔ پان چباتے تھے اور نہایت پیارے آدمی تھے۔ میں بہت ہی خوش ہوں کہ مجھے ایسا اچھا اُستاد ملا۔ میں رات کو اُن کے ساتھ کام کرتا تھا۔ خبریں لینی، اُن کا ترجمہ کرنا، پھر انہیں چیف کاتب کو دینا۔ انہوں نے خوشخطی سے اُنہیں لکھنا۔ وہاں ایک کریڈ نکالنے والی پرانی وضع کی مشین ہوتی تھی جس سے انگریزی خبریں نکال کر ہم ترجمہ کیا کرتے تھے۔

میں یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کرتا رہا اور اپنے اُستاد کی داد بھی حاصل کرتا

رہا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ تو خبروں کا ترجمہ ہے اور اس میں تم بہت اچھا کام کرنے لگے ہو لیکن اب تمہیں رپورٹنگ بھی کرنی چاہیے۔

میں نے کہا کہ "سر وہ کیا ہوتی ہے؟"

کہنے لگے کہ "وہ ہم آپ کو بتائیں گے۔"

"آپ باہر نکلیں، سیاستدانوں سے ملیں۔"

اب اس زمانے کے سیاستدان بیچارے بڑے بھلے سے لوگ ہوتے تھے۔ دیسی سے آدمی تھے۔ ان کے پاس پیسے بھی تھوڑے ہوتے تھے۔ نیا نیا پاکستان بنا تھا۔

میں ایک دو سیاستدانوں سے ملا۔ ان سے کچھ ایسی گرما گرمی نہیں ملی جیسی آج کل ملتی ہے۔ آج کل تو ان سے پٹاخے دار خبریں اور بیان ملتے ہیں۔ اس زمانے میں اپنے علاقے کے ایک بڑے امیر آدمی سے ملا۔ اُن کا انٹرویو کیا، لیکن میں رپورٹنگ نہیں کر سکا۔

ایڈیٹر صاحب نے کہا کہ "رپورٹنگ اور چیز ہوتی ہے، یہ تو تم انٹرویو کر کے لائے ہو۔"

میں نے کہا کہ "پھر مجھے طریقہ بتائیں۔"

وہ کہنے لگے کہ "رپورٹنگ آپ کو اپنا آپ اپلائی کر کے، اپنے ارد گرد دیکھ کر اس سے نتیجہ اخذ کر کے ہوتی ہے اور اپنے ارد گرد سے ایک سٹوری بنانی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا کہ "ٹھیک ہے جی میں یہ کروں گا۔ اب میں سمجھ گیا ہوں۔"

چنانچہ میں نے لاہور میں مال روڈ پر ریگل کے پاس کھڑے ہو کر ایک ایسے شخص کو دیکھا جو نیلے رنگ کی عینک لگا کر سڑک کے کنارے کھڑا ہوتا تھا اور وہ ساتھ والے بندے سے کہتا تھا "مجھے سڑک کراس کرا دیں، آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

وہ بیچارہ نابینا تھا۔ جس کو درخواست کرتا وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو سڑک پار کرا دیتا تھا۔ ان دنوں مال روڈ اس طرح ٹریفک سے بھرپور نہیں تھی۔ وہاں وہ تھوڑی دیر ٹھہرتا تھا۔ پھر کسی اور نئے بندے یا کلائینٹ سے کہتا تھا کہ "مجھے سڑک پار کرا دیں آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

اب سڑک پار کرتے کرتے وہ اتنے مختصر عرصے میں ایک ایسی دردناک کہانی اس شخص کو سُناتا تھا جو اس کو سڑک پار کرا رہا ہوتا تھا کہ وہ بیچارہ مجبور ہو مگر اس

کو روپیہ دو روپے ضرور دے دیتا تھا۔

خواتین و حضرات ! میری رپورٹنگ یا حساب کے مطابق وہ شخص دن میں کوئی تہتر مرتبہ سڑک کراس کرتا تھا۔ اب میرے ہاتھ میں تو ایک بڑے ہی کمال کا واقعہ آ گیا۔ میں نے اس کے خلاف رپورٹنگ کی۔ اس زمانے میں کیمرہ ویمرہ تو ہوتا نہیں تھا لیکن کہانی بڑے کمال کی بن گئی اور جب وہ چھپی اور اس کا احوال لوگوں کے سامنے آیا اور اس کی چالاکی سے لوگ واقف ہوئے تو بڑی دھوم مچ گئی اور میری بڑی عزّت افزائی ہوئی۔ میرے اُستاد بھی مجھ سے خوش ہوئے۔ اس سٹوری کی وجہ سے اخبار دوبارہ بھی چھاپنا پڑا۔ اب میں پھولا نہیں سماتا تھا کہ میں نے کس قدر بڑا معرکہ سر انجام دے دیا ہے۔ میں نے اپنی ماں کو جا کر بتایا کہ میں اتنا نیک آدمی ہوں کہ تیرے بیٹوں میں اتنا نیک نہیں ہے۔ یہ دیکھو میں نے کیسا مضمون چھاپ دیا ہے اور لوگوں کا اس سے کتنا بھلا ہو گیا ہے۔

دو ماہ اور گیارہ دن کی مدّت گزر جانے کے بعد میں نے چھوٹے قد اور سانولے رنگ کا ایک آدمی دیکھا جو نیلی عینک لگائے داتا دربار کے پاس لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ مجھے سڑک پار کرا دیں آپ کی بڑی مہربانی اور لوگ اسے سڑک پار کرا رہے تھے اور وہ سڑک پار کرتے ہوئے اپنی داستانِ غم بیان کرتا تھا اور جو کچھ ملتا

لے لیتا تھا۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹھکا اور میں نے کہا کہ یہ اسی طرح کا ایک اور بندہ وہی کام کر رہا ہے۔ کوئی تین گھنٹے میں اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ شام کو فارغ ہو کر جانے لگا اور اس نے عینک اُتار کر اپنی جیب میں ڈال لی اور جو پیسے اس نے اکٹھے کیے تھے انہیں گننے لگا تو میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

میں نے کہا کہ "تم نے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔"

اب وہ گھبرا گیا اور ڈر گیا۔

میں نے کہا کہ "میں تمہیں ابھی پکڑ کر تھانے لے جاؤں گا۔ میں صحافی ہوں۔ ہم تو کسی کو چھوڑا نہیں کرتے۔"

تو اس نے کہا "صاحب میں مجبور آدمی ہوں۔ آپ میرے ساتھ ایسی زیادتی نہ کرنا میں مارا جاؤں گا۔"

میں نے کہا کہ "تم یہ کیوں کرتے ہو؟"

اس نے بتایا کہ وہ منٹگمری (آج کل کا ساہیوال) میں محکمۂ خوراک میں جونئیر کلرک ہے اور اس کی ۲۷۰ روپے کے قریب تنخواہ ہے۔ یہاں لاہور سے ایک

اخبار چھپا، اس میں مَیں نے ایک مضمون پڑھا جس میں بڑی تفصیل کے ساتھ ایک واقعہ تھا کہ ایک آدمی اس طرح سے جعلی نابینا بن کر لوگوں کو سڑک پار کرانے کو کہتا ہے اور پیسے بناتا ہے۔ یہ پڑھ کر مجھ پر اللہ کا فضل ہو گیا اور میں نے کہا کہ یہی کام کرنا چاہیے۔ اس سے میرا بھی بھلا ہو گا۔ میرے گھر والوں کا بھی بھلا ہو گا چنانچہ میں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہے اور میں اس سٹوری کے لکھنے والے کو اور اخبار کے مالک کو دُعا دیتا ہوں کہ وہ اس طرح سے میرا سہارا بنے اور مجھے گائیڈ کیا۔

میں یہ باتیں بڑی عاجزی کے انداز میں اور دست بستہ ہو کر کہہ رہا ہوں کہ شوماخر شیکسپیئر یا اشفاق احمد اپنی سوچ کے مطابق بات کرتے ہیں یا لکھتے ہیں لیکن آپ کا بھی ذہن ہے۔ آپ جس مقام پر بھی ہوں آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ ہمیں انفارمیشن سے کس طرح سے دور ہو جاؤں۔ ضروری نہیں کہ آپ کسی بہت بڑے رتبے پر فائز ہوں یا فلاسفر ہوں۔ جس طرح پھاوڑے سے گوبر کھینچا جاتا ہے، اس طرح سے آدمی اپنے اندر سے مَیں کو نکالے اور خود کو اس علم و دانش کے سپرد کرے جس کی توقع انسان سے خدا کرتا ہے۔

میں یہ بنی تنی بات ہی نہ کہہ دیا کروں کہ "بس یہی ٹھیک ہے۔"

میں غور ضرور کروں۔ گو مَیں نے اپنے تیئں وہ سٹوری لکھ کر اچھا کام کیا تھا لیکن وہ گھوم کر میرا طیب اور حلال بکرا اس طرح جھٹکے کا شکار ہو گیا۔ جب تک آپ کے اندر باطن کی قوّت موجود نہیں ہو گی، اس وقت تک آپ کے سارے اچھے کام میٹھے چاول پکا کر تقسیم کرنا، دیگیں بانٹنا، میلاد شریف میں تشریف لے جانا، فائدہ نہیں دے گا۔ جب تک باطن کی بیٹری چارج نہیں ہو گی تو سارے کا سارے ڈھنڈار ویرانہ رہے گا۔ اس میں پھول کلیاں نہیں کھلیں گی۔ مجھے اُمّید ہے آپ سارے اس پر توجّہ فرمائیں گے اور حلال بکرے کو حرام نہیں کریں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

”مسٹر بٹ سے اسلامی بم تک“

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔

زندگی پر کچھ دباؤ ایسے ہوتے ہیں کہ برداشت سے باہر ہو جاتے ہیں بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ جتنے بھی دباؤ ہیں اور جتنی بھی گھٹن ہے وہ انسان کو بہت پریشان کرتی ہے اور اکثر و بیشتر انسان اس دباؤ کے نیچے آ کر اتنا پریشان ہوتا ہے کہ اس کے پاس شکایت کا ایک ہی مسئلہ رہ جاتا ہے کہ میری حالت بڑی خراب ہے اور میں مشکل میں مبتلا ہوں۔

ہماری ایک عزیزہ ہیں، ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ شہید ہو گیا۔ وہ بڑی پریشان رہتیں۔ باوصف اس کے وہ تسلیم کرتیں کہ بیٹے کی شہادت کی صورت میں اللہ نے اسے بہت بڑا درجہ دیا ہے لیکن وہ کہتی ہے کہ میں انسان بھی تو ہوں اور انسان ہونے کے رشتے سے یہ جو دباؤ مجھ پر پڑا ہے، یہ بڑا تکلیف دہ ہے۔ ایک پروفیسر صاحب ان سے ملنے آئے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھیں اللہ نے آپ کو کچھ

علم عطا کرنے کے لیے سنگل آؤٹ کیا ہے اور کسی پر یہ دباؤ نہیں ڈالا بلکہ اس دباؤ کے لیے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ یہ آپ کی نشوونما کے لیے اور افزائش کے لیے بہتر ہو گا۔ گو ہماری عزیزہ نے پروفیسر صاحب کی بات نہیں مانی اور وہ ان سے بحث کرتی رہیں اور شاید وہ اس بحث میں ایک حد تک جائز بھی تھیں کیونکہ جب بھی ہم پر کوئی دباؤ پڑتا ہے اور ہم کسی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمیں سوائے رونے، شکوہ کرنے اور بسورنے کے کچھ نہیں آتا۔

وہ طاقت جو اللہ نے ہمیں عطا کی ہے اس سے ہم نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس سے فائدہ اٹھانے والوں میں مَیں بھی آپ کے ساتھ شامل ہوں۔ باتیں تو آجاتی ہیں لیکن عملی طور پر ہم کچھ نہیں کر پاتے ہیں۔

جب آپ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی پر کوئی دباؤ پڑتا ہے، کوئی پریشانی یا الجھن آن پڑی ہے تو اس وقت دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ یہ دباؤ جو مجھ پر پڑ رہا ہے اور میرے اندر جو گھٹن پیدا ہو رہی ہے کہ مجھے ایک نئی دنیا نیا سبق اور نیا باب عطا کرنے کے لیے ہو رہی ہے۔ وگرنہ خدا ظاہر ہے ناانصاف تو نہیں ہے۔ وہ آپ کو کچھ عطا کرنا چاہتا ہے اور اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ آپ کو چھوٹے سے دباؤ کے امتحان سے گزار کر چیک کر رہا ہے۔ جب کوئی بچّہ پیدا ہوتا ہے تو ماں کو تکلیف

میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کہیں سے بنا بنایا کسی ڈپارٹمنٹل سٹور سے مل جائے اور مجھے تکلیف برداشت نہ کرنی پڑے۔

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ جس تکلیف میں سے ڈیلیوری کے وقت ماں گزرتی ہے اور جو بچّہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنی ماں سے دس گنا زیادہ تکلیف میں سے گزرتا ہے پھر کہیں جا کر تخلیق ہوتی ہے۔

خواتین و حضرات! تخلیق ایسے ہی نہیں ہو جاتی۔ جب آپ بہت اعلیٰ درجے کے بیج کو سیڈ کارپوریشن سے خرید کر اسے پانی سے دھو کر طشتری میں رکھ کر اس پر پنکھی جھلتے رہیں اور ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھیں اور گانا گاتے رہیں گے تو اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ خراب تو پڑا پڑا ہو جائے گا، اُگے گا نہیں کیونکہ اسے اُگانے کے لیے زمین کے اندر دفن ہونا پڑے گا۔ اپنے مطلوبہ Process سے گزرنا پڑے گا۔ دھرتی کا بوجھ برداشت کرنا پڑے گا۔ اس مخصوص وقت کے لیے گھٹن سہنی ہو گی پھر جا کر وہ باہر سر نکالے گا اور پھر جا کر وہ کونپل بنے گا اور بوٹا بنے گا۔ یہ نہیں کہ Comfortable Situation میں وہ آرام دہ طریقے سے بوٹا بن جائے گا۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ جو دباؤ ہے، یہ جو مصیبت ہے، یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ اگر بیج پر یہ مصیبت نہ پڑے تو پھر دیکھئے کہ ہم پر گزرتی ہے۔

میری بیوی مجھے کہنے لگی کہ "یہ ہرا دھنیا بڑا واہیات ہے۔ دفع دُور اس میں تو کوئی خوشبو ہی نہیں۔ اس کے پتّے لچکدار ہیں نہ پھول نکلتے ہیں۔"

مجھے خیال آیا کہ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ میں نے جا کر اکبری منڈی سے کئی دکانوں پر تحقیق کرنے کے بعد پرانے زمانے کے خوشبودار دھنیے کے بیج دریافت کیے۔ انہوں نے مجھے وہ پرانے زمانے کے ایک گرام دھنیا کے بیج دے دیئے۔ میں نے انہیں گھر میں ایک چھوٹی سی کیاری میں بو دیا۔ انہیں پانی بھی دیتا رہا۔ ایک دن میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ وہ ہلکے ہلکے بیج زمین کے اندر پہنچنے کے بعد نمی حاصل کرنے کے بعد اور زمین کے اندر سخت چیخ و پکار کے بعد، جیسے ہم مشکل پڑنے پر کرتے ہیں، زمین سے سر نکال رہے ہیں۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی چیخ کر آواز دی۔ بانو بھاگ کر آؤ، بیج دنیا کا نازک ترین دھنیا کا پودا، پوری دھرتی پھاڑ کے باہر نکل آیا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اس ننھے سے بیج اور اس کے پودے میں کتنی معمولی طاقت

ہوتی ہے لیکن وہ گھٹن کے لمحے گزار کر زمین کا سینہ چیرنے میں بالآخر کامیاب ہو ہی جاتا ہے اور بوجھ برداشت کرنے کے بعد اس میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ وہ کرۂ ارض کو چھوڑ کر باہر آجاتا ہے۔

جو ہم مشکل پڑنے پر "بھیں بھیں" رونا شروع کر دیتے ہیں تو یہ بڑی ندامت کی بات ہے۔ ایک ننھا بیج اگر گھٹن اور سختیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے تو ہمیں جان کے لالے کیوں پڑ جاتے ہیں۔

لڑکیوں کو ایک لفظ ملا ہوا ہے Baba Why Me?

فلاں لڑکی تو بڑے مزے میں پھرتی ہے۔ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ بچے، ذرا انتظار کرو۔ اس مصیبت کے اندر سے ایک ایسی چیز پھوٹنے والی ہے جس کا ہمیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ ہم اگر اپنی زندگیوں کو دیکھیں تو ہم ایسی باتوں سے باہر نہیں نکلتے کہ ہمارے ساتھ ہی غلط ہو گیا۔ فلاں بندہ ہمارے پیسے لے کر بھاگ گیا۔ بھئی وہ تو بھاگ گیا ہے لیکن آپ کو بہت کچھ عطا کر کے چلا گیا ہے۔

جب ہم مسلمانوں کی بنا پڑی ہے یا مڈھ پڑا ہے تو خدا نے ہمارے لیے ایک جگہ

منتخب کی اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے کہا کہ "یہاں میرا گھر بناؤ۔"

اب بابا ابراہیم بیچارے، وہ ماننے والے تھے اور ان کی کمال کی شخصیت تھی۔ وہ جدُّ الانبیاء تھے۔ اگر آپ ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ کو ان پر اتنا پیار آ جائے گا کہ آپ آبدیدہ ہو جائیں گے۔ ایک وہ تھے اور ایک ان کے فرمان بردار بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السّلام تھے۔ ابّا خدا کے گھر کی تعمیر کے لیے گارا لگا رہے ہیں اور بیٹا اینٹیں پکڑا رہا ہے۔ لق و دق صحرا ہے کہ بندہ ہے نہ بندے کی ذات، نہ سایہ ہے نہ گھاس، وہاں پانی بھی نہیں ہے۔ اب سخت رونے کا مقام وہ ہے نا جی۔

کام بھی مل گیا ہے تعمیر کا اور کوئی سہولت بھی نہیں ہے۔

لیکن آپ ماننے والوں کو دیکھئے کہ وہ کس قدر طاقتور ہیں۔ انہوں نے حکم ملتے ہی کہا "بسم اللہ" یعنی اگر وہاں پر میں ہوتا اور میرے ساتھی دانشور ہوتے تو ہم اللہ میاں سے کہتے کہ اللہ میاں آپ نے یہ کوئی جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ یہاں Means of Communication ہونے چاہئیں۔ اچھی سڑکیں ہونی چاہیں۔ اسلام وہاں سے شروع ہونا چاہیے جہاں آنے جانے والے لوگ ہوں، گاڑیاں، ہوائی جہاز آتے ہوں۔ آپ نے کون سی فضول سی جگہ منتخب کر لی۔ اللہ

میاں معاف کرنا یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔

خواتین و حضرات! اللہ بہتر جانتا تھا، اپنے بندے کو بھی جانتا تھا اور جگہ کے انتخاب کو بھی۔ ہم نے یہی کہتے رہنا تھا کہ اگر اسلام کو پیدا کرتا ہے تو سوئٹزرلینڈ میں پیدا کرتا۔ ٹھنڈی ٹھار اور پیاری جگہ ہے۔ یہاں لوگ زیادہ مسلمان ہوں گے۔ ہم نے یہی دلیل دینی تھی کہ آسانیاں ہوں گی تو فائدہ ہو گا لیکن علیمِ مطلق بہتر طور پر جانتا ہے اور جب اللہ کا گھر اتنی مشکل کے بعد بن گیا، جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ گھر بن چُکنے کے بعد اللہ نے فرمایا کہ "اے ابراہیم اب یہاں اذان دے۔ لوگوں کو حج کے لیے بُلا۔"

اب ابراہیم حیران ہوئے ہوں گے کہ ہم یہاں دو اکیلے کھڑے ہیں۔ یہاں حج کے لیے کون آئے گا۔ اللہ نے فرمایا کہ "اے ابراہیم! تو لوگوں کو بُلا۔ لوگ چاروں اطراف سے چلتے آئیں گے۔ وہ لاغر اُونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں گے۔"

اس حکم کے بعد اذانِ ابراہیم گونجی اور دین کی روشنی وہاں سے پھوٹی۔ ہم سب جو آج یہاں بیٹھے ہیں اسی ریگستان کے دباؤ اور پریشر کی وجہ سے بیٹھے ہیں۔ ہم ایک ارب بائیس کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ مسلمان بیٹھے ہیں۔ یہ اسی ریگستان

کی رحمت کے باعث ہیں۔

ہم یہ جو ملازم پیشہ لوگ ہیں، انہیں باس ذرا سا وضاحت کا لیٹر بھیج دیں یا وضاحت مانگ لیں تو نہ دِن اچھے لگتے ہیں نہ راتیں۔ نہ گھر والے اچھے لگتے ہیں۔ خود کُشی کے سامان ہونے لگتے ہیں کہ ہائے یہ کیا ہو گیا۔ اگر ہم کسی اعلیٰ مرتبے والے شخص سے پوچھیں کہ اسے یہ مقام کیسے حاصل ہوا ہے تو ہمیں پتہ چلے گا وہ کس طرح قدم بہ قدم منازل طے کرتا ہوا نیچے سے اوپر آیا ہے۔ وہ کِن مشکلات سے گزر کر یہاں تک آیا ہے اور ان مشکلات نے اس کو کس طرح سے قدم قدم پر نیا جنم دیا ہے۔

خواتین و حضرات! جب پاکستان بنا ہے اور جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمارے ملازمین کو دینے کے لیے دو ماہ کی تنخواہ بھی نہیں تھی اور دباؤ اس قدر تھا کہ کوئی ہمارا سجن اور دوست نہیں تھا لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ وہ دباؤ اللہ کی بڑی مہربانی تھی اور اللہ نے ان مشکلات کی وجہ سے ہمیں برکت عطا کی اور جو ہمارے ہم عصر تھے، جو ہمارے ہی مذہب سے تھے اور اطلس و کمخواب میں لپٹے تھے۔ جن کے ہاں سے پٹرول کے کنویں اُبل رہے تھے اور سونے کی ٹونٹیاں استعمال کرتے تھے وہ

آگے نہیں بڑھ سکے۔ سارے عالمِ اسلام میں سے آپ کا ملک اللہ کے فضل سے سب سے آگے ہے۔ ساری دنیا کی نظریں اس پر جمی ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے مارو۔ یہ تو اس کے بارے میں ہی کہا جاتا ہے نا جس میں کچھ طاقت ہو اور جو آنکھوں میں کھٹکتا ہو۔ ساری خرابیوں کے باوجود جب میرے پاکستانی میرے پاس سے گزرتے ہیں تو میں دل ہی دل میں انہیں سلام کرتا ہوں۔ کوئی سراج دین جارہا ہوتا ہے، کوئی نور دین ہے، کوئی ڈاکٹر ہے اور کوئی وکیل ہے۔ اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود ایک لڑائی لڑ رہے ہیں اور بہادری کے ساتھ نبرد آزما ہیں۔

پلیز اللہ کے واسطے انہیںRun Downنہ کریں۔ ان کی مذمّت نہ کریں کیونکہ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک وہ پاکستان کو اس جگہ لائے ہیں اس میں انہیں کا کردار ہے، آپ کے لیڈر کچھ نہیں کر سکے۔ یہ اپنے اپنے مقام پر لڑتے ہیں۔ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ایک ایک انچ کے اوپر ہار نہ مانتے ہوئے انہوں نے ملک کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔ آج جب بڑی طاقتیں اس ملک کو تباہ و برباد کرنا چاہتی ہیں تو اس میں ضرور کوئی بات ہے۔ سارے عالمِ اسلام میں سے پاکستان واحد ملک ہے جو نیوکلیئر پاور رکھتا ہے۔ نہ ہمارے پاس پیسہ ہے نہ دھیلا ہے۔ ایک ایک ربڑ، ایک ایک پیچ جانے کہاں کہاں سے حاصل کر کے ہم نے

پاور حاصل کی ہے۔ ہم نے ایک فلم بھی دیکھی تھی" ISLAMIC BOMB" اس کا نام تھا۔

فلم میں ایک شخص پر کیمرہ لگایا ہوا تھا جس شخص پر کیمرہ لگا تھا اس کا نام مسٹر بٹ تھا۔ وہ فرانسیسی فلم تھی۔ مسٹر بٹ کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ یہ بڑا چالاک آدمی ہے جو پاکستانی ایمبیسی میں اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔

یہ اپنے دفتر سے نکلے گا اور کباڑیوں کی منڈی میں جائے گا اور ہدایات کے مطابق اس خاص قسم کے پیچ یا پُرزے کو تلاش کرے گا جو انہوں نے اپنے "اسلامی بم" جس کا انہوں نے قوم سے وعدہ کیا ہے اس میں استعمال کرنا ہے۔

وہ مسٹر بٹ گلگو سا تھا۔ وہ کمرے سے نکلتا ہے۔ اس نے اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوتے ہیں۔ دائیں بائیں دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی اسے Follow تو نہیں کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ کباڑیوں کی جانب چل پڑتا ہے اور اپنے ٹاسک پر کام شروع کر دیتا ہے۔ ہم نے اس نیوکلیئر پاور کے لیے ایک ایک چیز اکٹھی کی۔ ایک ایک تنکا اکٹھا کیا اور یہ صلاحیت حاصل کی۔ ساری خرابیوں کے باوجود ہم پاکستان نے اور فرانسیسی فلم کے مسٹر بٹ نے اور کئی لوگوں نے پرزہ پرزہ اکٹھا

کیا اور وہ پاور حاصل کی جسے دنیا "اسلامی بم" کہتی ہے۔

لمبی بات اس لیے کی کہ آپ باوصف اس کے کہ اپنے لوگوں میں بڑی خرابیاں ہیں انہیں اللہ کے واسطے بُرا نہ سمجھیں اور اپنے آپ میں یکجہتی پیدا کریں۔ اپنے لوگوں کو طعنہ نہ دیں، یہ عادت ختم کریں۔ اگر فرض کریں کہ کسی میں کوئی خرابی ہے، محلّے کا کوئی دکاندار کم تولتا ہے، ہیرا پھیری کرتا ہے، تو بجائے اسے کچھ کہنے کے، طعنے دینے کے، یا بُرا بھلا کہنے کے، اپنے گھر میں جائے نماز بچھا کر دو نفل پڑھیں اور خدا سے دُعا کریں کہ "اے اللہ میاں جی جو نورا، غفورا یا جو بھی دکاندار ہے تو اس کی مدد کر اور اس میں سے فلاں خرابی نکال دے۔"

آپ کو سات دن نہیں لگیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کا راستہ سیدھا ہونے لگے گا۔ اگر آپ اس کے ناک میں دم کریں گے، اسے کوسنے دیں گے، بے ایمان کہیں گے تو بات مزید خراب ہو جائے گی۔

حضور نبی اکرم ﷺ رحمت للعالمین تھے، ہیں اور رہیں گے۔ انہیں یہ ٹائٹل بندوں نے نہیں دیا وہ انہیں کسی اور جگہ سے عطا ہوا ہے۔ اگر اس رحمت کا ہم ذرا سا ذرہ اپنے اندر گھلا لیں اور تسلیم کر لیں کہ میں نے رحمت کا یہ زرّہ اس

ریگستان سے چُنا ہے جو انبیا کے رہنے کی جگی تو پھر وہ زرّہ آپ کی بڑی مدد کر سکتا ہے۔ اگر ہم اپنوں کے خلاف کالم لکھتے رہے، ایڈیٹوریل لکھتے رہے تو نفرتیں اور بڑھ جائیں گی۔ یقین کا دامن اور چھوٹتا چلا جائے گا۔ پھر آپ کبھی بھی ویسا حرم نہیں بنا سکیں گے جیسا حرم بنانے کی ہمیں آرزو ہے۔

اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

روشنی کا سفر

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچتے۔

آج سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ میں ایک رسالہ دیکھ رہا تھا تو اس میں ایک تصویر نما کارٹون تھا۔ جس میں ربڑ کی ایک بہت مضبوط کشتی گہرے سمندروں میں Deep Seas میں چلی جارہی تھی اور غالباً اس کشتی میں سوار لوگ کسی خاص قسم کی مچھلی کا شکار کرنے نکلے تھے (اس کارٹون سے اس قسم کا تاثر ملتا تھا) اس ربڑ کی مضبوط کشتی کے ایک طرف سوراخ ہو گیا اور سمندر کا پانی بڑے دباؤ کے ساتھ کشتی کے اندر داخل ہونے لگا۔ کشتی میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ ڈبّے، گلاس، اور مگ لے کر یا جو بھی کچھ ان کے پاس تھا، پانی نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کشتی کی دوسری سائیڈ پر جس طرف سوراخ نہیں ہوا تھا جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ انتہائی پُرسکون نظر آرہے تھے جس طرح ہم اس پروگرام میں بیٹھے نظر آرہے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ ہمیں بھی کشتی

سے پانی نکالنا چاہیے لیکن اس کے ساتھیوں نے کہا کہ دفع کرو یہ ہماری سائیڈ تھوڑی ہے۔ اس سے ہمارا کیا تعلّق۔ وہ خود ہی نکال لیں گے۔

خواتین و حضرات! انسانی رویّوں میں بڑی خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میرا اس سے کوئی تعلّق نہیں۔ میں الگ تھلگ اپنی ایک دنیا کا باسی ہوں۔ میرا اپنا ایک ماحول ہے اور میں باقی کی دنیا سے متعلّق نہیں ہوں۔ جیسے بش اور بلئیر (امریکی صدر جارج ڈبلیو بش اور برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر) سمجھتے ہیں کہ ہمارا ساری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم ایک مخصوص علاقے کے بندے ہیں۔ پانی اگر ایک سائیڈ سے آرہا ہے تو شوق سے آئے، ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

ہم اپنے انداز سے چلیں گے اور موج میلا کریں گے حالانکہ حقیقت میں ایسے نہیں ہے۔ ہم سارے کے سارے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔

جب زندگی میں بہت مشکل پڑتی ہے، بہت الجھنیں ہوتی ہیں (اللہ نہ کرے کہ آپ پر ایسی الجھنیں پڑیں جو آپ کی روح کے اندر تک اُتر جائیں) تو پھر آپ کو

احساس ہونے لگتا ہے کہ انسان کا انسان کے ساتھ تعلّق ہے۔ انسان غیر ارادی اور غیر محسوس طور پر دوسرے آدمی کے رد دھمال ڈالتا رہتا ہے۔ ہماری روح کا ایک حصّہ جو ہے اپنی مرضی سے خودبخود ایک چکر کاٹتا رہتا ہے جس کا تعلّق دوسرے لوگوں سے ہوتا ہے۔ باوصف اس کے کہ مجھے اپنا پڑوسی بہت بُرا لگتا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ کام کرنے والے بہت بُرے لگتے ہیں۔ مجھے اپنا باس زہر لگتا ہے لیکن میری وابستگی اس کے ساتھ ساتھ چلی آرہی ہے۔ خدانخواستہ آپ کا دادا یا آپ کے ابّا حضور جو ایک بہت خوفناک بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں اور حکیم اُن سے یہ کہے آپ کسی قسم کی غذا نہیں کھاسکتے یا اسے ہضم نہیں کرسکتے، لہٰذا آپ تین مُنقّہٰ سویز (بغیر بیج کے سوکھا ہوا بڑا انگور) کے دانے ہی صبح کے وقت کھائیں یہ آپ کے لیے کافی ہیں اور آپ جب اس مُنقّے کو لینے کے لیے بازار جاتے ہیں اور آپ کے لیے یہ ایک نئ چیز ہے کیونکہ آپ نے اس کا نام سُنا ہوتا ہے اسے دیکھا نہیں ہوتا تو آپ کے پہلو سے وہ بابا ضرور گزرتا ہے جو بلوچستان میں بڑا انگور بوتا ہے اور جہاں انگور اُگائے جاتے، اُن کھیتوں کھلیانوں کی آبیاری بھی کرتا ہے۔ ان کا خیال بھی رکھتا ہے۔ وہ آپ کے مریض ابّا کے لیے یا مریض دادا کے لیے انگور تیّار کررہا ہے۔ اس کو آپ کے ابّا یا دادا کا نہیں پتہ اور انہیں اس بابا کا نہیں پتہ لیکن انسان بھی ایک عجیب رشتے میں بندھا ہوا ہے۔ انسان

زمین، سورج، چاند، ستارے یہ آپس میں بندھ کے چلتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ سلسلہ ہمارے ارد گرد رواں دواں رہتا ہے اور یہی خیال بندے کو روشنی عطا کرتا ہے۔

بڑی دیر کی بات ہے، میں اس وقت تقریباً جوان ہی تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے ساتھ پروگرام بنایا کہ اس سال جب نیا سال طلوع ہوگا تو ہم وہ سال کسی کھلی جگہ یا کھلے علاقے میں منائیں گے۔ اسی شہر میں انہیں پرانے لوگوں کے ساتھ اس بار نہیں منائیں گے، کہیں اور ہی چلیں گے۔ ہم نے رینالہ خورد کا انتخاب کیا (یہ پتّوکی کے قریب ایک قصبہ ہے اور لاہور سے ساہیوال کے راستے میں آتا ہے) رینالہ میں میرے بھائی کا ایک مرغی خانہ تھا۔ وہ ویرانے میں تھا۔ ساتھ نہر تھی۔

ہم ۳۱ دسمبر کی صبح وہاں پہنچے اور ہمیں بتا دیا گیا کہ یہ کچّا کوٹھا آپ کا ہے اور آپ یہیں رہیں گئے۔ وہاں مرغیوں کے رہنے کے لیے پکّے کوٹھے تھے جبکہ بندوں کے رہنے کے لیے نہایت واہیات قسم کے کچّے کوٹھے تھے لیکن اب ہم کیا کر سکتے تھے۔ مجبوری تھی کہ نئے سال کی شروعات گھر سے باہر اور کھلے مقام پر ہی کرنی تھی، عزم جو کر رکھا تھا۔

جب ہم نے وہاں اپنا اڈہ جما لیا تو میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ ”بانو دیکھو یہاں سردی بہت ہوتی ہے“

بانو کہنے لگی کہ ”کچّی دیواروں سے سردی اور گرمی نہیں آتی۔“

میں نے کہا کہ ”Scientifically تو ٹھیک ہے لیکن سائنس سے ماورا ایک جسم بھی ہوتا ہے جو گرمی و سردی کو ایک اور طرح سے محسوس کرتا ہے۔“

آپ نے کئی بار دیکھا ہوگا کہ آپ دن بھر کام کرتے رہتے ہیں اور ایک نارمل سا دن گزارتے ہیں۔ اگلے دن اخبار میں پڑھتے ہیں کہ کل ۱۱۷ ڈگری فارن ہائیٹ درجہ حرارت تھا۔ آپ کہتے ہیں توبہ توبہ کل اس قدر گرمی پڑی ہے لیکن آپ کو پتہ نہیں چلتا ہے۔ میں نے بانو سے کہا کہ ”سائنس اور تھرمامیٹر والی گرمی یا سردی اور ہے۔ بدن اور روح کی گرمی اور ہے۔“

میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ ”میں تمہیں warn کرتا ہوں کہ سردی سے بچنے کا خصوصی تجربہ ہونا چاہیے۔ مجھے علم ہے کیونکہ میں ایک پینڈو آدمی ہوں۔ میں نے دیہاتوں میں سردیاں گزاری ہوئی ہیں۔“

اس نے کہا کہ ”پھر ہم کیا کریں گے؟“

میں نے کہا کہ ''ہم دن بھر لکڑیاں یا ایندھن اکٹھا کریں گے اور شام کو اپنے کمرے میں ایک چھوٹا سا آلاؤ جلائیں گے۔ اس طرح کمرہ گرم رہے گا تو آسانی رہے گی۔''

میری بیوی بھی کہنے کہ ''ٹھیک ہے۔''

ہم دن بھر نہر کی پٹڑی کے کنارے ایندھن اکٹھا کرتے رہے۔ ہم نے کیکر کے درختوں کی چھال اور سوکھی ہوئی ٹہنیاں اکٹھی کیں اور سارا دن اس دوران ''بیے'' کے گھونسلے دیکھتے رہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ بیا پرندہ بڑا خوبصورت گھونسلا ڈالتا ہے۔ وہ بغیر آرکیٹیکٹ کی مدد کے اپنا گھر بڑا خوبصورت بناتا ہے۔ اس کے گھونسلے کے کئی حصّے ہوتے ہیں، کئی پورشن بناتا ہے۔ اس کی بیوی اور بچّوں کے رہنے کا کمرہ الگ ہوتا ہے۔ اس کا اپنا کمرہ الگ ہوتا ہے۔ اس نے دانے الگ سے سٹور کئے ہوتے ہیں۔ ہم زمین پر گرا بان اکٹھا کر کے اپنی کُچّی کو ٹھڑی میں رکھتے رہے۔ جب شام ہوئی تو ہم نے باہر سے ہی اینٹیں لا کر ایک گز لمبا اور ایک گز چوڑا ''چوبچہ'' سا بنالیا تا کہ اس میں لکڑیاں رکھ کر آگ لگا سکیں۔

مجھے خوشی کی گھڑیوں والا وہ دن اب شدّت سے یاد آ رہا تھا۔ اس دن ہم نے

عجیب سی ایک خوشی محسوس کی تھی۔ جب سردی اُتری تو ہم نے وہاں آگ جلائی اور دروازہ بند کر لیا۔ ہم دونوں میاں بیوی وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور سردی دروازے کے چھیدوں سے اندر آنے کی کوشش کرتی رہی۔ ہم ہر طرح کی بات اور ہر طرح کے فلسفے محوِ گفتگو رہے اور آگ جلتی رہی۔ آدھی رات کے وقت وہ آگ بجھے لگی اور تہہ نشین ہوتی گئی اور کمرے میں تاریکی ہوئی اور جو آگ کی روشنی کے سائے کمرے کی دیواروں پر پڑ رہے تھے وہ بھی ختم ہو گئے۔

اس اندھیرے سے گھبرا کر بانو قدسیہ نے کہا کہ ''کیا اب اندھیرا ہی رہے گا؟''

میں نے کہا کہ ''ہاں مجبوری ہے۔''

تاریکی میں بھی کچھ وقت گزارنا چاہیے۔ وہاں ایک Angle Iron کا چھوٹا سا ٹکڑا پڑا تھا۔ میں نے اسے لے کر وہ بجھتی ہوئی آگ کُریدنی شروع کر دی اور میں اسے ''پھرولنے'' لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ جوں جوں لکڑی کا کوئی ٹکڑا جو نیم جلا تھا وہ جب دوسرے کے ساتھ جڑتا تو وہ دھک سے روشن ہو جاتا۔ جوں جوں وہ ایک دوسرے سے الگ ہوتے تو وہ بجھ جاتے اور تاریکی بڑھ جاتی۔ چنانچہ میں نے ایک خاص وضع

کے ساتھ اُن کو اکٹھا کرنا شروع کیا اور جب میں نے انہیں بجھتے شعلوں کے ساتھ رکھا تو پھر سے کمرہ روشن ہو گیا اور کمبل میں لپٹی میری بیوی کا سایہ اتنا بڑا ہو گیا جتنا پہلے نہیں تھا۔

میں نے بانو سے کہا کہ "دیکھو روشنی کا کھیل بھی عجیب ہے۔ جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو چھوٹے آدمیوں کے سائے بھی بڑے بڑے ہو جاتے ہیں اور اللہ بھی یہ بار بار کہتا ہے کہ ہم تم کو ظلمات اور اندھیرے سے روشنی کی طرف لائے ہیں۔ روشنی اللہ کا ایک بہت بڑا پیام ہے۔"

اللہ خود ہی اپنے حوالے سے بتاتا ہے کہ ترجمہ: "اللہ آسمانوں اور زمینوں کا ایک نور ہے۔ وہ شمع دان کے اندر جلتی ہوئی ایک بتّی ہے جو ایک ایسے تیل سے روشن ہے جو نہ مشرق کا ہے نہ مغرب کا ہے اور نہ ہی وہ تیل ہے۔"

خواتین و حضرات! اللہ تعالیٰ روشنی کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔

جو بڑا آرٹسٹ ہوتا ہے جب وہ اپنی پینٹنگز بناتا ہے تو سفید رنگ استعمال نہیں کرتا۔ وہ سفید رنگ والی جگہ چھوڑتا جاتا ہے۔ میں اٹلی میں رہا ہوں اور میں نے وہاں آرٹسٹوں کو کام کرتے بہت دیکھا ہے۔

وہ دوسرے رنگ بکھیرتے جاتے ہیں اور سفید جگہ کو ضرورت کے مطابق چھوڑتے جاتے ہیں۔ اس سے ظلمات ایک طرف ہوتا جاتا ہے اور نور ایک طرف رہتا ہے اور تصویر کی پوری ماڈلنگ ہو جاتی ہے۔

خیر ہم اس کچّے کمرے میں جلتے الاؤ میں اپنے سائیوں کو دیکھتے رہے اور خوش ہوتے رہے اور روشنی کی خوبصورت نعمت کو محسوس کرتے رہے۔ ہم نے اندازہ کیا کہ روشنی تب آتی ہے جب دو چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھیں۔ جب الگ الگ ہو جائیں گی پھر روشنی نہیں ہو گی۔ پھر ظلمات ہو گا، وابستگی بہت ضروری ہے۔ بندے کا بندے سے تعلّق ضروری ہے۔ چاہے اسے پتہ ہو چاہے نہ پتہ ہو۔ ہم کسی سے چاہے کتنی ہی نفرت کریں لیکن تعلّق کا ایک دائرہ ہمیشہ آپ کے گرد کام کرتا رہتا ہے اور آپ کو تقویت فراہم کرتا رہتا ہے جبکہ آپ اکیلے اپنے آپ کو اتنی تقویت نہیں بخش سکتے۔ کبھی بھی آپ اپنے بوٹ کے تسمے خود کھینچ کر اپنے آپ کو ہوا میں نہیں اُٹھا سکتے۔ کوئی بندہ آپ کو ''جپھی'' ڈال کے اُونچا اُٹھا سکتا ہے۔ مجھے روشنی سے ایک بات یاد آ گئی۔ بڑی توجّہ طلب اور لطیف بات ہے۔ ایک زمانے میں بہاولپور کے ایک گنّے کے کھیت میں ایک گنّے کے ٹانڈے پر سورج کی چمکدار سنہری روشنی پڑتی ہے اور وہ صبح سویرے پڑ

رہی ہوتی ہے اور زمین Rotate کرتی ہے۔ سات منٹ کے بعد وہ گنّے کا ٹانڈا اس روشنی سے نکل جاتا ہے۔ سات منٹ تک وہ ٹانڈا روشنی کو Absorb کرتا ہے۔ پھر وہ روشنی دوسرے ٹانڈوں پر یا کھیت پر پڑتی جائے گی۔ جب اس ٹانڈے پر وہ روشنی پڑ چکی تو وہ ٹانڈا کٹا اور کٹ کے شوگر فیکٹری میں گیا۔ وہاں وہ کرش ہونے کے بعد پانی میں تبدیل ہوا پھر اس کی بوری بھری گئی۔ اب وہ بوری کسی طرح سے سفر کرتی ہوئی ہمارے ہاں لاہور پہنچی۔ پھر دکاندار سے ہمارے ریستوران یا ٹی ہاؤس کے بندے نے کلو دو کلو چینی خریدی۔ ادیب آرٹسٹ لوگ وہاں بیٹھے تھے۔ میں نے وہاں سراج سے کہا (جو ٹی ہاؤس میں بڑا ہی پیارا بیرا ہے) کہ چائے کی ایک Strong سی پیالی لاؤ۔ اب اس نے ایک کی بجائے دو بلکہ سوا دو چینی کے چمچ اس چائے میں ڈالے اور وہ چائے مجھے دی۔ میں وہ چائے پی کر وہاں سے باہر نکلا اور اپنی سائیکل اُٹھائی (یہ میں اپنے کالج کے زمانے کی بات کر رہا ہوں) میری وہ سپورٹس سائیکل تھی۔ چلنے سے پہلے میں نے اس کی ڈائنمو کو اس کے ٹائر کے ساتھ لگایا۔ میں نے اس چینی سے اپنے اندر پیڈل پاور پیدا کی اور پیڈل چلانا شروع کیا۔ پھر میری سائیکل کے ٹائر سے لگی ڈائنمو سے بجلی پیدا ہو کر میرے سائیکل کی بتّی میں آئی تو ساری سڑک میرے سامنے روشن ہو گئی۔

خواتین و حضرات! یہ وہی روشنی تھی جو سورج نے گنّے کو عطا کی تھی۔ یہ رشتے میں بندھی ہوئی کس طرح سے میرے پاس آئی اور اب میں اس روشنی کو پہچانتا تھا اور میں چلا جا رہا تھا۔ ہم رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں اور انہیں توڑنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے پر حملے کرتے ہیں۔

52 طیارے بھیج کر اُن کو مارتے ہیں جو ہمارے وجود کی روشنی ہیں، جو ہماری روح کا ایک حصّہ ہیں۔ اس حوالے سے بندوں کو دانش اور عقل کب آئے گی۔ اس بارے میں ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم کتنے ہی محبّت کے گیت گائیں، کتنے ہی ہاتھوں کے ہار یا زنجیریں بنا لیں، ہم سے یہ نہیں ہو سکے گا جس کی ہماری روح کو آرزو ہے۔ ہمارا نفس تو چاہے گا کہ میرے سوا اور کوئی نہ ہو اور میرے گُن گائے جائیں، لیکن یہ بات یاد نہیں کہ آپ کی پروڈکشن کی، آپ کی گائیکی کی، آپ کے فن کی اور شاعری کی جب بھی تعریف ہوئی کوئی بندہ ہی کرے گا۔ اگر آپ بندوں کو مار دیں گے تو پھر کوئی تعریف بھی نہیں کرے گا۔ جس طرح لوہے کے ایک تکونی ٹکڑے سے بجھتی ہوئی ”چیروں“ کو ایک دوسرے کے قریب کرنے سے روشنی چھوٹی تھی اور سایہ بڑا ہوا تھا، اسی کی ضرورت ہے۔ قد بڑا کرنے کے لیے یکجا ہونے کی ضرورت ہے۔

خواتین و حضرات! کسی نہ کسی طرح سے کسی نہ کسی روپ میں ہم کو باہم ہونا ہی پڑے گا۔ ہم اپنے غرور اور تکبّر کے سبب الگ ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا ممکن نہیں ہوتا ہے۔

آپ کبھی اکیلے میں بیٹھ کر اس پر ضرور غور کیجئے گا اور لاشُعور کی دنیا میں جا کر غور کیجئے گا تو یقیناً آپ کسی مثبت نتیجے پر پہنچ پائیں گے۔

حضور کا فرمان ہے کہ "کسی کو کچھ نہیں دے سکتے تو ایک مسکراہٹ ہی دے دو۔ یہ بھی ایک صدقۂ جاریہ ہے۔"

آدمی اگر مُسکراہٹیں ہی لوگوں کو عطا کرتا رہے تو روشنی میں بڑا اضافہ ممکن ہے اور ہم جیسے بہت ہی کوتاہ قد آدمی اور نمانے بندے ان لوگوں کو بڑی شکست دے سکتے ہیں جو دنیا میں تاریکی پھیلا رہے ہیں۔ جنہوں نے دنیا کو ظلمات کے اندھیروں میں لپیٹ رکھا ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

تصوّف اور کامیاب ازدواجی زندگی

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

ہمارے اس زرعی اور مویشیوں سے بھرے ملک میں ایک اصول ہے کہ کچھ "گھوڑی پال مربّعے" دیئے جاتے ہیں۔ شاید آپ کو اس بابت معلوم ہو یا نہ ہو۔ پہلے میں بھی نہیں جانتا تھا لیکن یہ پتہ ضرور ہے کہ کچھ گاؤں میں گھڑ فارم بنتے ہیں، جہاں نہایت اعلیٰ نسل کے گھوڑے پالے جاتے ہیں اور پھر انہیں ملک کے مختلف حصّوں میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے بڑے بھائی کو ریس میں گھوڑا داخل کرنے کا شوق چرایا۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی کیوں نا ریس میں اپنا ایک اچھا سا گھوڑا داخل کریں اور ہمارا گھوڑا بھی اوّل انعام لے کر آئے۔

انہوں نے مجھے اس کام پر معمور کیا کہ میں جا کر Stud Farm والوں کو ملوں اور اُن کے ساتھ گفت و شنید کر کے گھوڑا حاصل کروں، کیونکہ وہ بہت مشکل سے دیتے ہیں۔

پتّوکی اور اوکاڑہ کے درمیان ایک جگہ ہے۔ وہ گاؤں ہے۔ مجھے وہاں ایک صاحب سے ملنا تھا جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو ان کا بڑا پیارا خوبصورت اور صاف ستھرا سا گھر تھا۔ اس گھرانے میں دو بیٹے تھے جو کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے اور ایک بیٹی تھی جو ماں کا گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتی تھی اور ایک ابّا تھے۔ ان کا نام تھا صدیق خان۔ جب میں اُن سے ملا تو بڑی حیرت بھی ہوئی کہ میں ان سے پہلے بھی دو مرتبہ مل چکا تھا۔ وہ ہمارے بابا جی سے ملنے ڈیرے پر دو بار آئے تھے اور وہ بڑے سوال لے کر آئے تھے اور بڑے جواب لے کر اور جھولی بھر کے واپس گئے تھے۔

اُن سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ پہلے آپ مجھ سے یہ وعدہ کریں کہ آپ ہمارے رحمت خانے پر تین چار دن قیام کریں گے اور میں اس سے پہلے آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ جب انہوں نے ”رحمت خانے“ کا لفظ استعمال کیا تو میں چونکا کیونکہ یہ ہمارے بابا جی کا حکم تھا کہ اپنے گھر کے لیے ”غریب خانے“ کا لفظ کبھی نہ استعمال کیا کرو۔ یہ بڑی ہیٹی کی بات ہے کہ آپ اپنے گھر کو غریب خانہ کہیں۔

جس گھر میں اللہ کی رحمتیں ہیں، برکتیں ہیں، اولاد ہے، رزق ہے، روشنی ہے،

چھت ہے وہ تو رحمت خانہ ہے۔ خیر یہ Term بہت کم استعمال ہوتی تھی۔ میں صدیق کی یہ بات سُن کر بڑا خوش ہوا۔ میں نے کہا کہ ہاں میں ضرور رُکوں گا۔ ان کے ساتھ رہنے میں جس بات کا بہت اچنبھا ہوا اور جس کو میں ٹھیک سے سمجھ نہیں سکا وہ یہ ہے کہ اُن گھر والوں کے درمیان ایک ایسی گفتگو ہوتی تھی ہلکی اور دھیمی سی جو میری سمجھ اور دانست سے باہر تھی۔ میں اُن سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ کس کی بات کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تجسس کا حکم بھی نہیں ہے۔ یہ اچھا نہیں ہے کہ آدمی "کنسویاں" لیتا پھرے جیسے ہمارے معاشرے میں رواج ہے کہ دیکھو اس کے گھر میں کون آیا ہے، کون باہر گیا ہے۔ اس کی قرآن پاک میں بڑی سخت ممانعت ہے کہ آپ لوگوں کے کبھی تفتیش نہ کرتے پھریں۔ اللہ عیبوں کو چھپاتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ رواج عام ہے۔ پتہ نہیں ہم نے یہ کہاں سے لیا ہے۔

اب میرے اندر بھی بہت کھُدبُد ہوتی تھی لیکن میں اُن سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ جب ہم باہر سے گھوم پھر کے یا چکر لگا کر آتے تھے وہ اپنی بیوی سے پوچھتے کہ "کیسی ہو؟"

وہ کہتی کہ "خوش آں۔" (خوش ہوں)

وہ کہتے "الحمدللہ، بڑی اچھی بات ہے۔"

پھر ان کی بیٹی کسی دن کہتی کہ "ابّا وہ آتے نہیں بالا خانے سے، پتہ نہیں ہم سے کیا کوتاہی ہوئی ہے۔"

اب میں متجسس ہو جاتا کہ یا اللہ یہ کیا بات ہے۔

کبھی اُن کا بیٹا ٹریکٹر کھڑا کر کے آتا اور کہتا کہ ابّا میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معیار پر پورے نہیں اُتر سکیں گے جو معیار ہم نے اپنے لیے قائم کر دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس سے باہر نکلیں۔ کیونکہ ہم بہت چھوٹے لوگ ہیں۔ اِس پر اُس کے ابّا کہتے تھے کہ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس میں کامیاب ہوں گے۔"

وہ جو صدیق صاحب تھے، وہ پولیس کے ریٹائرڈ انسپکٹر تھے اور وہ کانسٹیبل سے ترقّی کر کے ایک رینکر کی حیثیت سے اپنی صلاحیت کی بدولت اس عہدے تک پہنچے تھے۔ وہ نہایت ایماندار آدمی تھے۔ انہیں "ستّو والا انسپکٹر" کہتے تھے کیونکہ وہ دو پوٹلیاں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے، ایک شکر کی اور ایک ستّو کی۔ جب بھی کہیں جانا ہوتا تھا، تفتیش کے لیے تو وہ اپنی یہ دو پوٹلیاں ساتھ لے کر

جاتے۔ کسی سے کوئی چیز نہیں لیتے تھے۔ رشوت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پانی بھی کسی کے ہاں سے نہیں پیتے۔ صبح وشام ستّو گھول کر پی لیتے تھے۔

خواتین و حضرات! جب حضرت علی کی قوّت یا قوّتِ حیدری کا ذکر کیا جاتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ اس وقت کا ایک عنصر جَو کی روٹی بھی تھی اور یہ ستّو جَو کے بنتے ہیں۔ صدیق صاحب نے کی بھی یہیں سے سیکھا ہو گا کہ جَو میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور وہ ستّو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ تھانے میں بھی جب تک وہ ایس ایچ او رہے وہ دوپہر کے کھانے کے طور پر ستّو گھول کر ہی پیتے تھے اور وہ اس بارے بڑے محتاط تھے کہ اُن کے قریب رزق، حرام نہ آنے پائے۔ کوشش تو ان کی دیکھی تھی کہ رزقِ حرام اُن کے تھانے کے قریب نہ آئے لیکن یہ بڑا مشکل کام تھا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد انہوں نے Stud Farm کی Management اپنے ذمہ لے لی اور وہ بہت کم تنخواہ پر یہ کام بڑی توجّہ سے کرتے تھے۔ جب میرا اُن کے گھر سے چلنے کا وعدے کے مطابق آخری دن آیا تو بیٹی نے کہا کہ ” ایک بڑی بھول ہو گئی اور وہ بھول ناراضگی کا باعث ہے۔ ہمارا گھر تو بہت پیارا گھر ہے۔“

اس کے ابّا نے کہا کہ ”کیا ہوا۔۔۔؟“

وہ کہنے لگی کہ "ایک بندہ آیا تھا دوپہر کے وقت، تب گرمی بہت تھی۔ اس شخص نے ہمارے گھر دستک دی اور کہا کہ کیا کوئی پرانا دستر خوان گھر پر ہے، کوئی پھٹا پرانا تولیہ یا کوئی کپڑے کا ٹکڑا۔ گرمی بہت ہے۔ مَیں نے لمبا سفر کرنا ہے اور چاہتا ہوں کہ اسے سر پر رکھ لوں تاکہ لُو اور تپش سے محفوظ رہ سکوں۔"

اس پر امّاں نے کہا کہ "گھر میں ایسی چیزیں بکھری پڑی تھوڑی ہوتی ہیں۔"

اس شخص نے کہا کہ "کوئی بوری کا ٹکڑا ہی دے دیں۔"

لیکن امّاں نے کہا کہ "ہمارے پاس نہیں ہے۔"

اس پر وہ شخص چلا گیا۔ وہ سائل تھا اور سائل بارے بڑا سخت حکم ہے کہ سائل کو جھڑکی نہ دو۔ ہم سے یہ بھول ہو گئی ہے۔ اب ہم اس سے معافی کیسے مانگیں، اس کا پراسچت کیسے کریں۔

وہ اسی پریشانی میں تھے کہ مَیں چلا گیا۔ کچھ دِنوں کے بعد یا ہفتوں کے بعد مجھے دوبارہ لوٹ کے آنا تھا۔ میں وہاں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہاں رہا اس دوران میں نے اُن سے کہا کہ "یار میں تو تجسس سے بھرا ہوا تھا۔ آپ یہ بتائیں کہ یہ جو آپ کے گھر میں رہتے ہیں یہ آپ کے بزرگ ہیں یا پیر ہیں۔ یہ کون ہیں

جو مجھے نظر نہیں آتے یا میں اُن سے نہیں مل سکا یا آپ نے جان بوجھ کے مجھے اُن سے نہیں ملوایا، یہ کون ہیں؟"

اس نے کہا کہ "یہ پیر صاحب نہیں ہیں۔ یہ اللہ میاں ہیں، ہمارے گھر میں اللہ میاں رہتے ہیں اور ہم نے اپنی زندگی اللہ کو خوش کرنے کے لیے وقف کر دی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے اللہ میاں کو خوش کیا جائے۔"

میں نے کہا کہ "یہ عجیب وغریب بات تو میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی۔"

آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں۔

وہ کہنے لگے "میں بڑا نیک، پاک، صاف اور عادل تھانیدار تھا اور میں رزقِ حرام سے بہت گھبراتا تھا اور ہمیشہ حلال کی تلاش میں رہا اور اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ میں اپنے اس وعدے پر جو میں نے اپنی ذات کے ساتھ اور اللہ سے کیا تھا اس پر پورا اُترا ہوں لیکن ایک سٹیج پر میں نے محسوس کیا کہ میری نیکی، میری خوبی، میرا التقویٰ، یہ سارے کا سارا لوگوں کو خوش کرنے کے لیے وقف تھا کہ لوگ کہیں کہ کیا کمال کا تھانیدار ہے۔ میں ایک خوفزدہ شخص تھا جو لوگوں کے ڈر سے نیک بنا ہوا تھا۔ (یہ ذرا سی باریکی بات ہے میں بھی دیر سے سمجھا

تھا)۔"

میں نے پھر یہ کوشش کی کہ "میں بندوں کا ڈر دل سے نکال دوں اور میں اپنے اللہ کو خوش کرنے کے لیے کچھ کروں۔"

ہم نے سوچا کہ یہ ہمارا گھر ہے۔ بنا بھی صاف ستھرا ہے اور ہم اپنے اللہ میاں کو اپنے گھر ہی لے آتے ہیں اور اُن کی بڑی مہربانی کہ وہ آ گئے اور وہ یہاں رہتے ہیں اور یہاں تشریف فرما ہیں۔ اب ہماری دن رات کی کوشش رہتی ہے اور ہم ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کہیں کوئی ایسا عمل تو سرزد نہیں ہو گیا کہ اس سے اللہ ناراض ہو جائے یا کوئی ایسی خوشی کی بات کہ جس سے اللہ خوش ہوا ہو، ہم اس کے درمیان گھومتے رہتے ہیں اور ہماری زندگی کا مرکز ملجا و ماور اللہ کی ذات ہے اور ہم بندوں سے منسلک ہو گئے کہ اگر اللہ سے محبّت کرنی ہے تو پھر بندوں سے محبّت ضروری ہے۔ اگر بندوں کی خدمت کرنی ہے تو اللہ کے لیے کرنی ہے۔ بندوں سے کسی صلے یا انجام کی توقع نہیں رکھنی۔

خواتین و حضرات! میں اس کی بات سُن کر بہت حیران ہوا۔ میں نے کہا کہ "پریشانی کیا تھی؟"

وہ کہنے لگا کہ "پریشانی یہ تھی کہ میری بیوی نے جو اس سائل کو خالی ہاتھ واپس کیا تھا اور جھٹک دیا تھا تو ہم سارے مایوس ہو گئے تھے کہ اب اللہ تعالی ہمارے گھر قیام نہیں کریں گے کیونکہ یہ خدا ہی کا حکم ہے کہ سائل کو وہ جھڑ کا جائے۔ اس پر میری بیوی کی طبیعت پر ایسا بوجھ پڑا کہ وہ خودکُشی کے قریب پہنچ گئی۔ وہ ایک دن بہت سارے دستر خوان اور کپڑوں کے ٹکڑے خرید کے لائی اور انہیں کڑی دھوپ میں سر پر رکھ کر کھیت کی طرف جارہی تھی اور وہ بے چارگی کے عالم میں جارہی تھی۔ آگے میرا بیٹا ٹریکٹر چلارہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ماں ایسے ہی چلی جا رہی ہے۔ وہ ٹریکٹر سے اُترا اور پوچھا کہ ماں کہاں جارہی ہو؟"

اس نے جواب دیا کہ "مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی ہے۔ میں نے سائل کو اس طرح سے جھڑک دیا ہے اور اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں۔"

اب اس خاتون پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

صدیق نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے کہا کہ "ماں کوئی بات نہیں، ہمارے پاس ایک بڑی اچھی چیز ہے۔ وہ اللہ نے ہی دی ہے اور اس کا نام معافی ہے۔"

خواتین و حضرات توبہ اور معافی اتنی اہم چیز ہے جو بار بار لوٹتی ہے اور ہم بار بار

کرتے ہیں۔ یعنی اس میں بڑا مزہ ہے۔

اس لڑکے نے ماں سے کہا کہ وہ اتنی آسان چیز ہے اور یہ اللہ نے ہمیں عطا کر رکھا ہے اور اللہ کی گود میں واپس جانے کے لیے اور اس کے وجود سے وابستہ ہونے کے لیے ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ توبہ ہے۔ وہ ٹریکٹر چلاتا تھا اور اس نے ویسی ہی مثال دیتے ہوئے ماں کو سمجھایا کہ ماں توبہ اتنا اعلیٰ درجے کا جیک ہے کہ اگر ہم اسے ٹریکٹر کے نیچے لگائیں تو اسے بھی اُٹھا لیتا ہے۔ آپ اپنا توبہ کا جیک لگائیں۔ اس کا لیور کھینچی جائیں اور آدمی اُوپر چلا جاتا ہے۔

اگر کسی نے اللہ کے ساتھ وابستہ ہونے کا کوئی پروگرام بنایا ہے تو اللہ سے کہے کہ جنابِ عالی! بھول ہوئی، معافی دے دیں۔ اب یہ کوتاہی سرزد نہیں ہو گی۔ سچّے دل سے کہیں اور توبہ فوری قبول۔

میں اس گھرانے کو دیکھ کر جہاں حیران ہوا وہاں بڑا خوش بھی ہوا اور دُعا دی کہ یا اللہ ہم کو بھی اس میں سے تھوڑا سا حصّہ عطا کر دے۔ ہم بھی تو پوری زندگی میں ایسی کوئی کوشش کریں کہ جس سے اللہ کو خوش کرنا مقصود ہو۔

جب میں پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی زندگی میں کوئی ایسا فعل یا کوشش نظر

نہیں آتی ہے۔ میں تو دنیا اور اہل و عیال کو خوش کرنے پر ہی لگا رہا اور معاشرے میں معتبر ہونے کے چکروں میں ہی لگا رہا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہمارے سارے "ٹبّر" (گھرانے) کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ایک دن ہماری اِن کوششوں کے بدلے ہمارا اللہ ہم سے کہہ دے کہ "میں تم سے راضی اور تم مجھ سے راضی، آجاؤ میری جنّت میں داخل ہو جاؤ۔"

انہوں نے کہا کہ "اسی حال کا مستقبل بننے والا ہے (انہیں بابا جی کا فقرہ اچھی طرح یاد تھا) اگر آپ کا حال جنّت کی طرف مائل نہیں ہے تو پھر اس کا مستقبل ویسا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو اپنی اس زندگی کو بھی جنّت کا نمونہ بنا کر رکھنا ہو گا۔"

ایک مرتبہ میں نے بابا جی سے اس کیفیت میں کہ ہم بارہ تیرہ برس تصوّف اور صوفی ازم کا درس لے کر تھک گئے تھے پوچھا کہ "جی یہ تصوّف ہوتا کیا ہے؟"

وہ کچھ عجیب موڈ میں تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ انہوں نے تین دفعہ ایک عجیب انداز میں ہاتھ اُٹھا کر کہا کہ "کامیاب ازدواجی زندگی کا نام تصوّف ہے۔"

میں نے کہا کہ "یا اللہ! یہ بابا جی کو کیا ہو گیا ہے۔ کہاں تصوّف اور کہاں ازدواجی

زندگی۔"

لیکن خواتین و حضرات! اب جوں جوں وقت گزرتا جارہا ہے اور میں گھروں کو قریب سے دیکھ رہا ہوں اور جس جنّت کا وعدہ ہم سے کیا گیا ہے اور جس نفسِ مطمئنہ (اطمینان والے نفس) کی آرزو میں ہم سب رکھتے ہیں، وہ ملتا نہیں ہے۔ اس لیے کہ بہت سارا بوجھ ہم نے اُٹھالیا ہے۔ زندگیوں کے درمیان ایک بڑی خلیج پیدا ہو گئی ہے اور اطمینان والا نفس اسی وقت میسّر ہو گا جب آپ جہاں اور جس حال میں ہیں اس پر خوش ہوں۔ جو شخص اور گھرانہ ناخوش رہے گا ناشکرا ہو گا، اس سے محبّت اور پیار نہیں مل سکتا۔ جس کا نفس مطمئن ہے اس کے لیے راستے کھلے ہی کھلے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

بش اور بلیئر مت بنئے

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

میرے پاس آج کوئی ایسی بات نہیں خاص طور پر بیان کرنے کے لیے جیسی کہ ہوتی رہتی ہیں لیکن آپ کے اچھے چہروں کو دیکھ کر مجھے اپنے ارد گرد اور اپنے گھر کا ماحول یاد آتا ہے۔ اس کا میں ضرور آپ کی خدمت میں ذکر کروں گا اور وہ یہ کہ کس طرح سے معمولی معمولی چیزیں انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا باعث بن جاتی ہیں اور بڑی بڑی چیزیں جو ہیں اور بڑے بڑے تہیّے جو ہوتے ہیں بڑے بڑے پمفلٹ چھپا کر اور کتابیں لکھ کر آدمی اس قدر ایک دوسرے کے قریب نہیں آتا ہے جس طرح وہ کسی ایک معمولی سی بات کے باعث قریب آ جاتا ہے۔ کوئی دو تین ماہ پہلے کی بات ہے میں لڑکیوں کے ایک کالج میں گیا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں ہے کہ وہ کوئی Prize Distribution کا موقع تھا کوئی Debate۔

بچّو! آپ جانتے ہیں کہ جب اس طرح کا کوئی موقع ہو تو انسان پر دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ جب میں اس تقریب سے فارغ ہوا تو بچیاں حسبِ عادت آٹو گراف لینے لگیں۔

ان میں ایک بڑی اچھی سمارٹ سی لڑکی تھی، سیکنڈ ائیر کی۔ اس نے کہا کہ "کیا سر آپ بھی اپنے زمانے میں آٹو گراف لیتے تھے؟"

میں نے کہا کہ "ہاں میں بھی آٹو گراف لیتا رہا ہوں اور اب بھی لیتا ہوں۔"

وہ حیرت سے بولی۔ "اب بھی آٹو گراف لیتے ہیں۔ کیونکہ اب آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو آپ آٹو گراف دینے والوں میں سے ہیں۔"

میں نے کہا کہ "نہیں بچے، اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔"

تو اس نے کہا "آپ کی آٹو گراف بُک تو بہت قیمتی ہو گی۔"

میں نے کہا کہ "ہاں بہت قیمتی ہے۔"

وہ پوچھنے لگی کہ "آپ کی آٹو گراف بُک میں تو بڑے نامور لوگوں کے دستخط

ہوں گے؟"

میں نے جواب دیا کہ "ہاں اس میں بہت ہی نامور لوگوں کے دستخط ہیں۔"

اس نے درخواست کے انداز میں کہا کہ "کیا ہم آپ کی آٹو گراف بُک دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا کہ "یہ مشکل ہے۔ میں نہ اسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں، نہ آپ کو وہاں تک لے جا سکتا ہوں کیونکہ آپ کو زحمت ہو گی۔ لیکن میں یہ ضرور چاہوں گا کہ میں آپ کو اس بُک سے متعارف کروا دوں اور میری بھی آرزو ہو گی کہ جس طرح سے میں زندگی بھر آٹو گراف لیتا رہا، آپ بھی لیں اور آخر میں آپ کا حاصلِ ضرب اسی طرح کا ہو جس طرح کا حاصل ضرب میرا ہے۔" وہ بڑی ہی حیران ہوئیں۔ میں نے اُن سے کوئی بھید کھولا نہیں بس اتنا ہی کہا کہ کبھی موقع ملا تو ضرور بتاؤں گا۔ اب مجھے وہ بات یاد آ ہی گئی ہے تو آپ کو بتاتا ہوں۔

جب میری شادی ہوئی تو وہ ایسا زمانہ تھا جب امیری دعویٰ اور تقاضے اتنے تھے نہیں، اور ہم (میں اور بانو قدسیہ) دونوں اچھے اور درمیانے درجے کے تھے اور ویسے زندگی بسر کر رہے تھے جیسے عام لوگ کرتے تھے لیکن خوش بہت تھے۔

ہم دونوں یہ ضرور چاہتے تھے کہ ہماری ایسی Achievement ہو اور ہم ایسے نامی گرامی ہوں کہ لوگوں کو رائے دے سکیں، حالانکہ یہ چیزیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں جب تک اللہ اسے عطا نہ کرے۔ ہم ٹھیک ٹھاک زندگی بسر کر رہے تھے اور یہ خواہش ہوتی کہ کچھ نہ کچھ اور کچھ ایسی چیزیں ہمارے گھر میں بھی اکٹھی ہوتی رہیں جیسے نو بیاہتا جوڑے کو آرزو ہوتی ہے گھر بنانے کی۔ اچھا عورت کے بارے میں آپ ایک بات ضرور یاد رکھئے کہ عورت اور چڑیا دونوں ہی اپنے گھونسلے میں ہر طرح کا ڈکا، تنکا استعمال کر لیتی ہیں۔ چڑیا کو آپ نے دیکھا ہو گا وہ لمبا تنکا بھی لے جارہی ہوتی ہے، چھوٹا بھی، سرکنڈے جیسا بھی، کھردرا بھی اور ملائم بھی۔ اور جب اس کا گھونسلا بن چکتا ہے تو وہ انتہائی خوبصورت اور خوش نُما ہوتا ہے۔

میری بیوی بھی چڑیا کی طرح کوشش کر کے اپنے غریبی دعوے کے مطابق گھر میں ایسی چیزیں لائی تھی جو اس کے گھر کو ایسی ہی عزّت بخش سکیں جیسا کہ بڑے گھروں کو ملتی ہیں لیکن بے چاری کا بس نہیں چلتا تھا۔ پھر ہم اچانک بیچ میں امیر ہو گئے۔ ہمارے امیر ہونے کی ایک نشانی یہ تھی کہ ہمارے گھر میں نئی چیز آئی جو پہلے ہمارے گھر میں نہیں تھی۔ وہ شیمپو کی شیشی تھی۔ اس زمانے میں کسی گھر

میں شیمپو ہونے کا مطلب امیر ہونا تھا۔ وہ نو روپے گیارہ آنے کی شیشی، رنگ اس کا گہرا سبز تھا اور اس کا مُنہ بڑا تنگ ہوتا تھا۔ ہم نے امیر ہو کر اس شیمپو کے ساتھ اپنے سر کو دھونا شروع کیا اور ہم اتنے خوش ہوئے کہ جیسے دنیا جہان کی نعمت اور دولت میں مل گئی ہو۔ لیکن چونکہ مالی حالات کچھ اچھے نہیں تھے (یہ خفیہ بات ہے جو میں آپ کو اب بتانے لگا ہوں کسی کو بتایئے گا نہیں) جب ہم وہ شیمپو استعمال کرتے تھے تو پہلے غسل خانے میں جا کر لال صابن سے سر دھوتے تھے جب سر دُھل جاتا تھا تو ہم میں سے جو بھی نہا رہا ہوتا وہ اپنا گیلا ماتھا باہر نکالتا اور جو باہر ہوتا وہ اس شیشی کا ڈھکنا کھول کے شیمپو ایک ٹکا اس پر لگا کر فوراً شیشی سیدھی کر لیتا۔ اب اس طریقے سے تو ظاہر ہے جھاگ ویسی نہیں بنتی جیسی آپ لوگ اللہ کے فضل سے اٹھاتے ہیں اور کھٹا کھٹ بنا کر سر دھو لیتے ہیں۔ میں کئی دفعہ شیمپو کے اشتہار دیکھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ پاکستان کا سب سے مشکل مسئلہ شیمپو کا ہے۔ اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ کون سا شیمپو استعمال کرنا ہے تو پاکستان کے سارے مسائل حل ہو جائیں کیونکہ شیمپو کے اشتہاروں کی ایک ہر روز ''دھما چوکڑی'' مچی ہوئی ہوتی ہے لیکن ہمارے زمانے میں وہ ایک سبز رنگ کا شیمپو تھا۔

اچھا میں بات کر رہا تھا اپنی امارت کی۔ ہمارے امیر ہو چکنے کے بعد پھر ہم یہاں

ایک امریکی Publication ادارے فرینکلن سے وابستہ ہو گئے۔ مجھے اس ادارے سے ایک کتاب Translate کرنے کا آرڈر مل گیا اور اس کے ایک ماہ بعد بانو قدسیہ کو بھی اسی ادارے سے ایک کتاب مل گئی۔ ہم نے تین مہینے کی مدّت میں اپنی انکم میں اچانک ۵ ہزار روپے کا اضافہ کر لیا۔ اس طرح اچانک ۵ ہزار روپے مل جانے سے ہمارے پاؤں زمین پر نہیں لگتے تھے۔ بانو نے ایک دن مجھ سے کہا کہ ہمارے گھر میں ایک بہت اعلیٰ درجے کی میز ہونی چاہیے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ انہیں دنوں کباڑیوں کے پاس کسی سفارتخانے کا سامان بِکنے کے لیے آیا۔ اس سامان میں ایک کمال کی میز تھی۔ اس پر کم سے کم آٹھ افراد کو Serve کیا جا سکتا تھا۔ وہ ولایت سے Import کی گئی تھی۔ نہایت ہی اعلیٰ درجے کی تھی۔ بانو کے بار بار بھاؤ تاؤ کرنے سے کباڑی بھی تنگ آ گیا اور جان چھڑانے کے لیے ایک دن کباڑیے نے بانو سے کہا کہ ”بی بی ریڑھا لاؤ اور اسے لے جاؤ۔“

اس طرح بانو اس میز کو ریڑھے پر رکھ کر بڑے فاتحانہ انداز میں گھر لے آئی اور ہمارے گھر میں بھی ایک نہایت اعلیٰ درجے کی میز آ گئی۔ اب ہم میں سے جس کو جو بھی کام ہوتا یا نہ بھی ہوتا وہ اس میز پر بیٹھ کر کرنے کی کوشش کرتا اور وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ میز ہمارے گھر اور زندگی کا ایک حصّہ بن گئی۔ پھر گھر میں ہمارے بچّے آتے رہے اور ہماری زندگیوں میں شامل ہوتے رہے۔ وہ بھی اسی میز کو استعمال کرنے لگے لیکن میری بیوی بہت Particular اور محتاط تھی کہ اس میز کی جو Pine Wood Top ہے کہیں اس میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو جائے یا نشان نہ پڑے اور اس میز نے بانو کی زندگی عذاب میں ڈال دی تھی۔ سارے کام چھوڑ کر اس کی نگاہیں میز پر مرکوز رہتیں۔

خواتین و حضرات! تقدیر کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ خدا کی کرنی یہ ہوئی کہ اس میز کے اُوپر نشان پڑنے شروع ہو گئے۔ ایک دن بانو نے دکھی ہو کر کہا کہ میں اب اس میز کا پائن وُڈ ٹاپ پالش کراؤں گی۔

میں نے کہا کہ واقعی، اس کی حالت ایسی نہیں کہ ہم اسے ایسے ہی رہنے دیں۔ چنانچہ پالش کرنے والے کو گھر بلایا گیا۔ اس نے دیکھ کر کہا کہ "اس ٹاپ پر رندہ تو لگ نہیں سکتا کیونکہ یہ بہت Soft ہے اور ہمارے پاس ایسے آلات نہیں ہیں جو ہم اس پر استعمال کر لیں۔ اس نے کہا کہ میں اس پر چار زیرو کا ریگ مال لگا کر آہستہ آہستہ اس کی گھسائی کروں گا اور اس کے داغ دھبے جب دُور ہو جائیں گے تو پھر میں ہلکے پینٹ کے ساتھ اس کو پینٹ کروں گا اور یہ نئی میز کی طرح ہو

جائے گی۔"

جس دن اس پالش والے کو آنا تھا اور اس نے کام شروع کرنا تھا اس رات میں اور میری بیوی بیٹھے اسی میز پر کچھ کام کر رہے تھے تو میں نے اس سے کہا کہ بانو اس میز کی سطح کو غور سے دیکھو اور ان تمام نشانات کے ساتھ اس تاریخ کو تلاش کرو جب یہ نشانات یکے بعد دیگرے پڑتے رہے۔ یہاں تمہارے بڑے بیٹے نے پُرکار سے نشان ڈالے تھے۔ جب وہ پرچہ حل کر رہا تھا۔ پھر آپ کی والدہ (میری ساس) وہ اس کے کونے پر بیٹھ کر اپنے مقررہ وقت پر سر کو ""بسما" (خضاب) لگاتی رہیں، باوصف اس کے کہ وہ بہت موٹا اخبار پھیلا کر بڑی احتیاط کے ساتھ خضاب لگایا کرتی تھیں لیکن اس کے داغ دھبے اس میز پر لگ ہی جاتے تھے۔ پھر جب ہمارا منجھلا بیٹا پیدا ہوا، اس زمانے میں ایسے کھلونوں کا نیا نیا رواج چلا تھا جو بغیر چابی سے چلتے تھے۔ ان کے پہیئے ایک بار گھما دیئے جاتے تھے اور وہ تھوڑی دیر کے لیے چارج ہو جاتے تھے۔ ہمارا پیارا منجھلا بیٹا جب ان کھلونوں کو گھما گھما کر چھوڑتا تھا تو اس میز پر اُس کے نشان پڑتے تھے اور اس میز پر ایسے ہی نشان تھے جیسے جدّہ کے باہر ٹینکوں کے پٹوں کے نشان ہیں اور یہ نشان اس میز کی Surface پر موجود ہیں۔ پھر میں نے ایک مرتبہ اپنے دفتر میں

اپنے باس کی خوشنودی کے لیے گتّے کا ایک سنہرا Well Come کاٹا تھا اور اس کو Paper Cutter کی بجائے کسی اور کٹر سے کاٹا تھا اور اس کے نشان بھی میز پر موجود تھے۔ تم جو بڑے احتیاط سے اپنی سلائی مشین رکھ کر سلائی کرتی رہی ہو اور اس کے چاروں "پوڈوں" کے نشان بھی بڑی پختگی کے ساتھ اس میز پر موجود ہیں۔ جب اتنے آدمیوں کے دستخط اس پر موجود ہیں تو تم اپنے اس قیمتی آٹو گراف کو کیوں ضائع کرتی ہو۔ اس کو تو بڑی احتیاط سے بڑی محبّت سے بڑی دلجوئی اور دل جمی کے ساتھ رکھنا چاہیے۔ یہ ہمارے گھر کی آٹو گراف بُک ہے اور اس پر میرے، میرے بچّوں کے، تمہاری والدہ کے اور تمہارے بے پروا کسی ملازم کے، الغرض سب کے نشان موجود ہیں۔ اگر اس پر چار زیرو کا ریگ مال پھرا تو یہ سارے نشان مِٹ جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کو ایسے ہی رہنے دو۔

یہ بات بانو کے دل کو لگ گئی اور اس نے کہا "ٹھیک ہے لیکن اسے خوف بھی ہوا۔"

بچّو! عورت کے دل کا سب سے بڑا خوف یہ ہوتا ہے کہ دوسری کیا کہے گی، جب مہمان گھر میں آئیں گے تو خواتین تھر تھر کانپ رہی ہوتی ہیں کہ کہیں کسی بات

میں کوئی کمی بیشی نہ ہو جائے۔ کوئی یہ نہ کہہ دے کہ اس کو تو گھر رکھنا نہیں آتا۔

میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ ہم ایک پلاسٹک شیٹ خرید لیں گے جب گھر میں شرفاء نکتہ چین اور تنقید کرنے والی عورتیں آئیں گی تو ہم اُس پلاسٹک کور کو اِس میز پر ڈال دیا کریں گے۔ اس سے اُن کی بھی تسلّی ہو جائے گی اور ہماری آٹو گراف بُک بھی محفوظ رہے گی۔ انسانوں کے آپس کے تعلق کو بہت ڈھیلے انداز میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایک انسان کی روح دوسرے انسان کی روح کو سمجھنے کے لیے مائل ہو تو پھر بڑی آسانی ہو جاتی ہے اور لڑائی اور کچھ کا سماں جو آدمی تقابلی مطالعے میں برداشت کرتا ہے آسان ہو جاتا ہے۔

میں نے جو نشانات آپ کو گنوائے ہیں، اب ان میں اور دستخطوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میرے بیٹے نے تھوڑے دن پہلے مجھے امریکہ سے خط لکھا اور اس میں وہ مجھ سے یوں مخاطب ہوا "ابو میں نے سُنا ہے کہ آپ کے پوتے پوتیوں کی وجہ سے اس Autograph Page پر کچھ نئے دستخط بھی آ گئے ہیں۔ میں چونکہ دُور ہوں، اس لیے مہربانی کر کے آپ اس آٹو گراف کے حصّے کا ایک فوٹو کھینچ کر مجھے بھیجیں۔"

میں نے ایک ماہر فوٹو گرافر کی خدمات حاصل کر کے اس آٹو گراف کی تصویر اُسے ارسال کی۔ اتنی ساری لمبی بات آپ کو سُنانے کا مقصد یہ تھا کہ کئی دفعہ اللہ کی طرف سے کوئی چیز انسان پر اُجاگر ہو جاتی ہے۔ اور اللہ ہمیں معلوم دنیا سے ہٹا کر نامعلوم کی دنیا سے بھی علم عطا کرتا ہے اور انہیں حاصل کرنے کے لیے انہیں اپنا نصیب بنانے کے لیے میرے اور آپ کے پاس ایک جھولی ضرور ہونی چاہیے۔ جب تک ہمارے پاس پھیلانے کے لیے اور حاصل کرنے کے لیے ایک جھولی نہیں ہو گی اس وقت تک وہ نعمت جو اُترنے والی ہے وہ اُترے گی نہیں۔ رحمت ہمیشہ وہیں اُترتی ہے جہاں جھولی ہو اور جتنی بڑی جھولی ہو گی اتنی بڑی نعمت کا نزول ہو گا۔ جیسا ایک لاڈلا بچّہ ضد کر کے اپنے ابّا سے یا ماں سے کوئی چیز حاصل کر کے ہی رہتا ہے اور آج ہی لے کے دو۔ آج ہی لے کے دو کی گردان الاپتا ہے۔ آپ بھی اپنے اللہ سے ضرور مانگا کریں اور ضد کر کے مانگا کریں لیکن یہ ضد سب کے سامنے نہیں ایک طرف کونے میں بیٹھ کر۔ آپ جو بھی دل میں ہو مانگا کریں اور اللہ کے پاس ایک ایسا میٹر ہے جو Correct کر کے ایسی چیز ہمیں عطا کرتا ہے جو ہمارے فائدے کی ہوتی ہے۔ آپ جب دُعا کریں تو یہ ضرور کہیں کہ "اے اللہ وہ عطا کرے جو میرے فائدے میں ہے اور آپ کو بھی اچھا لگتا ہے۔"

اللہ میاں سے کہیں کہ خداوند تعالیٰ میں دنیادار بندہ ہوں اور جو تو بہتر سمجھتا ہے، وہ عطا کرے اور یہ وہ چیز ہو جو میرے بھی پسند کی ہے، آپ نے دُعا میں یہ چالا کی ضروری رکھنی ہے۔ جس طرح بش اور بلیئر ایک ہی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور ان کے ذہن بھی ایک سمت چلتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک نظر میں یا زمین میں اللہ کی رحمت کا مقام وسعت میں نہیں ہے۔ بش اور بلیئر جیسی نظر سے دیکھنے والا شخص سمجھتا ہے کہ جو میں نے سوچ لیا، وہی درست ہے۔ باقی سب غلط ہے اور ایسی صورت میں کہ وہ خود آسودگی میں رہتا ہے اور ساری دنیا کو رہنے دیتا ہے۔ خود بھی عذاب کی زندگی بسر کرتا ہے اور لوگوں کو بھی ایسے ہی عذاب میں مبتلا رکھتا ہے۔

میرا اور آپ کا خدا کے ناتے سے یہ فرض بنتا ہے کہ باوصف اس کے کہ ہم کو ہمارا پڑوسی اچھا نہیں لگتا۔ اس کی ناک بڑی موٹی ہے اور سر سے گنجا ہے، لیکن وہ ہمارا پڑوسی ہے، اس کے رشتے سے میری زندگی آگے چل رہی ہے۔ ہم چند لوگ یہاں بیٹھے ہیں، جانے کتنے ہی کروڑ افراد یہ پروگرام سُن رہے ہیں۔ اس طرح ہم سب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ کون گیہوں اُگاتا ہے، کون انگور بوتا ہے؟ کسی کو علم نہیں ہوتا لیکن وہ ہمارے لیے ایسا کر رہا ہے اور باقاعدگی سے

بوریاں، کریٹ بھر بھر کر ہمارے لیے بھیج رہا ہوتا ہے۔ ہم اس کا اور وہ ہمارا نام تک نہیں جانتا ہوتا۔

ہماری نانی آٹا گوندھنے سے پہلے کہا کرتی تھی کہ ''جس کسے نیں ایہہ کنک اُگائی اے، جس کسے نے ایہہ آٹا پہیا، اللہ انہاں دا بھلا، کل جہاں دا بھلا۔''

(جس کسی نے بھی یہ گندم اُگائی تھی اور جس کسی نے بھی اِس کو پیسا تھا، خدا اُس کا بھلا کرے، ساری دنیا کا بھلا ہو)۔

آپ خدا کرے کبھی بش یا بلیئر نہ بننا بلکہ دونوں آنکھوں سے اللہ کی رحمت کو تلاش کرنا۔ انسانوں سے جڑے رہنا ان سے وابستہ رہنا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

ٹین کا خالی ڈبّہ اور ہمارے معاملات

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

گزشتہ مارچ کے مہینے میں غیر متوقع طور پر سردی کی ایسی شدید لہر آگئی کہ وہ ہم سب سے برداشت کرنا مشکل ہو گئی اور ہم حیران تھے کیونکہ اس طرح کی سردی ہم نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھی تھی نہ سُنی تھی۔ مارچ ایک طرح سے گرمیوں یا بہار کی ابتدا کا مہینہ ہوتا ہے۔ اس طرح کی سردی واقعی حیران کُن ہے اور ہم تو سردی کو پتنگیں وغیرہ اُڑا کر الوداع کہہ چکے ہوئے تھے۔ اس سردی سے جہاں ہمیں تھوڑی سی تکلیف ہوئی، وہاں خوشی بھی ہوئی کہ چلو سردی اور زیادہ لمبی چلی اور گرمی کم ہوئی۔ میں اپنے گھر کے پاس ایک بڑی سی گراؤنڈ میں لمبا کوٹ پہن کر اور کمبل لے کر وہاں بیٹھا اس خنک ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بچّے کرکٹ کھیل رہے تھے اور مزے کی ہوا چل رہی تھی۔ میں اپنے کسی پروگرام میں آپ کو بتاؤں گا کہ "گھبرو" کیا ہوتا ہے اور جس طرح

سے ہرن برف چاٹ کر خوش اور تیز رہتا ہے اس طرح "گھبرو" بھی ٹھنڈی ہوا کھا کر خوش رہتا ہے۔ یہ باتیں ہمیں پرانے بابے بتایا کرتے تھے۔ میں اس ٹھنڈی ہوا سے لطف لے رہا تھا اور طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے تھے اور میں شاید اپنے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جس طرح میں آپ سے عرض کیا کرتا ہوں کہ آپ اپنے ساتھ بیٹھنے کی بھی عادت ڈالیں۔ ہم سارا وقت لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ سارا وقت بولتے رہتے ہیں لیکن اپنے آپ کو وقت نہیں دے پاتے ہیں۔ آدمی کو اپنی ذات کے ساتھ بیٹھنے سے بہت کچھ عطا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے جس طرح سے غارِ حرا میں حضور نبی اکرم ﷺ بیٹھا کرتے تھے۔ خلوت میں خاموشی میں اور اپنے اور اپنے خدا کے ساتھ ڈائریکٹ رابطہ کر کے۔

میں وہاں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے وہاں ایک عجیب سا شور سُنائی دیا۔ ایک ٹِن کا خالی ڈبّہ تھا اور وہ بڑی تیزی سے ہوا کے دباؤ سے لڑھکتا ہوا جا رہا تھا اور اس نے اس خاموش فضا میں ایسا شور مچایا ہوا تھا کہ خدا کی پناہ۔ وہ شور مچاتا ہوا جاتا، پھر ہوا کے دباؤ سے پلٹتا اور دوسری طرف کو لڑھکنا شروع کر دیتا تھا۔ جب وہ Right Side کو چلا تو اس کی آواز بدل جاتی تھی۔ جب وہ لمبائی کے رُخ یا Left Side

کو چلا تو اس کی آواز بدل جاتی تھی۔ بعض اوقات اس سے ایسی آواز نکلتی کہ وہ ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی اور کبھی وہ بھلی بھی لگتی تھی۔ میں نے جا کر اس ٹین کے شریر ڈبّے کو پکڑ لیا۔ میری آرزو یہ تھی کہ یہ ڈبّہ فنا ہونے سے کسی طرح بچ جائے کیونکہ یہ آگے جا کر کسی کھائی میں گرے گا اور پھر اس کے اُوپر بارش پڑے گی۔ زمین میں بے چارہ دھنس جائے گا اور یہ ری سائیکل(Re-Cycle) ہونے سے رہ جائے گا۔ میں اسے اُٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا اور اسے بڑے سے کوڑے دان میں پھینک دیا اور اسے اس توقع پر وہاں رکھا کہ اب اسے اس کے اگلے مقام پر جانا چاہیے بجائے اس کے کہ ایک آوارہ گرد بچّے یا ایک پلّے کی طرح یہ بھاگا پھرے۔

جب میں واپس جا کر بیٹھا تو مجھے خیال آیا کہ زندگی میں ایک مقام پر ایسا ہی لڑھکتا ہوا ایک ڈبّہ تھا اور میرا کوئی راستہ متعین نہیں تھا۔ میں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر لڑھکتا پھرتا تھا۔ اب میں نے سوچا کہ کچھ کام ہونا چاہیے۔ اس زمانے میں لاہور سے روزنامہ مغربی پاکستان کے نام سے ایک اخبار نکلتا تھا۔ اس کے صالح محمد صدیقی صاحب ایڈیٹر تھے۔ وہ مجھ سے عُمر میں زیادہ بڑے نہیں تھے البتہ تجربے میں بڑے تھے۔ پان چباتے رہتے تھے اور ''حاجی بکل بطورہ'' کے نام سے کالم

بھی لکھا کرتے تھے۔ میں از خود اُن کی شاگردی میں داخل ہو گیا اور خیال تھا کہ مجھے لکھنے کا کام آنا چاہیے۔ میں وہاں جاتا رہتا۔ میرا وہ نیا نیا تجربہ تھا۔

خواتین و حضرات اسکول اور کالج کی لکھائی کا عملی زندگی کی لکھائی یا روزمرّہ کی زندگی سے بڑا گہرا فرق ہوتا ہے۔ میں صالح محمد صدیقی کی شاگردی میں لکھتا رہتا۔ میری دی ہوئی کچھ چیزیں چھپ جاتی تھیں، کچھ رُک جاتی تھیں۔ وہ تحریروں کو کاٹتے بہت تھے (ظاہر ہے وہ ایک اچھے ایڈیٹر تھے) اور قلم کے تیر بہت چلاتے تھے جس سے میں بڑا دلبرداشتہ ہوتا تھا اور میں یہ سمجھتا تھا اور ایک مقام پر میں یہ محسوس کرنے لگا کہ میں ایک رائٹر نہیں بن سکتا اور مجھے کچھ اور کام کرنا چاہیے اور میں کوئی اور نوکری کروں گا، کسی اور میدان میں اُتروں گا۔ کامیاب ہو گیا تو اچھا، نہ ہو سکا تو بھی کوئی بات نہیں۔

انتہائی دلبرداشتہ تھا۔ جب گھر آتا تو میری ماں پوچھتی کہ "تو کچھ کھلتا نہیں ہے۔"

تو میں کہتا کہ "کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔"

میں ان سے کہتا کہ "میں خود کو کوئی ایسا مفید آدمی نہیں سمجھتا ہوں۔"

اور اس بات سے میری ماں بڑی پریشان ہوتی تھی کیونکہ میرے چہرے پر خوشی

کے کم ہی آثار ہوتے تھے۔ طبیعت پر ایک بوجھ سا رہتا تھا لیکن اتنا نہیں تھا جتنا ہمارے نوجوان نے ڈیپریشن کے عالم میں اب "سہیڑ" لیا ہے۔

میری ماں مجھ سے پوچھتی کہ "کیا بات ہے، تو کچھ خوش نہیں ہے۔"

میں کہتا کہ "ہاں ماں ابھی تو خوش نہیں ہوں لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہو جاؤں گا۔"

اب میرے اُستاد بھی مجھے سہارا تو نہیں دیتے تھے لیکن چاہتے ضرور تھے کہ میں اپنی ہمّت اور پامردی کی بدولت اس مقام پر پہنچوں جہاں وہ مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔

ہمارے اس اخبار میں ایک کاتب تھے "توکلی صاحب داڑھی والے۔" وہ سُرخیاں لکھا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے میری سلپ (جس پر رف خبر لکھی ہوئی ہوتی ہے) لے کر کہا کہ "اشفاق صاحب! باوصف اس کے کہ میں سُرخیاں لکھتا ہوں اور موٹی کتابت کرتا ہوں اور باریک کتابت سے میرا کوئی تعلّق نہیں ہے، لیکن میں آپ کی ہر تحریر کو بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اس لیے کہ آپ کی تحریر کی جو ابتدا (صحافتی زبان میں اس کو اِنٹرو کہا جاتا ہے) ہوتی ہے یہ بڑے

کمال کی ہوتی ہے۔" اس نے کہا کہ میرا اکیس بائیس برس پرانا تجربہ ہے اور یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ آپ خبر یا سٹوری کی ابتدا بڑے کمال کی کرتے ہیں اور میں اسے پڑھ کر بڑا لطف اندوز ہوتا ہوں۔

خواتین و حضرات! آپ یقین کیجئے، اُن کی ایک شاباش سے جو کسی بڑے آدمی یا بڑے ایڈیٹر سے نہیں آئی تھی، ایک عام سے کاتب کی طرف سے موصول ہوئی تھی اور اُن کا فرمانا کوئی مستند بھی نہیں تھا لیکن اس نے بحیثیت ایک قاری کے مجھے یہ کہا تھا۔ اُن کے چند الفاظ نے مجھے "ری سائیکل" کر دیا اور میں ذرا حوصلے میں ہو گیا اور توکلی صاحب نے مجھے مثبت انداز میں دھکا دے دیا تھا۔ جب آدمی کو Appreciation ملتی ہے یا کہیں سے تھپکی ملتی ہے۔

ہماری بہوئیں، ہماری ساسوں سے کیوں نالاں رہتی ہیں۔ سائیں اپنی بہوؤں کو گہنے دے دیتی ہیں، گھر کی چابیاں دے دیتی ہیں لیکن شاباش نہیں دیتیں۔ انہیں یہ فن آتا نہیں ہے۔ کبھی نہیں کہتی ہے کہ تم نے میٹھے چاول پکا کر کمال کر دیا ہے۔ گُڑ والے چاول اتنے کمال کے ہیں کہ ہم سے یہ کبھی پک نہیں پائے ہیں۔ لڑکی تم نے یہ کیا ترکیب لڑائی ہے۔ اب اس کے اتنا کہنے سے وہ زندہ ہو جائے گی اور ساری عمر آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔ چاول کھلاتی رہے گی اور

آپ کے لیے جان دے دے گی۔

خواتین و حضرات! لڑھکتے ہوئے ڈبّے کو اُٹھانا اور اس کو ضائع نہ ہونے دینا ایک کمال ہے۔ اس کے بعد میں آزاد کشمیر ریڈیو چلا گیا۔ یہ بڑے مشکل حالات میں شروع کیا گیا تھا لیکن ہماری خواہش تھی کہ ہم اس بڑے ملک کے ساتھ "بھڑ" جائیں جو ہم پر ہر طرح کے حملے کرتا ہے۔

میں ان دِنوں نوجوان تھا اور چھوٹے جوڑ کا پہلوان تھا اور وہاں بڑے بڑے نامی گرامی لوگ کام کرتے تھے۔ لہٰذا میں وہاں ذرا "کن دبا" کے رہتا تھا۔

آج کے حالات بڑے ہی پراگندہ ہیں۔ اس زمانے میں تو بڑی بڑی آسانیاں تھیں۔ تب نہ حکومت اتنی بوجھل تھی، نہ اس کے تقاضے اس قدر تھے، نہ شفاف الیکشن کی بات ہوتی تھی۔ ایک رات میں نے ایک فیچر لکھا اس بات کو اب تو چوّن برس ہو گئے ہیں۔ اس فیچر میں جمہوریت نہیں تھی۔ ایک وادی کی زندگی کا ذکر تھا۔ اس کا نام تھا "Abraham Lincoln Walks at Midnight"۔ یہ ایک بڑی مشہور نظم تھی اور میں نے اس کو ٹائٹل بنا کر فیچر لکھا۔ اس میں تحریر تھا کہ کس طرح ابراہم لنکن کشمیر کی وادی میں آتا ہے جو

ڈیموکریسی کا اتنا بڑا علمبر دار تھا اور وہ دیکھتا ہے کہ کشمیریوں کے ساتھ کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ میں نے ریڈیو پر سُننے والوں کو اپنے فیچر سے پڑھ کر سُنایا، کشمیر کی وادی میں پہنچ کر ابراہم لنکن ایک تقریر کرتا ہے اور شہر کے لوگ اس کے اِرد گرد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ابراہم لنکن انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "باوصف اس کے تمہارے اُوپر اتنا بڑا بوجھ پڑ رہا ہے اور تمہاری زندگی مشکل ہے لیکن میں نے ایسے آثار دیکھے ہیں کہ اتنی مشکل زندگی بسر کرنے کے بعد آدمی آسانیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔"

جب میں نے یہ فیچر پڑھا اور یہ براڈ کاسٹ ہو گیا اور مجھے تب بہت بڑے آرٹسٹوں کا سہارا تھا۔

یہ پروگرام رات کے نو بج کر تیس منٹ پر ختم ہوا تو میرے اسٹیشن ڈائریکٹر محمود نظامی صاحب، جو طبیعت کے ذرا اور طرح کے آدمی تھے، اُن کی طبیعت بڑی سخت تھی۔ کم وقت میں زیادہ کام کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا مجھے فون آیا اور انہوں نے مجھے کہا کہ "I Take Great Pride۔" اس دن کے بعد سے اب تک میرے پاؤں زمین پر نہیں لگتے ہیں۔ مجھے کسی اُستاد نے کچھ نہیں سکھایا لیکن ان دو مہربانوں (صالح محمد صدیق اور محمود نظامی) نے عالمِ بے خیالی میں دل کی

سچائی کے ساتھ اس طرح سے Appreciate کیا کہ پھر میں کسی اور سہارے کا متلاشی یا طلبگار نہیں رہا۔

اگر زندگی میں آپ کے قریب سے کوئی لڑکھڑاتا ہوا، چکر کاٹتا ہوا، خالی ٹین کا ڈبّہ گزرے تو آپ رُک جائیں اور اس پر توجّہ دیں۔ آپ کی زندگیوں کے قریب سے جو ٹین کا ڈبّہ گزرتا ہے وہ غریب آدمی ہوتا ہے، مخلص شخص ہوتا ہے۔ معذور آدمی ہوتا ہے اور وہ اَن پڑھ ہوتا ہے۔ اسے معاشرے میں کچھ نہیں ملا ہوتا۔ آپ نے اس کو نہ روٹی دینی ہے، نہ کپڑا دینا ہے، نہ مقام یا بینک بیلنس عطا کرنا ہے۔ بس اس کی عزّتِ نفس لوٹانی ہے۔ جس طرح توکلی صاحب نے مجھے کہا اور اس کے بعد محمود نظامی صاحب نے مجھے کہا۔ اسی طرح ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ انسان کی عزّت کریں۔ بس دوسرے انسان کی خیریت دریافت کرنی ہے۔ حال احوال پوچھنا ہے۔

بیبیو! اگر آپ کو اپنے گھر میں کام کرنے والی خواتین کے بچّوں کا، خاوند یا باپ کا نام یادرہ جائے تو ضرور پوچھنا ہے کہ "چاچا چراغ دین کا کیا حال ہے۔"

اس نے یہ بات آپ کے مُنہ سے پہلی بار سُننی ہے۔

ٹین کے یہ کھڑ کھڑاتے ہوئے ڈبّے جو آپ کے اِرد گرد سے ہر وقت گزرتے رہتے ہیں اور ہم اُن سے بے توجّہ ہو کر اپنی زندگی اپنی مرضی سے بسر کرتے رہتے ہیں لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کو روکیں اور گود میں اُٹھائیں اور انہیں ضائع ہونے سے بچائیں اور اس ضائع ہونے سے بچانے کے لیے آپ کو اپنی گِرہ سے کچھ بھی خرچ نہیں کرنا ہے۔

اپنے گھر داخل ہو کر اپنی آپا سے یا بیوی سے یا بوڑھے والدین سے آپ ضرور کہا کریں چاہے کبھی کبھی کہ آپ بہت اچھی ہیں۔ مجھے بڑے ہی اچھے لگتے ہیں۔ آپ جن سے محبّت کرتے ہوں انہیں ضرور بتایا کریں آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اگر آپ کسی سے کوئی ویلڈنگ کا کام کروائیں یا کسی سے اور کوئی کام کروائیں، چاہے موچی سے جوتا مرمّت کروائیں اس سے نیا "پتاوا" ڈلوائیں تو آپ اسے ضرور Appreciate کریں۔

ولایت میں تو Thank you very much کہنے کا رواج عام ہے۔ ہم نے یہ سیکھا نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ہمارا طرّۂ خاص تھا۔ بظاہر یہ معمولی سی بات ہے لیکن ہماری معاشرتی زندگی کے ساتھ اس کا بڑا گہرا اور عمیق تعلّق ہے۔

ہمارے دین کی تین مضبوط بنیادیں ہیں۔ ایک اعتقاد، دوسرا ایمان اور تیسرا معاملات۔ اللہ کے فضل سے اعتقاد کے تو ہم بڑے پکّے ہیں۔ عبادات بھی خوب کرتے ہیں۔ مساجد بھری ہوئی ہوتی ہیں لیکن معاملات کے میدان میں ہم صفر ہیں۔ ہم معاملے کو جان ہی نہیں سکے۔ ہمیں علم ہی نہیں ہے کہ ہمارا ہمارے پڑوسی کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ دوست سے کیا رشتہ ہے۔ ابّا، میاں، بیوی کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ یہ رشتے ٹوٹے پڑے ہیں۔

جب تک ہم معاملات کی رسی کو ویسی مضبوطی سے نہیں پکڑیں گے جیسا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا ہے اس وقت تک ہماری بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ جب تک منبر کے اوپر جمعہ کے خطبوں میں اس بات پر توجّہ نہیں دلائی جائے گی ہم تھوڑے سے پھنسے رہیں گے۔ خواتین کو تو بطورِ خاص اس کی طرف توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔ میں اس پروگرام کی وساطت سے توکلی صاحب اور نظامی صاحب کا جو اس دنیا میں نہیں ہیں، اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکا جس کرسی پر بھی بیٹھ سکا، یہ اُن کی حوصلہ افزائی کی بدولت تھا ورنہ مجھ میں کوئی ذاتی خوبی یہ جب تھی، نہ اب ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

شہ رگ کا ڈرائنگ روم

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ہمارے ایک بابا تھے جو ڈیرہ غازی خان سے ملنے میرے گھر بطور خاص تشریف لائے تھے۔ ان کی کپڑے کی دُکان تھی اور ان کا دکانداری کا انداز بہت عجیب تھا۔ ایک تو وہ ایک گز کپڑے پر صرف چار آنے منافع لیتے تھے۔ یہ بڑے کمال اور حیرانی کی بات ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنی دُکان ظہر کے بعد بڑھا دیتے تھے۔

ان کا کہنا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیاوی کام کے لیے فجر سے ظہر تک کا لمبا Gap دیا ہے اور ظہر کے بعد اللہ کا ٹائم شروع ہو جاتا ہے اور اپنی دُکان بڑھا چُکنے کے بعد وہ اللہ سے لَو لگا لیتے تھے۔ وہ مجھ پر بڑی شفقت اور مہربانی فرماتے تھے۔ جب بھی لاہور آتے مل کر جاتے تھے اور میں بھی بہت آرزومندی سے اُن کے آنے کا انتظار کرتا رہتا تھا کہ جب وہ آئیں گے تو ان سے ملاقات ہو گی اور کوئی نئی اور ایسی پریکٹیکل بات معلوم ہو گی جو کتابوں میں نہیں ملتی۔ ایک دفعہ میں نہار رہا تھا تو

وہ تشریف لائے اور انہوں نے اُونچی آواز میں کہا کہ "اشفاق کو باہر بھیجو۔"

میری بیوی گیٹ پر گئی اور اس نے اُن سے کہا کہ "جی وہ نہا رہے ہیں۔"

میں بھی اُن کی آواز سُن کر غسل خانے سے چلّایا کہ "انہیں روکو روکو۔"

لیکن انہوں نے اپنی اونچی آواز میں کہا کہ "فراق، فراق، فراق۔ اُن کا نہ مل پانا بھی زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ یہ طے نہیں تھا کہ اُن سے ملاقات ہو جاتی۔"

میں اندر سے بہت چیخا چلایا کہ اللہ جانے وہ کب آئیں گے اور وہ فراق کا لفظ کیوں کہہ رہے ہیں لیکن وہ اس طرح سے یہ لفظ دہراتے ہوئے چلے گئے۔ میری بیوی نے بھی انہیں روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ نہیں رُکے۔ پھر میں سوچنے لگا کہ وصال اور فراق جدائی اور قربت کے درمیان ایک مقام ہے اور وہ اعتماد اور یقین کا مقام ہے۔ آپ اعتماد کے اندر اپنے آپ کو داخل کر کے اس توقع کے ساتھ بیٹھتے ہیں کہ بات ضرور ہو گی اور ضرور پوری ہو گی بشرطیکہ آپ وصال اور فراق کو ان دونوں سائیڈوں کو اچھی طرح سے سمجھتے ہوں۔

اعتماد تک پہنچنے کے لیے انسان کو اس "دبدہ" سے بھی گزرنا پڑتا ہے جو کہ اُس کو خدا کے قریب پہنچنے میں اور اسے واصل ہونے کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "تمہارے رزق کا میں ذمّہ دار ہوں اور عزّت اور ذلت تمہیں میں دیتا ہوں۔ زندگی اور موت بھی میرے ہاتھ میں ہے۔"

بندہ سمجھتا ہے کہ نہیں رزق تو میری اپنی کوشش اور محنت اور توجّہ سے ملتا ہے اور (نعوذ باللہ) اللہ میاں بھول بھی سکتے ہیں۔ انہیں کیا پتہ ہے کہ میں کوچہ گنگا اور محلّہ ماشکیاں میں رہتا ہوں اور اس طرح آدمی کا یقین ہلتا رہتا ہے اور ہم جو پڑھے لکھے آدمی ہیں اُن کا یقین زیادہ ہوتا رہتا ہے اور جو دوسرے ہوتے ہیں اور جو زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے ان کا ایمان زیادہ مستحکم اور پکّا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں "اللہ سچّا جیسے کرے گا اس کی مرضی ہے اور اسی طرح سے ہی ہوا۔"

ہمارے پاس جغرافیہ، ریاضی، جیومیٹری اور سیاست کے بڑے مسائل ہیں اور یقین کی وہ گھڑی جو ہر وقت انسان کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ چلنی چاہیے وہ ساتھ چلتی نہیں ہے۔

ایک مقام خواتین و حضرات ایسا بھی آیا کہ قائد اعظم کو جو ایک بہت بڑے سیاستدان بھی تھے، انہیں بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی قوم کو مثبت انداز میں اس بات کا حکم دیں کہ تنظیم، اتحاد اور یقینِ محکم کا پیدا ہونا ضروری ہے

کیونکہ تنظیم اور اتحاد یقینِ محکم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان تینوں کا ایک ساتھ ہونا اشد ضروری ہے۔ در حقیقت بہت سارے خوف ہیں جو ہمیں گھیرے رکھتے ہیں اور وہ سارے خوف ذہن کی پیداوار ہیں۔ ہم چونکہ کمزور آدمی ہیں اور ہر قدم پر ڈگمگا جاتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خوف و الم کو بے خوفی سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ کوئی ایسی ڈیوائس، کوئی ایسا کالا منتر یا ایسی چالاکی اختیار کی جائے کہ ہمارے اُوپر آنے والے اندیشے ختم ہو جائیں۔

ہمارا سب سے بڑا اندیشہ ہمارا مستقبل یا فیوچر ہے۔ کل کیا ہو گا؟ آبادی بڑھ جانے کا اندیشہ پانی کی کمی کا اندیشہ اور یہ اندیشہ کہ ہم یہ جو آج مزے کر رہے ہیں اور اعلیٰ درجے کا اگر کھا رہے ہیں، جاپانی پھل اُڑا رہے ہیں، معلوم نہیں کل میسّر ہو گا کہ نہیں۔ ہم اسی خوف کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اس خوف کو دُور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ اپنے اندر اعتماد کی فضا پیدا کریں۔ جب تک خوف کے اندر رہتے ہوئے اور غم میں مبتلا ہو کر آپ کے دل کے "آہلنے" گھونسلے میں یقین کا انڈہ پیدا نہیں ہو گا اس وقت تک آپ چل نہیں سکیں گے۔ اس یقین کا پیدا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ یہ یقین دل میں بٹھا لیں کہ ہاں ہم ہیں ہمارا خدا ہے اور اس کے وعدے سچّے ہیں، پھر بات بنے گی۔

آپ نے لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہو گا کہ نجانے اکیسویں صدی میں کیا ہو گا؟ بجائے اس کے ہم خوشی منائیں اور خوشی خوشی صدی میں داخل ہوں، ہم اندیشوں میں مبتلا ہو کر بس تھر تھر کانپے جا رہے ہیں۔

بچّو! جو صاحبِ اعتماد ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ اکیسویں بائیسویں صدی جو صدی بھی آئے میں ہوں، یہ راستہ ہے، یہ میرے چلنے کی استطاعت ہے۔ سارے کام بہتر ہوں گے۔ کیوں نہیں ہوں گے۔ جب جانور، پنچھی، پکھیرو اعتماد میں ہوتے ہیں، چڑیوں کو بھی خوف نہیں ہوتا۔

ہمارے گھر میں چڑیوں کا گھونسلا تھا۔ اس گھونسلے پر اتنی بارش ہوئی۔ تین دن مسلسل دن رات وہ گھونسلا بارشوں کے ستم سہتا رہا۔ میں بہت خوفزدہ ہوا اور اپنی بیوی سے کہا کہ یہ بے چاری تو مر جائیں گی۔ تین دن ہو گئے یہ چوغا چُننے بھی نہیں گئیں۔ اگر نہیں جا سکی ہیں تو کم از کم انہیں خوف کا اظہار تو کرنا چاہیے۔ انہیں چھوٹا سا اخبار چھاپنا چاہیے اور اس میں ایڈیٹوریل لکھنا چاہیے کہ "اے پیاری چڑی تمہارا کیا بنے گا۔ اتنی موسلادھار بارشوں میں تم تو بھوکی مر جاؤ گی۔ انہیں دوسری چڑیوں پر بھاشن جھاڑنا چاہیے اور بہت خوف کا اظہار کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ اللہ میاں کو اب بارش بند کر دینی چاہیے اور حکومتِ وقت کو بھی

ہمارے گھونسلوں پر توجّہ دینی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ آرام سے بیٹھی رہیں۔ جس دن بارش ختم ہوئی، پھُر کر کے اڑیں۔"

اچھا اب یہ پتہ نہیں ہوتا ہے کہ ان کا پہلا Stop کون سا ہوتا ہے۔ ہمیں تو پتہ ہوتا ہے نا یہ اشیائے خورد و نوش کی دُکان ہے، یہاں سے سودا لانا ہے۔ اب چڑیوں یا جانوروں کی تو کوئی خاص مارکیٹ نہیں ہوتی ہے۔ انسان کو خدا پر مکمل اعتماد کا اظہار کرنا چاہے لیکن یہ پیدا نہیں ہوتا۔ انسان اس سے بڑا گھبراتا ہے۔

خواتین و حضرات! آپ بھی اپنی زندگیوں کا معائنہ فرمائیں تو آپ کو بڑی حیرانی ہو گی کہ آپ بڑی ہی اعتماد کی فضا میں داخل ہو کر بہت سے کام پورے اعتماد کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کوئی اہم خط لکھتے ہیں اور اس کو ڈاک خانے کے لال ڈبّے میں اس یقین کے ساتھ ڈال دیتے ہیں کہ وہ اپنی منزل پر جائے گا اور یہ حاصل پور آپ کے کسی پیارے کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ آپ خط ڈال کر بے فکر ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا اعتماد ہے۔ اگر اس کی پرورش کی جائے اور اسے توانائی بخشی جائے تو یہ ایک بڑا اعتماد بھی بن سکتا ہے۔ آج سے تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے ایک چیک ملا۔ وہ ایک لاکھ روپے کا چیک تھا۔ اس سے پہلے میں نے لاکھ روپیہ نہ کبھی ہینڈل کیا تھا اور نہ ہی دیکھا

تھا۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ نوکری پیشہ لوگوں نے مہینے کے مہینے مخصوص تنخواہ پر ہی گزارا کرنا ہوتا ہے۔

وہ چیک مجھے کیش کرانا تھا۔ جب میں بینک میں گیا اور کیشیئر کو وہ چیک دیا تو اس نے مجھے ٹوکن دیا۔ اب میں ایک لاکھ روپے کی اپنے تئیں ایک بڑی رقم کے چیک کو دے چکا ہوں اور ٹوکن لے کر اعتماد میں کھڑا ہوا ہوں حالانکہ چیک لینے والے نے چیک کے پیچھے دستخط بھی کروا لیے تھے اور رقم دینے سے پہلے انہوں نے مجھ سے ٹوکن بھی واپس لے لیا تھا۔ اب وہ بڑی آسانی کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ جی آپ کو پے منٹ ہو گئی ہے۔ اب یہ میں Suggestion نہیں دے رہا ہوں کہ ایسا ہونا چاہیے (مُسکراتے ہوئے) یہ اعتماد تھا کہ نہیں وہ ایسے نہیں کہیں گے اور مجھے رقم دیں گے۔

ہر روز لاکھوں کروڑوں آدمی اس یقین کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کرتے ہیں۔ ہم محکمۂ ڈاک اور بینکنگ سسٹم پر یقین کر لیتے ہیں، اپنے خدا پر یقین نہیں کرتے۔ ہم اپنا ایک بچّہ ایک اعلیٰ سکول میں داخل کرتے ہیں اور ہمیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ یہ بی اے کرے گا۔ اس کے بعد یہ مقابلے کا امتحان دے گا۔ یہ اس امتحان میں کامیاب ہو گا اور یہ تھرپارکر میں ڈپٹی کمشنر لگے گا۔

وہاں تک تو یقین چلتا جاتا ہے۔ یہاں آ کر بریکیں کیوں لگ جاتی ہیں۔ یہاں ہمارے دل کے گھونسلے میں وہ انڈہ پیدا نہیں ہوتا جسے اعتماد کا نام دیا جاسکے۔

جب آپ اپنے خوف کو دُور کرنے کے لیے کوئی اور لیور استعمال کرتے ہیں اور کوئی اور "اُپائے" (حل) ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر آپ کے اندر اعتماد پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بجلی کے تار تانبے کے ہوا کرتے تھے۔ اُن میں سے بجلی بہت اچھے طریقے سے گزرتی تھی۔

جن ممالک کے پاس تانبے کے ذخائر تھے اُن میں افریقہ کے وہ ملک بھی تھے جن پر گوروں کا قبضہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ تھوڑے سالوں کے اندر تانبے کی قیمت سونے سے بھی بڑھ جائے گی کیونکہ اس کی ڈیمانڈ میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اب انہوں نے اپنی عقل اور دانش کے مطابق تانبے کے ذخائر پر چھاؤنی ڈال دی اور انہیں سینے سے لگا کر بیٹھ گئے اور تانبے کو باہر نہ آنے دیتے تھے کہ اس کی قیمتیں بڑھیں گی تو بیچیں گے۔

اس طرح پھر بجلی کی تاروں کے لیے سلور کے تار استعمال ہونے لگے کیونکہ تانبا دستیاب نہیں تھا۔

اب خدا نے بھی اپنا ایک نظام رکھا ہوا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ (ترجمہ) ''میں ان سے زیادہ مکر کر سکتا ہوں'' کہ اگر وہ مکر کرتے ہیں تو اللہ بھی اس بات کے قابل ہے کہ مکر کر سکے۔ اللہ نے اُن لوگوں کو جن کے پاس تانبا نہیں تھا، انہیں عقل دی اور کہا کہ چلو ایک سیٹیلائٹ تیار کرو جس میں تانبے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور ذخیرہ اندوزوں کو مُنہ کی کھانی پڑے۔ اللہ بے شک جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔

آپ جانتے ہیں نا کہ ہمارا یہ پروگرام بھی سیٹیلائٹ کے باعث ساری دنیا ناروے اور برطانیہ میں بغیر تار اور تانبے کے دیکھا جا رہا ہے اور تانبے والے بیٹھے رو رہے ہیں۔ اللہ کے پاس بڑے طریقے ہیں اور انداز ہیں۔

مشکل مجھ پر بھی آتی ہے۔ گھبراہٹ بھی آتی ہے۔ گھبراہٹ کو محسوس کرنے والوں میں میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہوں۔ میں بڑا دھنتر خاں نہیں ہوں۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں کسی بات کی پروا نہیں کرتا۔ نہیں خوف اور تشویش میرے اندر آپ سے زیادہ ہی ہو گی کیونکہ میں آپ سے دو کتابیں زیادہ پڑھا ہوا ہوں۔

خواتین و حضرات! خوش نصیب آدمی وہ ہے جو اپنے اندر خوف کے باوجود یقینِ

محکم پیدا کرتا ہے۔

اگر آپ کہیں گے کہ اس یقین سے ایک شیر نر پیدا ہو گا جو آپ کی حفاظت کرے گا تو ضرور ایسا ہو گا لیکن اگر آپ کہیں گے اور واویلا کرتے رہیں گے کہ "مارے گئے، لوٹے گئے، برباد ہو گئے۔" تو اس طرح سے کام بننے والا نہیں ہے۔ ایک بار ہم ناران گئے۔ وہاں دو تین دن قیام کے بعد ہمارا ارادہ جھیل سیف الملوک جانے کا تھا لیکن ہمیں ہمارے گروپ لیڈر ممتاز مفتی نے رائے دی کہ باٹا کنڈی چلتے ہیں۔ یہ ناران سے اُلٹے ہاتھ پر واقع ہے۔ نہایت خوبصورت پیاری جگہ ہے۔ وہاں پہاڑوں کے اندر ساہیوال اور فیصل آباد جیسی مٹّی ہے۔ بڑے خوبصورت پھولوں کے تختے وہاں بچھے ہوئے ہیں۔ ہم وہاں بڑے لطف اندوز ہوں گے۔ وہاں کے ایک مقامی کوہستانی شخص نے ہمیں گائیڈ کیا کہ اس جگہ سے پیچھے پہاڑوں کی شاخوں کے اندر اور ان کے پیچھے تختوں میں ایسے پھول ہیں کہ کسی نے دیکھے نہیں ہوں گے۔ ان کی خوشبو اور رنگت قابلِ دید ہے۔ جب ہم اس جگہ کے قریب گئے تو ہم نے دیکھا کہ وہ بالکل عمودی پہاڑ تھے۔ ان میں سے گزرنے کا راستہ بڑا مشکل تھا۔ عمودی پہاڑوں کے بالکل نیچے پچیس ہزار فٹ گہری کھڈ تھی۔ اب ہم ڈرے ہوئے تھے۔ ہمیں ایک گز کی چھلانگ مار کر انہیں

عبور کرنا تھا۔

ہمارے گائیڈ نے اپنا ہاتھ ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ پر ایک پُل کی طرح رکھ دیا اور وہ مجھ

سے کہنے لگا کہ "صاحب آپ میرے ہاتھ پر پاؤں رکھ کر گزریں۔"

اب مجھ میں اتنی ہمّت کہاں تھی۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔

وہ گائیڈ ہنسا اور کہنے لگا کہ "صاحب اس کے اُوپر پاؤں رکھیں۔ یہ وہ بازو ہے جس نے کئی سینکڑوں آدمیوں کو گزارا ہے اور کسی کو دھوکا نہیں دیا۔"

اب اس کی بات ہی ایسی تھی کہ اعتماد اور یقین کی ایک طاقت میرے اندر عود کر آگئی۔ جب ہم نے اس کے بازو پر پاؤں رکھا تو وہ واقعی بڑا مضبوط تھا۔ ہم آٹھ آدمی تھے۔ سارے اس سے گزرے اور پھر واپس بھی آئے۔

بچّو! اعتماد کے بڑے رُخ ہوتے ہیں۔ اعتماد ہمیں کرنا پڑے گا۔ اللہ نے اگر کہہ دیا ہے تو پھر اس پر اعتماد کر کے چلیں اور آپ کے لیے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ اگر سوچ میں پڑ گئے تو

پھر نہیں۔ میرے ایک اُستاد اونگارتی تھے۔ میں ان کا ذکر پہلے بھی کرتا رہا ہوں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ ”سر ایمان کیا ہوتا ہے۔“

انہوں نے جواب دیا کہ ”ایمان خدا کے کہے پر عمل کرتے جانے اور کوئی سوال نہ کرنے کا نام ہے۔ یہ ایمان کی ایک ایسی تعریف تھی جو دل کو لگتی تھی۔“

اٹلی میں ہمارے کمرے میں ایک بار آگ لگ گئی اور ایک بچّہ تیسری منزل پر رہ گیا۔ شعلے بڑے خوفناک قسم کے تھے۔ اس بچّے کا باپ نیچے زمین پر کھڑا بڑا بیقرار اور پریشان تھا۔ اس لڑکے کو کھڑکی میں دیکھ کر اس کے باپ نے کہا کہ ”چھلانگ مار بیٹا۔“

اس لڑکے نے کہا کہ ”بابا میں کیسے چھلانگ ماروں۔ مجھے تو تم نظر ہی نہیں آ رہے۔“(اب وہاں روشنی اس کی آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔)

اس کے باپ نے کہا کہ ”تو چاہے جہاں بھی چھلانگ مار تیرا باپ تیرے نیچے ہے تو مجھے نہیں دیکھ رہا میں تو تمہیں دیکھ رہا ہوں نا؟“

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ”تم مجھے نہیں دیکھ رہے۔ میں تو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“

اعتماد کی دنیا میں اُترنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی شہ رگ کی بیٹھک اور شہ رگ کے ڈرائنگ روم کا کسی نہ کسی طرح آہستگی سے دروازہ کھولیں۔ اس کی چٹخنی اُتاریں اور اس شہ رگ کی بیٹھک میں داخل ہو جائیں جہاں اللہ پہلے سے موجود ہے۔

اللہ آپ کو خوش رکھے اور آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

کریڈٹ کارڈ رشتے

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں اہلِ زاویہ کا محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

زندگی کچھ ایسی بے معنی ہو گئی ہے (میں اسے مصروف تو نہیں کہتا) کہ انسانوں سے تعلقات ٹوٹتے جا رہے ہیں اور اپنے اپنوں سے بہت ہی دُور ہوتے جا رہے ہیں۔

انسان بڑی آرزو رکھتا ہے کہ وہ اپنوں سے ملتا رہے لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ایک ہی شہر میں ہوتے ہوئے ایک ہی محلّے میں رہتے ہوئے آپ اپنے انتہائی قریبی عزیزوں اور دوستوں سے مل نہیں پاتے۔ میں چھوٹے شہروں کے بارے میں تو کچھ عوض نہیں کرتا اس لیے کہ وہاں تو اللہ کا بڑا فضل ہو گا اور وہاں کے لوگ آپس میں ملتے رہتے ہوں گے لیکن بڑے شہر کچھ اس طرح سے بدنصیبی کی لپیٹ میں آ گئے ہیں کہ وہاں پر رشتوں کے جو معاملات ہیں وہ ٹھیک طرح سے

طے نہیں ہو پا رہے۔

میری ایک خالہ زاد بہن ہے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ہمیں بہت ہی عزیز اور پیاری تھی۔ ہم آپس میں کھیلتے تھے اور لڑائیاں کیا کرتے تھے۔ وہ اسی شہر لاہور میں ریلوے لائنوں کے اس پار بستی ہے وہاں رہتی ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ کِن حالوں میں ہے۔ اس کے بچّے کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اس کے خاوند کی پریکٹس اب کیسی ہے اور وہ کیسے ہیں؟

میں جب بیٹھ کر اس کا تجزیہ کرتا ہوں کہ یہ سب ہو کیسے گیا ہے۔ میں تجزیے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ مجھے اپنے ہی ایسے کام ہیں کہ جان نہیں چھوٹتی۔ مثال کے طور پر مجھے اپنا پراپرٹی ٹیکس درست کروانا ہے جو غلط آ گیا ہے۔ میرے کچھ دوسرے ذاتی معاملات ہیں جن میں مصروف ہوں یا میں نے اپنے ڈرائیونگ لائسنس کو نیا بنوانا ہے کیونکہ پہلے والا زائد المیعاد ہو چکا ہے۔ وہاں جا کر پتا چلتا ہے کہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں میری Eye Sight ٹھیک نہیں رہی۔ البتہ میں اپنی نظر چیک کروانے کے لیے جاتا ہوں لیکن اس کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے مجھے پھر چکر لگانے پڑتے ہیں۔

میرا بیٹا لاہور سے ذرا دُور رائیونڈ میں رہتا ہے۔ وہاں گیس کی سہولت نہیں ہے، لہٰذا مجھے اسے گیس سلنڈر فراہم کرنے کے لیے اس کے پیچھے رائیونڈ جانا پڑتا ہے۔ ہمارے ملازم کو کتّا کاٹ گیا تو اسے چودہ ٹیکے لگوانے کے لیے مجھے ہسپتال جانا پڑا۔ میں وہاں بھی گیا لیکن ریلوے کے اس پار رہتی اپنی بہن کے پاس نہ جا سکا۔ اس کے اور میرے درمیان جو یہ ساری عام سی چیزیں حائل ہوتی رہتی ہیں میں انہیں دُور نہیں کر سکتا۔

مجھے گیارہ کتابوں کے دیباچے لکھنا ہیں۔ مجھے مشاعرے کی صدارت کرنی ہے۔ مجھے کہا گیا ہے کہ یہ جو بڑی بڑی فارمی مونگ پھلی ہوتی ہے، یہ گلا پکڑتی ہے اور مجھے اکبری منڈی جا کر چھوٹی اصلی اور دیسی مونگ پھلی تلاش کرنا ہے۔ میری بہو مجھ سے کہتی ہے کہ آپ سبزی منڈی جا کر میرے لیے "بروکلی" لائیں (اس نے کسی کتاب میں پڑھ لیا ہو گا کہ یہ فائدے کی چیز ہے) میں وہ لے آتا ہوں۔ میری روح اور جسم کے درمیان اس طرح کی مصروفیت رہتی ہے۔ میں سارے کام کر لیتا ہوں لیکن اپنی خالہ زاد بہن کے لیے چند منٹ یا گھنٹے نہیں نکال پاتا۔ کوئی بڑی مصروفیات نہیں ہیں لیکن یہ زندگی میں حائل ہوتی رہتی ہیں اور سالہا سال چلتی رہتی ہیں اور میں ریلوے پھاٹک کراس نہیں کر پاتا کہ اپنی بہن کا حال

احوال معلوم کر سکوں۔ یہاں کراچی، پنڈی، لاہور میں میرے انتہائی قریبی عزیز و اقارب آباد ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کو نہیں مل پاتے۔ ایک فوتید گی کے موقع پر میں نیم غنودگی میں کچھ سویا ہوا تھا اور کچھ جاگا ہوا نیم دراز سا پڑا تھا۔ وہاں بچّے بھی تھے جو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک بچّے کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ”کوئی فوت ہو جائے تو بڑا مزہ آتا ہے۔ ہم سب اکٹھے ہو جاتے ہیں اور سارے رشتہ دار ملتے ہیں۔“

پھر ایک بچّے نے کہا کہ ”اب پتہ نہیں کون فوت ہو گا؟ نانا نصیر الدّین بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اُن کی سفید داڑھی ہے۔ شاید اب وہ فوت ہوں گے۔ اس پر جھگڑا کھڑا ہو گیا اور وہ آپس میں بحث کرنے لگے۔ کچھ بچّوں کا مؤقف تھا کہ پھوپھی زہرا کافی بوڑھی ہوئی ہیں۔ وہ جب فوت ہوں گی تو ہم انشاء اللہ لائلپور (فیصل آباد) جائیں گے اور وہاں ملیں گے اور خوب کھیلیں گے۔“

خواتین و حضرات! میں آپ کو ایک خوشخبری دوں کہ بچّوں کی اس بحث میں میرا نام بھی آیا۔ میری بھابھی کی چھوٹی بیٹی جو بہت ہی چھوٹی ہے اس نے کہا کہ ”نانا اشفاق بھی بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔“

خواتین و حضرات! شاید میں چونکا بھی اس کی بات سُن کر تھا۔ جو میرے حمایتی بچّے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ جب نانا اشفاق فوت ہوں گے تو بہت رونق ہو گی کیونکہ یہ بڑے مشہور ہیں۔

جب بچّوں کا جھگڑا کچھ بڑھ گیا اور ان میں تلخی پیدا ہونے لگی تو ایک بچّے نے کہا کہ جب نانا اشفاق فوت ہوں گے تو گورنر آئیں گے اس پر ایک بچّی نے کہا کہ ”نہیں گھر نہیں آئیں گے بلکہ وہ پھولوں کی ایک چادر بھیجیں گے کیونکہ گورنر بہت مصروف ہوتا ہے۔ تمہارے دادا یا نانا ابو اتنے بھی بڑے آدمی نہیں کہ ان کے فوت ہو جانے پر گورنر آئیں گے۔“

وہ بچّے بڑے سنجیدہ اور گہری سوچ بچار کے ساتھ آئندہ ملنے کے پروگرام بنا رہے تھے۔ ظاہر ہے بچّوں کو تو اپنے دوستوں سے ملنے کی بڑی آرزو ہوتی ہے نا! ہم بڑوں نے ایسا ماحول بنا

دیا ہے کہ ہم رشتے بھول کر کچھ زیادہ ہی کاروباری ہو گئے ہیں۔ چیزوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں حالانکہ چیزیں ساتھ نہیں دیتیں۔ ہم جانتے بھی ہیں کہ رشتے طاقتور ہوتے ہیں اور ہم رشتوں کے حوالے سے ہی پہنچانے جاتے ہیں۔ آپ

بھائی، ماں، باپ، بیوی، بیٹی چاہے کوئی بھی رشتہ دیکھ لیں ہمیں کسی نہ کسی رشتے میں بندھنا پڑے گا ہی۔ چاہے گھر کا رشتہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہم کسی نہ کسی رشتے میں بندھے ہیں آزاد نہیں ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کے نہیں ہمیں تو بہت زیادہ پیسے کی ضرورت ہے۔ ہم ترقّی کا مطلب مالی طور پر استحکام ہونے کو کہتے ہیں۔

خواتین و حضرات! اگر ہم کہیں کہ ہماری اقدار بدل گئی ہیں تو یہ بات غلط ہے۔ اقتدار اب بھی قائم ہیں۔ سچّے جھوٹے، دیانتدار اور بددیانت میں اب بھی واضح فرق ہے۔ ہم چاہے گھر بدل لیں، محلّہ یا شہر بدل لیں، قدریں ہر جگہ موجود ہوں گی۔ خوفناک بات تو یہ ہے کہ ہمارے بچّوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے لیے ہمارے فوت ہونے کا انتظار ہے۔ یہ خرابی بچّوں کی نہیں ہے، ہماری ہے۔ میں تو ایسی خواہش کو اُن کی خوبی گردانتا ہوں۔ وہ ملنے کے خواہشمند ہیں۔

خدا کے لیے کوشش کریں کہ ہم اپنے رشتوں کو جوڑ سکیں۔ ایسی خلیج حائل نہ ہونے دیں کہ ملاقاتیں صرف کسی کے فوت ہو جانے کی مرہونِ منّت ہی رہ جائیں۔ رشتے بڑی تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ یہ کریڈٹ کارڈز رشتے نہیں جوڑ سکتے ہیں اور کوئی پانچ سالہ منصوبوں سے یہ کام نہیں ہو گا۔ یہ کام تو ہمیں آج ہی کرنا پڑے گا۔ وجود کپڑے پہننے سے دلکش اور Decorate نہیں ہو گا۔ اس کے

لیے اندر کی صفائی بھی ضروری ہے۔

اپنی کوتاہیاں جاننے کی ضرورت ہے۔ اپنے رشتوں کو پہچاننے کے لیے اور ایک دوسرے کے قریب رہنے کے لیے وہ وقت نکالنا پڑے گا۔ رشتوں کو کریڈٹ کارڈ جتنی تو کم از کم اہمیت دینی پڑے گی۔ مجھے اپنے یوٹیلٹی بِلز کا بڑا فکر ہے۔ فون کٹ جانے اور دوبارہ بحال نہ ہونے کی بڑی چنتا ہے۔ بار بار دفتروں کے چکر بھی لگاتا رہتا ہوں لیکن مجھے اپنی اُس بہن، جو مجھے بہت پیاری تھی، میرا اس سے رشتہ کٹا ہوا ہے وہاں نہیں جا پاتا۔

کیا ہم ان بچّوں کی طرح اس بات کا انتظار کریں گے کہ کوئی مرے پھر ہم مجبوری کے ساتھ لاٹھی ٹیکتے ہوئے یا چھڑی پکڑے وہاں جائیں۔ جب ہم کہیں جائیں تو یہ فخر ضرور دل میں ہونا چاہیے کہ میں ایک شخص سے ملنے جا رہا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی دنیاوی غرض نہیں ہے۔ اس کے پاس اس لیے جا رہا ہوں کہ وہ مجھے بہت پیارا ہے۔ چاہے ہم اس کام کے لیے کم وقت دیں لیکن دیں ضرور۔

آپ میرے لیے بھی دُعا کریں کہ میں بھی کبھی ریلوے لائن کراس کر کے لاٹھی ٹیکتا اپنی بہن کو ملنے جاؤں۔ میری یہ دِلی خواہش ہے کہ ہم آپس میں ملیں

اور ملتے رہیں اور اس کا خصوصی اہتمام کرتے رہیں تا کہ ہمارے بچّوں کو فوتید گی والے گھر کی بجائے عام حالات میں بھی ایک دوسرے کو ملنے کا موقع میسر آ سکے اور انہیں جلد کسی کے مرنے کی خواہش نہ کرنی پڑے اور ان کی ''بچّہ میٹنگ'' ہوتی رہے اور ہم ایک ہی جگہ پر رہتے ہوئے اپنے گھروں کو دیارِ غیر نہ بنادیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

Defensive Weapon

ہم سب کی طرف سے اہلِ زاویہ کو سلام پہنچے۔

یہ زاویے والے لوگ بھی دنیا کے دیگر تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح سے اپنی پٹڑی کے اندر کچھ ایسا اہتمام کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگوں کی روحانی مشکلات کا سدِّباب ہوتا ہے۔ ان کا یہ خیال ہے اور یہ بہت جائز خیال ہے کہ انسان جانور کے مقابلے میں اشرف تر چیز ہے اور وہ اس بات کا ہر وقت خیال بھی رکھتا ہے اور اس کی کوشش رہتی ہے کہ وہ اس سے ہمیشہ اُوپر رہے اور اُونچا رہے اور جو چیز اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہی ہے کہ انسان اور جانور میں روح اور جان کا فرق ہوتا ہے۔ انسان روح کا حامل ہے جبکہ جانور جان رکھتا ہے اور روح کا مظاہرہ کرنے اور اسے حفاظت میں رکھنے کے لیے انسان کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ جانور تو اپنی جبلّت کے سہارے اور صلاحیتوں کے مطابق زندگی گزارتا ہے جبکہ انسان میں رکاوٹ ہے، اسے جب بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتا ہے، پیاس

لگے تو پانی پیتا ہے اور اسے Reproduction کرنی ہو تو وہ اپنی مادہ کے پاس جائے لیکن انسان ایسی مخلوق ہے جو جانوروں سے یوں بھی برتر ہے کہ انسان Faith یعنی ایمان بھی رکھتا ہے۔ بھینس کا کوئی ایمان نہیں ہے۔ گھوڑے کو علم نہیں ہے کہ ایمان اور ایقان کیا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کو ایمان کا پتہ ہے اور وہ کوشش بھی کرتا ہے کہ وہ اسے سمیٹ کر اور سنبھال کر رکھے۔ بھینس کے دل میں بھی یہ خیال نہیں آیا کہ آج کھانا نہیں کھاتے بلکہ روزہ رکھنا ہے۔ انسان کے دل میں خیال آتا ہے کہ روزہ رکھوں اور اپنا احتساب کروں۔ کی مگر مچھ نے نہیں سوچا کہ اس کی ۲۷۰ برس کی عمر ہو گئی ہے۔ اس نے بڑے ظلم کیے ہیں اور اب اسے شرمندگی کا کچھ احساس ہونا چاہیے اور اللہ سے معافی مانگنی چاہیے۔ انسان کا رتبہ صرف اس وجہ سے بلند ہے کہ وہ اپنی خود احتسابی میں شامل ہوتا ہے۔

مجھے جن بابوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ عجیب و غریب قسم کے طریقے ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ ان طریقوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر ہمارے اُوپر کوئی بلا پڑے تو اس سے بخوبی احسن نمٹا جائے۔ یہ بابے اکثر تلقین کرتے ہیں کہ ہر انسان کو اپنے ساتھ ایک خنجر ضرور رکھنا چاہیے اور وہ اس خنجر کے ساتھ ہر وقت

الرٹ اور چوکس رہے اور جب بھی اس پر کوئی منفی چیز حملہ آور ہو تو وہ اس کا جواب دینے کے لیے جواباً بھی حملہ کرے اور اس منفی چیز کو قریب نہ آنے دے۔ اس منفی چیز میں کوئی بھی خرابی یا گناہ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہوں اور گہرے خیالوں میں گُم ہیں اور اچانک کھلی ہوئی کھڑکی کی جھری میں سے ایک بھِڑ اندر آ جاتا ہے۔ آپ اچانک اسے دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور ہاتھ چلا دیتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ چلانے کے ساتھ ہی کتاب گر جاتی ہے۔ قلمدان دوسری طرف اُلٹ جاتا ہے حالانکہ وہ بھِڑ آپ کو کچھ نہیں کہہ رہا ہوتا ہے۔ (پروگرام کے سیٹ پر اشفاق احمد کو لسّی پیش کی جاتی ہے۔ وہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں یار یہ پی کر بچپن یاد آ گیا)۔ ہمارے بابے اسی حوالے سے فرماتے ہیں کہ آپ کو منفی چیزوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمہ وقت تیاری رکھنی چاہیے۔ خواتین و حضرات! وہ خنجر سچ مچ کا خنجر نہیں ہے۔ وہ آپ کی Alertness ہوشیاری اور شعور کا خنجر ہے۔ جب تک وہ استعمال نہیں کیا جائے گا اس وقت تک آپ کی اشرف المخلوقاتی دھری کی دھری رہ جائے گی۔ تمام بزرگ اور بابے اس کا خیال رکھتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے بابا جی کہا کرتے تھے کہ رشوت کے معاملے میں آپ کو ہر وقت خنجر بکف رہنا چاہیے۔ کیونکہ آپ کے دفتر میں کوئی بھی کسی وقت بھی آ کر ڈھیر

ساری رقم آپ کو رشوت کے طور پر دے سکتا ہے۔ آدمی کمزور ہے، اس کی میز میں درازیں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس صورت میں باباجی کہتے ہیں اس رشوت پر فوراً حملہ آور ہونے کی ضرورت ہے جیسے بِھڑ اندر گھستی ہے تو آپ اس پر حملہ کرتے ہیں، ویسے ہی رشوت پر حملہ کرنا چاہیے اور اپنے شعور اور چالاکی سے اس کی گرفت میں خود کو کبھی نہیں آنے دینا چاہیے۔ جو لوگ خفیہ قسم کی جیبیں لگا کر آتے ہیں انہیں چاہیے کہ ان جیبوں سے ہی خنجر نکالیں۔ فرید الدّین عطار بہت پائے کے بزرگ تھے۔ وہ اپنے ستّر مریدین کو، جو اُن کے اُونچے درجے کے مرید تھے، لے کر جنگل میں چلے گئے۔ یہ بزرگ جنگل میں ضرور جاتے تھے تاکہ اس سے وہ دوسروں کو سمجھ سکیں اور خود سمجھ سکیں کہ اللہ کی زمین کی سیر کے کیا معنی ہیں۔ یہ سیر کس طرح سے کرنی چاہیے اور عبرت کے نشانوں کو کس طرح سے ملاحظہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ اپنے مریدین کو لے کر جنگل کی طرف چل پڑے۔ وہ ابھی جنگل میں پہنچے ہی ہیں اور انہوں نے جنگل کا ایک پڑاؤ بھی نہیں گزارا تھا کہ ایک چھوٹی سی بستی راستے میں آ گئی۔ وہاں گاؤں کے باہر لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ ان میں ایک عیسائی لڑکی بھی تھی جو بڑی خوبصورت تھی۔ حضرت صاحب نے اسے دیکھا اور اپنا کٹار اور خنجر بھول گئے حالانکہ اپنے خنجر کے دستے پر ہاتھ ہر وقت رکھنے کا حکم ہے۔ وہ بر وقت اپنے خنجر کا استعمال نہ

کر سکے اور اس لڑکی کی محبّت میں گرفتار ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں تو اس سے شادی کروں گا۔ اب ساتھ ان کے ستّر کے قریب مرید بھی ہیں جن کو تعلیم دینے چلے تھے۔ حضرت صاحب کی یہ بات سُن کر انہوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس لڑکی کے والدین بھی آ گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم شادی کے لیے تیار ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ عیسائی ہو جائیں کیونکہ ہم اپنے مذہب سے باہر شادی نہیں کرتے ہیں۔ لہٰذا حضرت صاحب نے کہا کہ میں تیار ہوں۔ اب وہاں اس قدر شور و غوغا مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور ان کے مریدین زمین پر لوٹتے اور تڑپتے تھے کہ ہمارے مرشد کو کیا ہو گیا۔ لڑکی کے والد نے کہا کہ ہماری بہت سی زمین ہے اور اس لڑکی کے بہت سے سوٴروں کے ریوڑ ہیں اور آپ کو وہ سوٴر چرانے پڑیں گے۔ انہوں نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے بس یہ بتا دیجیے کہ انہیں کیسے چراتے ہیں۔ (اب دیکھیئے کہ وہ عام شخص نہیں تھے بلکہ جیّد عالم تھے) اگلے دن سوٴروں کا باڑا کھول دیا گیا اور حضرت صاحب انہیں چرانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور انہیں لے کر جنگل میں چلے گئے اور ان کے شاگرد روتے پیٹتے آہ و بکا کرتے ہوئے واپس اپنے ڈیرے پہنچ گئے اور سوچنے لگے کہ ایسی کون سی ترکیب کی جائے کہ حضور کو کسی طرح سے واپس لایا جائے۔ وہ کمزور تھے اور انہیں واپس نہ لا سکے

لیکن وہ کبھی کبھی اپنا کوئی بندہ بھیج کر ان کی حقیقت معلوم کراتے تھے۔

خواتین و حضرات! جب میں یہ قصّہ پڑھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ یہ جو ماننے والے لوگ ہوتے ہیں، چاہے اُن کے اُستاد سے کوئی کوتاہی ہو جائے کہ اس میں اتنے نقص نہیں نکالتے جیسے ہم لوگ کرتے ہیں۔ وہ ہمارے برعکس دکھ میں مبتلا ہوتے ہیں جبکہ ہم خوشی مناتے ہیں۔ اُن کے شاگرد اُن کا پتہ کرواتے رہے اور کہتے ہیں کہ اُن کے شاگرد اپنے گرو کی یاد میں چھ یا آٹھ برس تک شدّت سے مبتلا رہے اور اُن کے گرو ایک عیسائی یا نصرانی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ پھر کچھ عرصے بعد اُن کے شاگرد جہاں رہتے تھے وہاں کوئی بزرگ آئے تو انہوں نے اُن سے اپنا دکھ بیان کیا کہ ہمارے ساتھ یہ گزری ہے۔ اس بزرگ نے پوچھا کہ کیا تمہارے گرو کی تمہارے پاس کوئی چادر ہے۔ انہوں نے کہا کہ جی ہے۔ تو بزرگ نے کہا کہ یہ ساتھ لے جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ غسل کریں اور یہ اپنی چادر لپیٹ لیں۔ وہ شاگرد اُن کی ایک چادر لے کر اپنے گرو کے پاس گئے تو اس وقت وہ سؤر چرا رہے تھے۔ انہوں نے شاگردوں کو دیکھ کر کہا کہ "جاؤ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

انہوں نے کہا کہ جی ہمارا انسانیت کا واسطہ اور رشتہ تو ہے۔ روحانیت کا نہیں بھی

تو کوئی بات نہیں۔ آپ غسل فرمایئے اور پھر اس چادر کو لپیٹ لیجئے اور ہمارے ساتھ کچھ باتیں کیجئے۔ ہم آپ سے اداس ہیں۔ آپ سے روحانیت یا دین کی باتیں نہیں کریں گے۔ بس ایسے ہی کچھ دیر باتیں واتیں کریں گے۔ وہ مان گئے اور ساتھ ندی میں غسل کیا۔ وہ چادر لپٹی تو جیسے اُن کے شاگرد رویا کرتے تھے وہ کیفیت اُن پر بھی طاری ہوئی۔ ان سے کوتاہی یہ ہوئی تھی کہ وہ وقت پر کسی وجہ سے الرٹ نہیں رہ سکے تھے۔ ہم اور آپ بھی جب الرٹ نہیں رہتے ہیں تو معاملہ خراب ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ڈیفنس کا ہتھیار موجود ہوتا ہے لیکن جب وہ وقت پر استعمال نہیں ہوتا ہے تو ہم چاروں شانے چِت گِر جاتے ہیں اور وہ موقع ہاتھ سے چلا جاتا ہے اور یہ واقع آتے رہتے ہیں۔

میرے تایا بیمار تھے اور کوما میں تھے۔ کبھی وہ کومے سے باہر آجاتے تھے اور کبھی ان پر پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور ہم سب بہن بھائی ایک مونڈھے پر بیٹھے ان کو Attend کرتے تھے۔ میں اس وقت سیکنڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ ایک دن انہیں Attend کرنے کی میری ڈیوٹی تھی۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ ”یہ جو اللہ ہے، کیا وہ انسانوں کے گناہ معاف کر سکتا ہے؟“ میں نے کہا کہ جی اللہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے اور گناہوں کو معاف کرنے میں تو وہ بڑا رحیم ہے اور غفور

الرّحیم ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ انسان اس سے گناہوں کی معافی مانگے۔ وہ کہنے لگے کہ بار یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ جب انہوں نے یہ کہا تو اُن کے چہرے پر کچھ بشاشت سی پیدا ہوئی اور میں نے ان کی خوشنودی کے لیے مزید کہا کہ تایا آپ نے کون سے کوئی ایسے گناہ کیے ہیں کہ آپ اس قدر پریشانی کے عالم میں ہیں۔ آپ تو ہمارے ساتھ بڑے چنگے رہے ہیں۔ یہ سُن کر انہوں نے کہا کہ

"Shut up, it is nothing between you and me, it is between me and my God."

اور انہوں نے بڑا غصّہ کیا اور مجھے وہاں سے اُٹھا دیا۔ جب میں نے حضرت عطار والا واقعہ پڑھا تو مجھے خیال آیا کہ اگر زندگی میں کبھی وہ کٹار یا خنجر ہاتھ سے رہ جائے اور آدمی کا نشانہ چُوک جائے اور کبھی ہار مان جائے تو پھر آخر میں ایک سکون عطا کرنے والا لمحہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ آدمی گناہوں کی معافی مانگ لے اور اللہ سے سچّی توبہ کر کے پھر اسی حالت میں آجاتا ہے جس میں وہ پہلے رکھا گیا تھا۔

روحانیت کی دنیا کی Certification کے لیے اس امر کی بہت ضرورت ہے کہ

انسان چوکس رہے۔ جس طرح کارخانے میں کام کرتے ہوئے چوکس رہا جاتا ہے، وہاں مشینیں چل رہی ہوتی ہیں اور کسی وقت بھی نقصان کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ بالکل اس طرح دنیا میں کسی بھی وقت کسی منفی چیز کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ رہنا چاہیے اور دنیاوی معاملات کو طے کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ کہیں ایسا حملہ نہ ہو جائے جس کے لیے آدمی تیار نہ ہو۔ بغداد میں ایک نوجوان تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا اور اس کا کام نعل سازی تھا۔ وہ نعل بناتا بھی تھا اور گھوڑے کے سُموں پر چڑھاتا بھی تھا۔ نعل بناتے وقت تپتی ہوئی بھٹی میں سُرخ شعلوں کے اندر وہ نعل رکھتا تھا اور پھر آگ میں سے اُسے کسی جمور یا کسی اوزار کے ساتھ نہیں پکڑتا تھا بلکہ آگ میں ہاتھ ڈال کے اس تپتے ہوئے شعلے جیسی نعل کو نکال لیتا اور اپنی مرضی کے مطابق اسے Shape دیتا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر دیوانہ کہتے اور حیران بھی ہوتے کہ اس کے ہاتھ پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہاں موصل شہر کا ایک شخص آیا۔ جب اس نے ماجرا دیکھا تو اس نے تجسس سے اس نوجوان سے پوچھا کہ اسے گرم گرم لوہا پکڑنے سے کیوں کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس نوجوان نے جواب دیا کہ وہ جلدی میں لوہے کو اُٹھا لیتا ہے اور اب اس پر ایک کیفیت طاری ہو گئی ہے کہ میرا ہاتھ اسے برداشت کرنے کا عادی ہو گیا ہے اور اُسے کسی پلاس یا جمور کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس

شخص نے کہا کہ ”میں اس بات کو نہیں مانتا۔ یہ تو کوئی اور ہی بات ہے۔“

کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ یہ کار نعل ساز بھائی اس خنجر کے استعمال کو جانتا ہے اور اس نے کسی مقام پر اس خنجر کو یا اپنے Defensive Weapon کو بڑی احتیاط کے ساتھ بڑے مناسب موقع پر استعمال کیا ہے اور اس نے نوجوان سے کہا کہ مجھے اس بات کی حقیقت بتاؤ۔ اس نوجوان نے بتایا کہ بغداد میں ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی تھی اور اس کے والدین عمرے کے لیے گئے اور کسی حادثے کا شکار ہو کے وہ دونوں فوت ہو گئے اور یہ لڑکی بے یار و مدد گار اس شہر میں رہنے لگی۔ وہ لڑکی پردے کی پلی ہوئی گھر کے اندر رہنے والی لڑکی تھی اور اب اس کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ زندگی کیسے گزارے۔ آخر کار نہایت غمزدہ اور پریشانی میں وہ باہر سڑک پر نکل آئی اور اس نے میرے دروازے پر آکر دستک دی اور کہا ”کیا ٹھنڈا پانی مل سکتا ہے؟“

میں نے کہا ”ہاں“ اور اندر سے اس لڑکی کو ٹھنڈا پانی لا کر پلایا اور اس لڑکی نے کہا کہ ”خدا تمہارا بھلا کرے۔“

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔ اس لڑکی نے

جواب دیا کہ

نہیں میں نے کچھ نہیں کھایا۔

میں نے اس سے اکیلے اس طرح پھرنے کی وجہ پوچھی تو اس لڑکی نے اپنے اوپر گزرا سارا واقعہ سُنایا اور کہا کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں زندگی کیسے بسر کروں۔ میں نے اس سے کہا تم شام کو یہیں میرے گھر آجانا اور میرے ساتھ کھانا کھانا۔ میں تمہارے لیے تمہارا پسندیدہ ڈنر کھلاؤں گا۔ وہ لڑکی چلی گئی۔

اس نوجوان نے بتایا کہ ”میں نے اس کے لیے کباب اور کئی اچھی چیزیں تیار کیں۔ وہ شام کے وقت میرے گھر آگئی اور میں نے اس کے آگے کھانا چُن دیا۔ جب اس لڑکی نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور میری نیّت بدل گئی کیونکہ وہ انتہا درجے کا ایک آسان موقع تھا جو میری دسترس میں تھا۔“

جب میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تو اس لڑکی نے پلٹ کر دیکھا اور اس نے کہا کہ میں بہت مایوس اور قریب المرگ اور اس دنیا سے گزر جانے والی ہوں۔ اس نے مزید کہا ”اے میرے پیارے بھائی تو مجھے خدا کے نام پر چھوڑ دے۔“

وہ نوجوان کہنے لگا کہ میرے سر پر بُرائی کا بھوت سوار تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ایسا موقع مجھے کبھی نہیں ملے گا میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لڑکی نے مجھے کہا کہ "میں تجھے اللہ اور رسول کے نام پر درخواست کرتی ہوں کہ میرے پاس سوائے میری عزّت کے اور کچھ نہیں ہے اور ایسا نہ ہو کہ میری عزّت بھی پامال ہو جائے اور میرے پاس کچھ بھی نہ بچے اور پھر اسی حالت میں مَیں اگر زندہ بھی رہوں تو مُردوں ہی کی طرح جیئوں۔"

اس نوجوان نے بتایا کہ لڑکی کی یہ بات سُن کر مجھ پر خدا جانے کیا اثر ہوا یا پھر مجھے اچانک اپنے خنجر کو استعمال کرنا آ گیا۔ میں نے دروازے کی چٹخنی کھولی اور دست بستہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہا کہ "مجھے معاف کر دینا۔ میرے اوپر ایک ایسی کیفیت گزری تھی جس سے میں نبرد آزما نہیں ہو سکا تھا لیکن اب وہ کیفیت دُور ہو گئی ہے۔ تم شوق سے کھانا کھاؤ اور تم میری بہن ہو۔"

یہ سُن کر اس لڑکی نے کہا کہ "اے اللہ! میرے اس بھائی پر دوزخ کی آگ حرام کر دے۔"

یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اُونچی آواز میں روتے ہوئے کہنے لگی کہ "اے اللہ! نہ

صرف دوزخ کی آگ حرام کر دے بلکہ اس پر ہر طرح کی آگ حرام کر دے۔"

نوجوان نے بتایا کہ وہ لڑکی یہ دُعا دے کر چلی گئی۔ ایک دن میرے پاس زنبور (جمور) نہیں تھا اور میں دھونکنی چلا کر نعل گرم کر رہا تھا۔ میں نے زنبور پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ دہکتے ہوئے کوئلوں میں چلا گیا لیکن میرے ہاتھ پر آگ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میں حیران ہوا اور پھر مجھے اس لڑکی کی وہ دُعا یاد آگئی اور تب سے لے کر اب تک میں اس دہکتی ہوئی آگ کو آگ نہیں سمجھتا ہوں بلکہ اس میں سے جو چاہوں بغیر کسی ڈر کے نکال لیتا ہوں۔

خواتین و حضرات! ہم سب کو عین وقت پر اپنے Defensive Weapon کو استعمال کرنا چاہیے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

قناعت پسندی

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

گزشتہ پروگراموں میں مَیں آپ سے روحانیت کی اور بابوں کی باتیں کرتا رہا، کچھ ایسے قصّے اور کہانیاں بیان کرتا رہا جو بڑے لوگوں کو جو باطن کا سفر کرنے والوں کو پیش آتے رہے۔ اس کے جواب میں مجھے اکثر روک روک کر یہ پوچھا جاتا رہا کہ یہ بابے کہاں ہوتے ہیں؟ ہم بھی ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہماری بھی آرزو ہے کہ اس باطن کے سفر میں شریک ہوں اور میں حسبِ استعداد آپ کو ان بابوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات فراہم کرتا رہا لیکن اب میں قدرے رُک گیا ہوں اور اس کی وجہ پرسوں کی ایک شادی ہے۔

آپ یقین نہیں کریں گے کہ جب شادی کا کھانا کھلا تو ہم جو بڑے معزّز لوگ وہاں پر گئے ہوئے تھے کھانے پر اس طرح ٹوٹ کر بھاگے کہ جس طرح پتنگ لوٹنے والے چھوٹے بچّے پتنگ کے پیچھے بھاگا کرتے ہیں۔ صورتحال دیکھ کر میں

نے کہا کہ ابھی انہیں بابوں کا ایڈریس دینا کچھ مناسب نہیں۔ میں نے انہیں زبان سے کچھ کم تو نہیں البتہ نہایت دست بستہ انداز میں سوچا کہ اگر انہیں بابوں کا پتہ اب دے دیا جائے تو یہ ان پر بڑا بوجھ ڈال دے گا۔ ابھی ہم چھوٹی چھوٹی باتوں کو پیاری پیاری باتوں کو سہارا دینے کے قابل نہیں ہوئے۔ ابھی ہم اس کھیل میں ایک جیسے ہی ہیں۔ پہلے ان چھوٹی باتوں پر توجّہ دی جائے جن پر توجّہ دی جانے کی ضرورت ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہماری زندگیوں پر اس قدر بڑا فرق ڈالتی ہیں اور ہلچل مچا دیتی ہیں جس طرح ایک چھوٹی سی کنگری جو ہم گہرے پانی میں پھینکتے ہیں تو لہروں کا ایک تلاطم برپا کر دیتی ہے۔ لیکن ابھی ہم ان چھوٹی باتوں کی گہرائی اور وسعت سے کچھ اچھی طرح آشنا نہیں ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹا سا واقعہ آپ کی زندگیوں میں بڑی وسعتیں لے کر آ سکتا ہے۔

خواتین و حضرات! یہ ایسے بھی میرا ایک خیال تھا۔ ضروری نہیں کہ ٹھیک ہو لیکن اس واقعہ سے مجھے افسوس ہوا اور میری طبیعت پر ذرا بوجھ پڑا۔ آپ پیارے لوگ ہیں۔ افسوس تو مجھے نہیں ہونا چاہیے گہرا بوجھ پڑا کہ شاید انہیں کسی نے بتلایا نہیں ہے۔ سکھایا نہیں۔ اس وجہ سے ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔

زندگی کی بہت ساری پیش قدمیوں میں ہمارا رویّہ بعض اوقات اس انداز کا ہو

جاتا ہے۔ یہ کوئی بڑی برائی کی بات تو نہیں ہے۔ البتّہ تھوڑے بوجھ کی بات ضرور ہے جو کرنے والے کی ذات اور اس کی روح پر پڑ جاتا ہے۔ روحانیت کا علم حاصل کرنا یا بابوں تک پہنچنا اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ بابا بننا اتنا بھی جاں فشاں کام نہیں ہے کہ کوئی بن ہی نہ پائے۔ میں تو ایک بابا نہ بن سکا لیکن آپ کے مُسکراتے ہوئے چہرے دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ میں ایک بلند پائے کا اور اچھا بابا بننے کی خصوصیات موجود ہیں۔ اگر آپ راہ چلتے ہوئے سڑک پر پڑے اینٹ روڑے کو اس مقصد سے ہٹا دیتے ہیں کہ کوئی اس کے باعث ِگر نہ جائے یا کسی کو چوٹ لگ جائے تو آپ بھی اپنی ذات میں بابے ہیں۔ پرانے زمانے میں اب تو شاید اس کے لیے اتنا تردّد نہیں کیا جاتا۔ ہمارے بزرگ راہ چلتے ہوئے سڑک پر پڑے کانٹے، اینٹ یا روڑے اپنی چھڑی سے ہٹا دیا کرتے تھے اور چاہے وہ جتنی بھی جلدی میں ہوں یہ کام کرتے جاتے تھے۔

خواتین و حضرات ! لوگوں کی راہوں سے کانٹے ہٹانے کا کام اب بھی معدوم نہیں ہوا ہے۔ آپ دن کے وقت اپنی کار یا موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ جلا کر تو دیکھیں۔ جو بھی دیکھے گا آپ کو ہاتھوں سے اشارہ دے گا کہ آپ کی گاڑی کی ہیڈ لائٹ روشن ہے۔ لیکن اگر آپ نے لوگوں کے اشاروں پر توجّہ نہ دی تو پھر

ٹریفک والا سارجنٹ آپ کی اس جانب اپنے خاص انداز میں توجّہ مبذول کروا دے گا (مُسکراتے ہوئے) اگر آپ موٹر سائیکل پر نکلیں اور اس کا سائیڈ والا سٹینڈ اگر آپ نے واپس اپنی جگہ پر نہیں کیا تو بھی آپ کو آوازیں دینے والے کم نہیں ہوں گے اور آپ کی توجّہ اس جانب ضرور مبذول کروائی جائے گی کہ آپ اس سٹینڈ کو درست کرلیں۔ ہمارے لوگوں کا یہ رویّہ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان میں بابا بننے کی پوری خصوصیات موجود ہیں۔

بچّو! اب ہم میں سے ہی کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کے دل میں بابا بننے کی خواہش ہی نہیں ہے۔ میری طبیعت پر اس بات کا بھی بڑا بوجھ پڑا کہ ہمارے ہاں لوگوں کو غلط ایڈریس بتانے کا رواج بھی بڑھ رہا ہے۔ اگر کوئی اجنبی شخص کسی سے کوئی ایڈریس پوچھے تو جان بوجھ کر غلط بتا دیا جاتا ہے اور یہ سب کسی غلط نظریے کے باعث نہیں کیا جاتا بلکہ محض مذاق یا تفریح کے طور پر ہی کیا جاتا ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ ہمیں اس بات کی تعلیم نہیں دی گئی ہے۔ ہمیں علم ہے کہ لوگوں کو درست راستے پر چلائیں۔ بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھائیں۔ لوگوں کو آسانیاں اور مدد دیں اور یہ ہمارا طُرّۂ امتیاز ہونا ہی چاہیے۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی برائیاں بڑی بن جاتی ہیں اور یہ چھوٹی چھوٹی محبّت کی جھرنیں محبّت اور پیار

کا ایک بڑا اپرنالا بن جائیں گی کہ اس کی تعریفیں اور میں ہماری سب کی زندگیوں کو تابناک بنادیں گی۔

یہ چھوٹی باتیں ایک چھوٹے کام جہاں ہمیں روحانی حوالے سے مدد فراہم کرتے ہیں اور ہمیں روحانیت کی دنیا میں لے جاتے ہیں وہاں ان معمولی کاموں کا ہماری مادی زندگی پر بھی مثبت اثر پڑتا ہے۔ جس طرح ہم اور آپ معاشی مسائل کا رونا ہر وقت روتے رہتے ہیں اور میں یہ نہیں کہتا کہ آپ بلا وجہ ایسا کرتے ہیں بلکہ مسائل ہیں بھی۔۔۔۔

سمن آباد میں جب میں رہا کرتا تھا تو ہماری گلی کی نکّڑ پر عموماً ایک بابا چھابڑی والا کھڑا ہوتا تھا۔ اس چھابڑی والے اور دوسرے چھابڑی والوں میں ایک نمایاں فرق تھا اور یہ فرق میں نے کئی برسوں کے بعد محسوس کیا کیونکہ ہر جمعہ کی جمعہ جب میں نماز پڑھنے کے لیے مسجد جارہا ہوتا تھا اور واپس آتا تھا تو وہ چھابڑی والا وہیں کھڑا ہوا ہوتا تھا اور اس کے پاس چھوٹے بچّوں کی بجائے نوجوانوں کا رش ہوتا تھا۔

میں بڑا حیران ہوتا کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس کی چھابڑی میں موسم کے

حوالے سے تھوڑے سے پھل وغیرہ ہوتے تھے اور وہ پھل بھی کوئی نہایت اعلیٰ قسم کے نہیں ہوتے تھے بلکہ عام سے جنہیں ہم درجہ دوم یا سوم کہتے ہیں وہ ہوتے تھے، لیکن رش بڑا ہوتا تھا۔ مجھے بڑا تجسس ہوا کہ پتہ کروں اصل معاملہ کیا ہے۔ ایک دن جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب میں گھر آرہا تھا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ آج اس کی وجۂ شہرت جانی جائے۔

میں ابھی شاید تب پایا نہیں تھا بلکہ خود کو جوان خیال کرتا تھا۔ میں اس چھابڑی والے کے

پاس گیا اور کہا کہ "باباجی آپ کا کیا حال ہے۔"

وہ نہایت اخلاق سے بولے کہ "جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے صاحب۔ حکم کرو کیا کھائیں گے۔"

میں نے کہا کہ "کیا بھاؤ ہے، یہ امرود جو پڑے ہیں ان کا کیا ریٹ ہے۔"

میری حیرانی کی اس وقت انتہا نہ رہی جب اس نے کہا کہ "صاحب جی جتنا دل کرتا ہے کھالو کوئی بات نہیں۔" اور وہ یہ کہتے ہوئے امرود کاٹنے لگا کہ "ایہہ امرود بڑے مٹھے نیں کھاؤ گے تے مزا آجائے گا۔"

میں نے اس سے کہا کہ ”مفت میں کیوں؟“

تو وہ کہنے لگا کہ ”جی رزق خدا کی دین ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ جو میری قسمت میں ہو گا مجھے مل جائے گا۔“

اب اس شخص میں میرا تجسس مزید بڑھ گیا اور میں نے اس کے کاٹ کے رکھے ہوئے امرود کھاتے ہوئے اس سے سوال کیا کہ ”بابا جی آپ کب سے یہ کام کر رہے ہیں؟“

اس نے جواب دیا کہ ”صاحب جی! مجھے پینتیس سال ہو گئے ہیں اس کام کو کرتے ہوئے۔“

میں نے اس سے پوچھا کہ ”کیا آپ اس سائیکل پر ہی چھابڑی لگا کر یہ کام کر رہے ہیں۔ دنیا نے بڑی ترقّی کر لی، آپ بھی ترقّی کرتے۔ سائیکل سے کوئی فروٹ کی بڑی دُکان بناتے اور مہنگے داموں چیزیں بیچ کر کوئی محل کھڑا کرتے۔“

اس نے جواب دیا کہ ”صاحب میرے تین بیٹے ہیں، ایک بیٹی ہے۔ بیٹی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور خوش ہے۔ پتوکی کے قریب گاؤں میں میری بارہ ایکڑ زرعی زمین ہے۔ اللہ کے فضل سے دو بیٹے شادی شدہ ہیں۔ ایک کاشت کاری کرتا ہے

جبکہ دوسرا بیوپار کا کام کرتا ہے۔ سب سے چھوٹا ابھی پڑھتا ہے۔ گھر میں خدا کا کرم ہے۔ خوشحالی ہے۔ ٹریکٹر ہے۔ میرے بیٹے مجھے کہتے ہیں کہ بابا اب یہ کام چھوڑ دو۔ اب تم بوڑھے ہو گئے ہو۔" وہ بولا "صاحب جی! میں اس چھوٹے سے کام کا ساتھ کیسے چھوڑ دوں جب اس نے مجھے نہیں چھوڑا۔ اس معمولی کام نے مجھے خوشحالی دی، خوشی دی۔ میں غریب آدمی تھا۔ اب زمین والا ہوں۔ ٹریکٹر والا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میری اولاد بڑی فرمانبردار ہے۔ میں نے اپنے بچّوں کو ہمیشہ حلال رزق کھلایا ہے۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ اس چھابڑی کو لے کر مرتے دم تک پھرتا رہوں۔ صبح سویرے اُٹھتا ہوں، منڈی جاتا ہوں، وہاں سے اوسط درجے کا فروٹ خریدتا ہوں اور گلی گلی پھرتا ہوں۔ شام کو ختم ہو جاتا ہے۔

کبھی میں نے بھاؤ پر تکرار نہیں کی۔ میری پوری زندگی میں کسی سے تلخ کلامی نہیں ہوئی۔ نوجوان میرے پاس کھڑے ہو کر فروٹ کھاتے ہیں اور مجھ سے محبّت سے پیش آتے ہیں۔ وہ مجھے بھی بڑے اچھے لگتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ چاہے وہ سارا دن اپنی چھابڑی میں سے لوگوں کو مفت کھلاتا رہے کبھی گھاٹا نہیں پڑا اور شام کو پیسے اس رقم سے ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں جن سے اس نے منڈی سے

پھل خرید اہوتا ہے۔"

خواتین و حضرات! معمولی کام کرتے رہا کریں اس سے کچھ دینا نہیں پڑتا، کسی معذور کو کام چھوڑ کر سڑک پار کروایا کریں۔ ہمسائیوں کو Bell دے کر ضرور کبھی کبھی پوچھا کریں کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اگر میرے لائق کوئی حکم ہو تو ضرور بتایئے گا۔ بطور ہمسایہ ہی آپ کا مجھ پر حق ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے کاموں سے ہمارے مشکل کام آسان ہو جائیں گے۔ جیسا کہ میں نے پہلے شادی کی ایک تقریب کا ذکر کیا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کام ہمارا شیوہ نہیں ہونا چاہئیں۔ ایسے کام ہرگز نہ کریں جن سے محسوس ہو کہ ہم کوئی بھوکی قوم ہیں بلکہ معلوم تو یہ ہونا چاہیے چاہے ہم خالی شکم ہوں لیکن دیکھنے والے لوگوں یہ محسوس ہو کہ ہم سیر شکم قوم ہیں۔ قناعت پسند اور صبر والی قوم ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

"مرعوبیت"

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ہماری ایک عادت بن چکی ہے کہ ہم دیارِ غیر اور دوسروں کی چیزوں کو بہت پسند اور اپنی خوبیوں اور چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

میں بھی جب کسی دُکان پر کوئی چیز لینے جاؤں تو پوچھتا ہوں امپورٹڈ دکھائیں، چاہے وہ مہنگی ہی ہو۔ حالانکہ ان میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو وطنِ عزیز کی بھی بنی ہوئی ہوتی ہیں اور یہاں سے وہاں جاتی ہیں اور پھر وہاں سے فارن مُہریں لگوا کر ہمارے ہاں پہنچتی ہیں۔

آج ہماری محفل میں لاہور سے ماورا بہت سے دوست تشریف لائے ہیں۔ میرے بائیں جانب جو صاحبان تشریف فرما ہیں وہ سیالکوٹ اور گوجرانوالہ سے آئے ہیں اور میرے دائیں ہاتھ جو شخصیات بھی ہیں وہ ڈی جی خان سے ہیں اور ان کا تعلق شعبۂ تعلیم سے ہے اور خاص طور پر یہ اُردُو لٹریچر سے وابستہ ہیں۔

انہیں دیکھ کر مجھے ایک بار پھر بڑی ہی شدّت سے ہمارے عظیم اور خوبصورت انسان ن م راشد کی یاد آگئی ہے جو ملتان کے رہنے والے تھے۔ وہ میرے ریڈیو میں باس تھے۔ بعد میں دوست بنے اور پھر بہت ہی قریبی دوست بنے۔

راشد صاحب سے ہمارا بہت ہی عقیدت، محبّت اور جاں نثاری کا سلسلہ تھا لیکن ایک بات پر میں ان سے ضرور معترض ہوتا تھا۔ ان میں مشرق کے مقابلے میں مغرب کی مرعوبیت بہت تھی۔ وہ مغرب کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ہر وقت مغرب کی ایجادات کے گُن گاتے رہتے تھے۔

میں اُن سے کہتا کہ "سر آپ اتنے بڑے شاعر ہیں اور شاعر بے شک ایک اُونچے مقام پر ہوتا ہے اس لیے اسے اس قدر مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

لیکن وہ مغرب اور گورے سے، ایجادات سے متاثر تھے اور ہمارے آج کل کے بچّوں کی طرح متاثر تھے۔ شاید ہمارے آج کے بچّے کسی حد تک جائز متاثر ہیں۔ میرا پوتا مجھے چند روز پہلے کہہ رہا

تھا کہ دادا یہ جو آپ مسلمانوں کے بڑے سائنس دان اور ریاضی دان ہونے کی

شیخی بگھارتے ہیں میں یہ بات کیسے مان لوں اگر ان میں کوئی ایسی بات ہوتی تو آج مسلمانوں کی یہ حالت نہ ہوتی۔ وہ مجھے کہتا کہ آپ بس ہمیں ایسے ہی مسلمانوں کے کارناموں کی کہانیاں سُناتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایسا کوئی ماضی تھا ہی نہیں جیسا کہ آپ دعوے کرتے ہو۔

میں نے اپنے پوتے سے کہا کہ میں پچھلے سے پچھلے سال ایتھنز گیا تو وہاں یونان کے ائیرپورٹ پر جو ٹیکسی والا مجھے لے کر ہوٹل آیا تھا وہ سقراط کا پڑپوتا تھا حالانکہ سقراط سچ مچ ایک بڑا آدمی تھا اور بڑا نام تھا۔

میں نے اپنے پوتے سے کہا کہ ”جو شخص میرا سامان اُٹھا کر ہوٹل کی تیسری منزل تک لے گیا وہ ارسطو کا کوئی کرلکڑ دوہتا تھا۔ بچّے یہ وقت قوموں پر آتا رہتا ہے۔ میرے پیارے پوتے ہم نے انگریز کے بھی عروج کا زمانہ دیکھا ہے۔ اب انگریز بھی وہ انگریز نہیں رہے جو میرے یا میرے ابّا جی کے زمانے میں تھا۔ بس تم خوفزدہ نہ ہوا کرو۔“ میں نے اس سے کہا کہ اگر آپ بے جا طور پر متاثر ہی ہوتے رہے تو پھر کام چلانا مشکل ہو جائے گا۔

میں ن م راشد صاحب کی بات کر رہا تھا۔ وہ یو این او میں ملازم ہو کر امریکہ گئے۔

یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ یو این او کی خوبصورت عمارت میں اٹھارویں منزل پر اُن کا دفتر تھا۔

میں یہ بات کئی بار پہلے کے پروگراموں میں بھی کر چکا ہوں۔ اس کو بار بار دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل جو مغرب سے بہت ہی متاثر ہے اسے بتلایا جائے کہ مغرب کی ترقّی بسا اوقات ہماری معاشرتی زندگی پر غلط اثرات بھی مرتب کر دیتی ہے، جس میں ہمیں شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ اگر شرمندگی نہ بھی اُٹھانا پڑے تو بھی دل پر جو بوجھ رہ جاتا ہے وہ بھی اچھے بھلے انسان کو مارنے کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ انسان اس گھمن گھیری سے نکل نہیں پاتا۔

آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ یو این او کی بلڈنگ ایک بند کتاب کی طرح ہے۔ میں ان دِنوں براڈکاسٹنگ کی چھوٹی سی تعلیم کے لیے نیویارک گیا ہوا تھا۔ میں اُن کی خدمت میں وہاں حاضر ہوتا تھا اور یہ میری عقیدت کا ایک حصّہ تھا۔ جب میں اُن کے دفتر میں جاتا تو وہ دریافت کرتے "آئس کریم۔۔۔۔۔؟"

میں کہتا "کیوں نہیں۔"

ہم وہاں کینٹین چلے جاتے، وہ ایک لوہے کی مشین میں پیسے ڈال کر بٹن دباتے تو مشین سے خود بخود ایک آئس کریم سے بھرا کر چھا نکل آتا۔

وہ مجھے کہتے "دیکھا ہے کمال مشین کا۔" اس زمانے میں فوٹو کاپی کی نئی نئی مشین آئی تھی۔ وہ آج کل کی مشین کی طرح نہیں تھی۔ اس میں براؤن رنگ کی کاپی نکلتی تھی۔ راشد صاحب کو شاید اتنی فوٹو کاپی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور میرے اُوپر مغرب کا رُعب ڈالنے کے لیے اپنی سیکریٹری سے کہتے کہ فلاں کاغذ کی اتنی کاپیاں لے کر آؤ۔ وہ بیچاری ٹک کر کے اس کی کاپیاں نکال دیتی۔

میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے کہ "تم کوئی چیز لکھو۔" میں نے اُردُو اور فارسی کا ایک شعر کاغذ پر لکھا اور کچھ انگریزی میں بھی۔

پر انہوں نے اس کاغذ کی کاپیاں نکالیں اور یاد دہانی کے لیے وہ مجھے سونپ دیں۔ ہم جتنی دیر اکٹھے رہتے وہ مجھے مغرب کی ایجادات کی کہانیاں سُناتے رہتے۔

میں چونکہ گاؤں سے گیا تھا کہ اس لیے تھوڑا ضدّی بھی تھا، نالائق اور موٹا بھی تھا اور مجھے کہتے کہ "تم آخر کیوں مغرب کی ترقّی تسلیم نہیں کرتے۔"

میں انہیں کہتا کہ "ایک اتنا عظیم شاعر میرے سامنے زندہ سلامت بیٹھا ہے۔ یہ

میرے ملک نے پیدا کیا ہے۔ میں کیسے مغرب کی بڑائی مان لوں۔ اس طرح میرا اُن سے عقیدت مندانہ جھگڑا چلتا رہتا۔"

میں تقریباً روز ہی اُن کے ساتھ ہی شام کے وقت اُن کے گھر جاتا تھا۔ اُن کے گھر جانے کا میرا مقصد یہ تھا کہ اُن کے گھر اعلیٰ درجے کی کافی ملتی تھی۔

ان کی بیگم جو ہیں وہ اٹالین تھیں۔ ولائتی عورت تھی۔ اس کے باپ اطالوی تھے، ماں آئرش وغیرہ تھی۔ راشد صاحب کی بیگم بہت اچھی اطالوی بولتی تھی۔ اب مجھے بھی اپنی اطالوی زبان اچھی کرنے کا چسکا تھا۔ لٰہذا میں بھی ہر روز شام کو اُن کے گھر جا کر اُن سے ملتا۔ اس نے "کف آگ" (وہاں کی مشہور کافی) کا ایک بڑا سا پیکٹ بنا کر رکھا ہوا تھا کہ اشفاق آئے گا تو اسے بنا کر دوں گی۔

کافی بن جاتی اور ہم سب بیٹھ جاتے تو راشد صاحب کی بیگم اور میری چغلی میٹنگ شروع ہو جاتی۔ راشد صاحب ہمارے پاس بھی ہوتے تھے لیکن ہم اطالوی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ بڑے ہی کمینے بچّوں کی طرح۔

جس طرح بچّے "ف" کی بولی بولتے ہیں۔ اس طرح ہم اطالوی میں باتیں کرتے اور راشد صاحب کو اطالوی نہیں آتی تھی۔ اُن کی بیوی پوچھتی کہ "یہ جو تمہارا

دوست ہے کیا اچھا شاعر ہے؟"

میں کہتا کہ "بس درمیانے درجے کا ہے۔ (مسکراتے ہوئے) ہمارے ہاں چونکہ شاعر کم ہوتے ہیں اس لیے ہم اُن کو بڑا مان دیتے ہیں۔"

ان کی بیوی اطالوی میں مجھ سے پوچھتی کہ "یہ تو کہتے ہیں کہ میں بڑا کمال کا شاعر ہوں۔"

میں جواب دیتا کہ "میں ان کی پوری تفصیلات بتاؤں گا بشرطیکہ آپ مجھے ایک کپ کافی اور پلائیں۔"

میری اور اُن کی بیگم کی گہری دوستی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ جس طرح راشد صاحب مغرب سے مرعوب تھے اسی طرح وہ خاتون مشرق کے خلاف تھی اور اس کے خیال میں مشرق والے بڑے گھامڑ سے لوگ ہوتے ہیں۔ عقل کی انہیں کوئی بات آتی نہیں ہے اور میں ان کو ہلا شیری دیتا کہ آپ جو کچھ سوچتی ہیں بالکل ٹھیک سوچتی ہیں۔ یہ مشرق والے واقعی دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔

راشد صاحب کہتے کہ تم اس سے کیا باتیں کرتے ہو تو میں انہیں کہتا کہ سر یہ

ہماری خفیہ باتیں ہیں۔ ہم آپ کو ساری تو نہیں بتا سکتے لیکن اس میں آپ کی کچھ عزّت افزائی بھی ہے اور اِن باتوں میں کچھ کچھ آپ کے خلاف بھی کیونکہ جب آپ میرے باس تھے تو تین مرتبہ آپ نے مجھ سے بڑی سختی کی تھی۔ وہ اب میرے ذہن کے نہاں خانے میں کہیں نہ کہیں لکھا ہوا تھا تو ہو گا ہی نا۔۔۔۔۔۔۔ وہ میری باتوں سے بڑا مزہ لیتے، بڑے بھلے اور شریف آدمی تھے۔

میں اگر دیر ہو جاتی تو کھانا بھی اُن کے گھر کھاتا۔ دیر ہو جاتی تو وہ مجھے بس سٹاپ پر چھوڑ کر آتے۔ یہ اُن کی مہربانی تھی۔

رات گئے وہاں بسوں میں نوجوان منی سکرٹ پہنے ہوئے لڑکیاں دیکھ کر کہتے ”دیکھو رات کا وقت ہے، کیا ایسا لاء اینڈ آرڈر تمہارے ملک یا کسی مشرقی ممالک میں ہے کہ یہ نوجوان لڑکیاں آزادی سے سفر کر رہی ہیں۔“

اب میں شرمندہ ہو کر کہتا کہ ”جناب اکثر تو ایسا نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی خواتین اکیلی لمبے سفر پر بھی جاتی ہیں۔“

میں اُن سے ادب سے اور ڈرتے ڈرتے کہتا کہ ”سر دیکھیں کہ ہم میں بھی کوئی

خوبی ہے؟"

وہ کہتے کہ "کہاں کی خوبی؟ کون سی خوبی؟"

میں نے کہا کہ "سر دیکھئے ہم مہمان نواز لوگ ہیں۔ ڈی جی خان کا ایک گڈریا بھیڑیں بکریاں چرا رہا ہے۔ اب اس کے پاس آدھی روٹی اور دو کھجوریں ہیں۔ اگر اس کے پاس کوئی مسافر آتا ہے تو وہ اس سے کہے گا کہ روٹی کھا کر جانا۔"

وہ کہتے کہ "نہیں یہ فضول باتیں ہیں۔ کیا تم نے کچھ ایجاد کیا ہے؟"

اس مرعوبیت میں جو دردناک پہلو ہے، وہ یہ ہے کہ اُن کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُن کی بیوی کی سہیلی کا خاوند فوت ہو گیا۔ ہم بھی اُس کے جنازے کے ساتھ گئے۔ وہاں کچھ لوگ مُردوں کو جلاتے ہیں اور کچھ دفن کرتے ہیں۔ وہاں انہوں نے مُردوں کو جلانے کے لیے ایک جدید شمشان گھاٹ بنائی ہے۔

خواتین و حضرات! جہاں پر اس کی سہیلی کے خاوند کو جلانے کے لیے لے جایا گیا وہ ایسی شمشان بھومی نہیں تھی جیسی کہ ہم نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی کہ لکڑیوں کی چتا لگائی، اس میں مُردے کو رکھ کر آگ جلائی اور معاملہ ختم۔

خواتین وحضرات! وہ جدید شمشان گھاٹ ایسی الیکٹرک مشین تھی، بالکل لفٹ کی مانند۔ اس لفٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کے اندر ایک نیگوڑا سا آتا تھا جس میں لاش رکھی جاتی تھی اور اس کے بعد وہ مشین بند ہو جاتی تھی اور وہ نیگوڑا میّت کو لے کر کئی ہزار وولٹ میں لے جاتی تھی جہاں اس لاش کا کچھ نہیں بچتا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر وہ نیگوڑا اس بنے بنائے آدمی کو لے کر واپس آجاتا تھا اور اس میں اس شخص کی جگہ سوائے ایک مٹھی راکھ کے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ جب راشد صاحب کی بیوی کی سہیلی کے خاوند کو لِٹایا گیا تو وہاں انہوں نے آخری سلام پڑھے۔ دروازہ بند ہوا، بٹن دبایا اور وہ شخص جب راکھ میں تبدیل ہو کر واپس آیا تو راشد صاحب نے کہا "کیا کمال کی چیز ہے۔ ایسی مشین تو ہم نے کبھی دیکھی نہ سُنی۔"

میں نے کہا کہ "ہمارے ہاں تو شمشان بھومی میں بدبُو آتی ہے۔ لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔ صبح سے شام تک مُردے کے جلنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ یہ تو فٹافٹ کام تمام ہو گیا۔"

اس لفٹ والوں نے اس شخص کی راکھ کا ایک پیکٹ بنا کر اُس کی سہیلی کے حوالے کر دیا۔ راشد صاحب اس مشین سے بہت متاثر ہوئے اور اس کی بیوی

راشد صاحب سے بار بار پوچھتی کہ کیسی کمال کی مشین ہے اور وہ بھی اثبات میں سر ہلاتے اور کہتے کہ یہ تو ڈسپوزل کرنے کا طریقہ ہی بہت اچھا ہے۔ ظاہر ہے بعد میں بھی راشد صاحب نے اس مشین کی تعریف کی ہو گی۔

خواتین و حضرات ! بد قسمتی یہ ہوئی کہ دردناک بات یہ ہوئی کہ جب راشد صاحب فوت ہوئے اور تب وہ ہمارے تصرف میں نہیں تھے اور اسی ظالم سہیلی کے قبضۂ قدرت میں تھے۔ اس نے سوچا اور کہا کہ چونکہ انہوں نے اس مشین کو پسند کیا تھا اور اس کی بڑی تعریف کرتے تھے اور اس سے بڑے مرعوب تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کی (ن م راشد) یہی خواہش ہو گی کہ اسے بھی اسی مشین کی نذر کر دیا جائے۔ (اس خاتون نے راشد صاحب سے خواہش نہیں پوچھی ہو گی)۔

میں آج تک حیران ہوں اور دکھی ہوں اس خاتون نے راشد صاحب کو اس مشین کے حوالے کر دیا اور ہم یہاں روتے پیٹتے رہ گئے۔ میں راشد صاحب کو بہت قریب سے جانتا ہوں انہوں نے ایسی خواہش اپنے لیے کبھی نہیں کی ہو گی۔

خواتین وحضرات! مرعوبیت کے سلسلے میں ایک حد تک توٹھیک ہے جو چیز قابلِ تعریف ہو، اس کی تعریف کرے لیکن ن م راشد کے ساتھ اُن کی آخری رسومات کے حوالے سے جو سانحہ ہم پر گزرا ہے سارے ادب اور سارے ادیبوں پر قیامت جو ٹوٹی ہے میں اس دکھ کو ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہوں۔ کس سے بیان کروں۔

ٹھیک ہے مغرب نے بڑے کمال کی مشینیں بنائی ہیں لیکن انہیں ہماری معاشرتی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اس بدبخت عورت نے سوچے بغیر اور یہ جان کر کہ چونکہ انہوں نے اُس کی تعریف کی ہے اور پسند کیا ہے انہیں اُس مشین کے حوالے کر دیا۔

میں اس غم اور دکھ میں آپ کو بھی شریک کر رہا ہوں۔ وہ ہمارے بڑے اور محبوب شاعر تھے۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔

آپ بھی مرعوب ہوں لیکن اس قدر نہیں۔ ہم اپنی بھی خوبیاں رکھتے ہیں اور ان پر ٹیک لگا کر سر فخر سے بلند کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ تشریف لائے۔ بہت شکریہ۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے

(آمین) اللہ حافظ۔

اندھا کنواں

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ہم اپنی زندگیوں میں اس قدر مصروف ہو گئے ہیں کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا ہے کہ ہمارے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ اس مصروفیت میں ہم اپنے وجود کے اندر کے گوشوں کو بے نقاب کرنے کی طرف بالکل توجّہ ہی نہیں دیتے حالانکہ اگر ہم اپنے وجود کا اپنا مطالعہ کریں تو ہم پر بہت سے ایسے راز افشا ہوں گے جن کا ہمیں پہلے علم ہی نہیں تھا۔ ہمارے بابے خاص طور پر اپنی ذات کے مطالعے پر بہت زور دیتے ہیں۔ کبھی آپ لاہور آئیں یا اگر رہتے ہیں تو آپ جہانگیر کے مقبرے پر ایک بار ضرور جایئے گا۔ ہم خود وہاں گئے۔ یہ بڑی دیر کی بات ہے۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ وہاں ایک بار پھر جاؤں۔ اگر آپ میرے ساتھ جائیں گے تو میں بھی ضرور وہاں جاؤں گا کیونکہ میرا بڑا جی چاہتا ہے۔

جہانگیر کے مقبرے کا جو بڑا داخلی دروازہ ہے اس میں داخل ہونے سے پہلے اگر

آپ اپنے دائیں ہاتھ دیکھیں تو بڑی دیوار کے ساتھ ساتھ دور کارنر میں ایک پرانے زمانے کا کنواں ہے جو نہایت خوبصورتی سے بنایا گیا ہے اور مغل فنِ تعمیر کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ جب میں لاہور میں اسٹوڈنٹ تھا، یہ بڑے سالوں کی بات ہے، ہمارے ہسٹری کے پروفیسر صاحب ہمیں مقبرہ تاریخ دکھانے لے گئے۔ وہاں داخل ہونے سے پہلے پروفیسر صاحب نے کہا کہ ٹھہرو، یہ کنواں ہے۔ اسے بھی دیکھنا ہے۔ خیر ہم سب کنویں کے قریب گئے اور اسے دیکھا۔ ہم نے اس کنویں کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس میں سے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ مکمل تاریکی تھی کیونکہ وہ ایک پرانا بیابان بے آباد تھا۔

ہم نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ آپ کو ہمیں یہاں کنواں دکھانے خواہ مخواہ ہی لے آئے۔ یہاں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ کہنے لگے کہ واقعی چیز تو اُجاگر نہیں ہو رہی ہے لیکن رکو، ٹھہرو کچھ کرتے ہیں۔

خواتین و حضرات اُن کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ انہوں نے اخبار کو لمبائی میں رول کی شکل میں تہہ کیا اور لائٹر سے اس اخبار کو چھو کر جلایا تو وہ اخبار مشعل بن گیا۔

پروفیسر صاحب نے کنویں کے اندر جب وہ جلتا ہوا اخبار پھینکا اور اخبار ایک

چنڈول کی طرح اپنی تمام روشنی لے کر اور خود قربان ہو کر ہمارے لیے روشنی پیدا کرنے لگا۔ اس چھوٹے سے اخبار کی قربانی اور روشنی سے وہ اندھا اور تاریک کنواں اور اس کے تمام خدوخال پوری طرح سے نظر آنے لگے اور اس کے پورے کے پورے طاقچے کھلنے لگے اور اس کا تمام تر حسن ہم پر عیاں اور نمایاں ہونے لگا اور ہمیں پتہ چلا کہ اس کنویں کے اندر کیا کیا خوبیاں ہیں۔ اس سے ہمیں پتہ چلا کہ جب تک اندر کے اندر ایک شمع روشن نہیں ہو گی اور اندر ایک ایسا جلتا ہوا اخبار نہیں اُترے گا، آپ کو، مجھ کو، ہم کو پتہ نہیں چل سکے گا کہ میری آپ کی Qualifications کیا ہیں۔ اندر کے حقیقی خدوخال کیا ہیں اور بس انسان یا اچھے انسان کہنے سے ہم اچھے والے تو نہیں بن جائیں گے نا!

میرا یہ کہنے کا مطلب ہر گز نہیں ہے کہ آپ اچھے انسان نہیں ہو۔ آپ بہت اچھے ہو، بڑے قابل اور انسانوں سے محبّت کرنے والے ہو لیکن ہر انسان کے وجود میں ایک گوشہ ایسا ہوتا ہے جو تاریک ہوتا ہے۔ اس کا شاید صحیح طرح سے اسے کبھی معلوم نہیں ہوتا ہے۔

انسان میں موجود کچھ صلاحیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں خود باہر نکالنا پڑتا ہے۔ اگر انہیں تصرّف میں نہ لایا جائے تو وہ خزانہ ویسے کا ویسے ہی چھپا رہتا ہے اور اتنی ہی

حفاظت میں رہتا ہے جس طرح ہم بچپن میں اپنی نانی اور دادی امّاؤں سے سُنا
کرتے تھے کہ ایک خزانہ کے اوپر اتنے کالے اور شیش ناگوں کا پہرہ ہوتا ہے
اور ان شیش ناگوں سے وہ خزانہ یا دولت کا انبار حاصل کرنے کے لیے بڑی
تعداد میں گرم تیل کے کڑاہے درکار ہوتے ہیں۔ جو اُن ناگوں کے اوپر پھینکے
جائیں تو اُن سے چھٹکارا حاصل ہو اور وہ خزانہ ہاتھ آئے۔ گو ہم اِن باتوں کو اب
جان چکے ہیں کہ ان پر گرم کڑاہے والا تیل پھینکنے سے اب کام نہیں بنے گا بلکہ
آج کل کے دَور میں کسی بڑے افسر کی سفارش سے خزانے کے بند کھلیں گے۔
(مُسکراتے ہوئے) خواتین و حضرات! ہمارے اندر کا جو مخفی خزانہ ہے، وہ بھی
ہمّت، جرأت اور قربانی کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے اندر کی خوبیاں باہر لانے کے
لیے جہد کریں۔ اپنے وجود کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ کچھ وقت کے لیے دنیا کے
مصائب و الم کو بھول جائیں اور بالکل مثبت انداز میں سوچنا شروع کر دیں تو
ہمارے خزانے باہر آنا شروع ہو جائیں اور ہمیں اپنی جس صلاحیت کا پتہ نہیں
ہے اس کا پتہ چلنے لگے گا۔

ہم نے کبھی تیراکی نہیں کی، کبھی کھلے پانی میں گئے ہی نہیں اور کبھی دل میں یہ
خیال آیا کہ ہم تیراکی کریں۔ لیکن اگر خدانخواستہ اگر ہمیں کوئی گہرے پانی میں

دھکا دے دے تو ہمارے ہاتھ پاؤں خود بخود چلنے شروع ہو جاتے ہیں اور اگر چند لوگوں کو دھکا دے دیا جائے جو فنِّ تیراکی سے نابلد ہوں تو اُن میں سے کئی ضرور تیر کر واپس لوٹ آئیں گے، حالانکہ انہوں نے اس سے پہلے کبھی یہ کام نہیں کیا ہو گا۔

(اب آپ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ تیراک کون ہے کسی کو پانی میں دھکا نہ دے دیجئے گا یہ میں مثال کے طور پر کہہ رہا ہوں)

اس طرح کا ایک واقعہ میں آپ کو سُناتا ہوں کہ نہر، دریا، کسی اور جگہ جہاں پانی کافی گہرائی میں تھا ایک بچّہ پانی میں ڈوب گیا۔ اب وہاں کافی لوگ جمع تھے لیکن کسی کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی کہ اس بچّے کو ابھی زندہ سلامت تھا اسے نکال لے۔

اب یہ اُمّید بھی دم توڑتی جارہی تھی کہ کوئی شخص پانی میں چھلانگ لگا کر اسے نکال لائے گا کہ ایک دم ایک شخص اس گہرے پانی میں کود گیا۔ پہلے تو وہ خود ہاتھ پاؤں مارتا رہا پھر اس کے ہاتھ میں بچّہ آ گیا اور اس نے کمال بہادری اور جوانمردی سے اس معصوم بچّے کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ اس کے اِس بڑے کام سے

ہر طرف تالیاں بجیں، لوگ تعریفیں کرنے لگے اور اس سے پوچھنے لگے کہ اے بہادر نوجوان، ہم سب میں سے کسی کی یہ ہمّت نہیں ہوئی کہ گہرے پانی میں چھلانگ لگا کر اس بچّے کو بچا لیں لیکن تم کتنے عظیم شخص ہو کہ تم نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ تمہارا کارنامہ واقعی قابلِ ستائش ہے۔ یہ بتاؤ کہ جب سب ڈر رہے تھے پانی میں کودنے سے تو تم میں ہمّت کیسے آئی۔

اس نوجوان کا ان سب سے پہلا سوال اور جواب تھا "پہلے مجھے بتاؤ مجھے پانی میں دھکا کس نے دیا تھا۔" (تمام ہال قہقہوں سے گونج اٹھتا ہے) بچّو! یہ بات بہت ضروری ہے کہ اپنے اندر کو کمال قربانی اور جدوجہد سے اُجاگر کیا جائے۔ یہ ہمارے بابا لوگ یہ بتاتے ہیں کہ اندر کے ساتھ انسان کا کیا رشتہ ہونا چاہیے اور کس حد تک طے ہونا چاہیے۔ جب تک اندر کی گراری باہر کی گراری کے ساتھ فِٹ نہیں ہوتی انسان کا وجود بند رہے گا اور رُکا رہے گا۔

آپ جو سوال کیا کرتے ہیں کہ انسانیت کو فلاح کیوں نہیں ملتی۔ تو اصل بات اس میں یہی ہے کہ ہمارے اندر تضاد ہے لیکن ایک بات بھی بڑی اہم ہے کہ انسان ڈگریاں تو حاصل کر لیتا ہے، بڑا امیر اور مشہور آدمی بن جاتا ہے لیکن وہ دوسروں کی فلاح کا سبب نہیں بنتا ہے اور ایسی صورت میں اس کی تمام ڈگریاں نہ

اُس کے کام آ سکتی ہیں اور نہ ہی دوسروں کے۔ وہ روحانی طور پر پسماندہ ہوتا ہے۔ ترقّی یافتہ نہیں ہوتا ہے۔

جب آپ کا اندر اور باہر ایک طرح کا ہو گا تو نہ صرف آپ اپنے وجود اور ذات کے لیے فلاح کا باعث بنیں گے بلکہ دوسروں کے لیے بھی فلاح کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

بچّو! میں آپ پر کوئی زیادہ بوجھ نہیں ڈال رہا ہوں۔ بس سُنی سُنائی باتیں کر رہا ہوں جو مجھ سے میرے بابوں نے کی تھیں۔ جس طرح اینٹوں کو ایک دوسری کا سہارا دے کر اور چنائی کر کے ڈاٹ باندھی جاتی ہے۔ ڈاٹ باندھے جانے کے بعد چاہے اس پر کتنا ہی بوجھ ڈال دیا جائے اسے فرق نہیں پڑتا ہے اور وہ بہت مضبوط تَر ہو جاتی ہے۔

پاکپتن شریف سے امیر دین کوچوان میرے پاس آیا۔ اس کا باپ بیمار تھا۔ اسے تلی کی خرابی کا عارضہ لاحق تھا۔ مجھے کہنے لگا کہ "بھاجی اسے کوئی اعلیٰ درجے کے اور بڑے ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔"

میں نے پروفیسر آف میڈیسن سے درخواست کی اور کہا کہ "جناب یہ ہمارے

بڑے جاننے والے ہیں، ذرا انہیں تسلّی سے چیک کر لیں۔" پروفیسر صاحب نے مریض کو دیکھا لیکن امیر دین کی کچھ تسلّی نہ ہوئی اور مجھے کہنے لگا "بھا جی سب سے بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں۔"

میں نے کہا کہ "امیر دین سب سے بڑا ڈاکٹر یہی ہے۔" لیکن وہ کہنے لگا "نہیں جی یہ نہیں۔"

میں نے کہا کہ "تجھے کیسے معلوم ہے کہ یہ سب سے بڑا ڈاکٹر نہیں ہے۔"

وہ کہنے لگا کہ "سب سے بڑا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جس کی کوٹھی بڑی ہو۔"

امیر دین کوچوان اپنے ابّے کو لے کر واپس چلا گیا کیونکہ اس ڈاکٹر کی کوٹھی چھوٹی تھی حالانکہ وہ ڈاکٹر بڑا تھا۔

یہ ایسی باتیں ہیں جو ہماری روزمرّہ کی زندگی میں آتی رہتی ہیں لیکن ہم اس پر زیادہ توجّہ مرکوز نہیں کرتے ہیں۔ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ وہی چیز یا شے روشنی عطا کرتی ہے اور دوسروں کی فلاح کا کام کرتی ہے جو خود سے قربانی دیتی ہے۔ اپنے اوپر ضبط کرتی ہے اور یہی بات ہم انسانوں پر فِٹ آتی ہے۔ لکڑی جلتی ہے تو کھانا تیار ہوتا ہے یا سردی میں ہمیں حدّت پہنچتی ہے۔ آم کا درخت اپنی

شاخوں پر بڑا آموں کا بوجھ برداشت کرتا ہے تو ہمیں گرمیوں میں کھانے کو آم ملتے ہیں اور اگر ہم انسان قربانی دیتے ہیں تو دوسروں کی فلاح کرتے ہیں، چاہے وہ قربانی کسی مرتے کو بچانے کے لیے ایک بوتل خون کی ہو یا کسی کو تسلّی دینے کی۔ اپنا تھوڑا وقت لوگوں کے نام کرنا ہو یا کسی اور انداز میں۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بڑی مادہ پرست ہو گئی ہے۔

جب ہم بچّے تھے تو جب دُکان سے کوئی چیز لینے جاتے تھے تو دکاندار ہمیں خوش کرنے کے لیے ''جھونگا'' (کھانے کی کوئی تھوڑی سی چیز) دیا کرتے تھے اور بچّے بھاگ بھاگ کر دکانوں سے گھر کے لیے سودا لینے کے لیے جاتے تھے۔ اب بھی شاید دکاندار دیتے ہوں لیکن میرا خیال ہے صورتحال کافی بدل چکی ہے۔ ہمارے گاؤں میں جب جیمل سنگھ اماں تیلن سے دو آنے کی تیل کی کُپّی لینے جاتا تو امّاں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی، پیار کرتی اور بٹھا دیتی۔ ماں کا حال پوچھتی اور کہتی ''پتر روٹی کھائیں گا۔''

وہ کہتا کہ ''نہیں امّاں بس تیل دے دیں۔''

اس کے انکار کے باوجود امّاں تیلن اسے تیل دینے سے پہلے ایک پھلکا روٹی

کھلاتی۔ اس پر مکھن کا پیڑا رکھتی، اسے پہلے کھلاتی پھر دو آنے کا تیل دیتی حالانکہ وہ جیمل سنگھ کو روٹی اور مکھن جو پیڑا کھلاتی وہ شاید تین آنے کا بنا ہو لیکن اُن وقتوں میں شاید ایسی باتیں نہیں سوچی جاتی تھیں اور محبّتوں میں حساب کتاب نہیں کیے جاتے تھے اور لوگ اعداد و شمار سے زیادہ محبّت پر یقین رکھتے تھے۔ پیسے سے زیادہ انسان پر زیادہ توجّہ دی جاتی تھی۔

خواتین و حضرات! میں نے آج آپ پر کچھ زیادہ ہی بوجھ ڈال دیا لیکن یہ مجھ پر کافی بوجھ تھا جو میں نے آپ پر ڈال کر کچھ کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں اس اُمّید، تمنّا اور دُعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ آپ اپنی ذات کو ٹٹولیں گے اور اپنے اندر کے اندھے کنویں کو اپنی ہمّت، عزم اور دوسروں سے محبّت اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے جذبے کے ساتھ اس آگ لگی اخبار کے لپکے کی طرح روشن کرنے کی کوشش کریں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

خدا سے زیادہ جراثیموں کا خوف

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

صبح کا وقت بڑا سہانا ہوتا ہے۔ صبح کا وہ وقت جب پو پھوٹ رہی ہوتی ہے۔ چڑیاں چہچہا رہی ہوتی ہیں، لیکن ایک وہ ہی وقت ہوتا ہے جب سورج کی روشنی اپنی پوری لمبائی کے ساتھ زمین کو چھونے لگتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ہماری یاد میں بھولے بسرے واقعات بڑی وضاحت اور شدّ و مد کے ساتھ اُبھرنے لگتے ہیں۔ باوجود بڑی کوشش کے میں یہ آج تک نہ جان سکا ہوں کہ ان لمبی لمبی شعاعوں اور کِرنوں کا زمین پر ایسا اثر کیوں ہوتا ہے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی معاف کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ آج کل ہمارے ہاں ویسے معاف کرنے پر کم ہی توجّہ دی جاتی ہے اور معافی کے عمل کو بجائے اپنی بڑائی یا اعلیٰ ظرفی کے، کمزوری سمجھا جانے لگا ہے اور بد قسمتی سے یہ رجحان ابھی کچھ سالوں میں زیادہ ہو گیا ہے۔ پہلے شاید اتنا نہیں تھا، وجود تو ہو گا،

اس سے تو انکار نہیں لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بہت کم ہو گا۔

جب ہم بچپن میں تھے تو اپنے دیگر ساتھیوں سے لڑائی بھی ہوتی تھی، ناراضگی بھی، لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم میں سے بھی کسی کو بھی اگلے دن کسی کو منانے کی ضرورت پیش آتی ہو یا کوئی گلہِ دل میں رہ گیا ہو۔ ویسے ہی ہنستے، کھیلتے، لڑتے، جھگڑتے دن گزر جاتا تھا لیکن اب ہم نے اپنا الگ ہی طرزِ فکر اختیار کر لیا ہے۔ ہم نے مختلف لوگوں کے بارے میں مختلف رائے قائم کر لی ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے سوچ رکھا ہے کہ اب میں نے درّانی صاحب کی فلاں بات کا جواب فلاں طریقے سے دینا ہے۔ اگر چپڑاسی کرموں نے چھٹّی مانگی تو نہیں دینی کیونکہ وہ بہانے سے چھٹّی کرتا ہے۔ کوئی ضرورت مند یا سائل ہمارے تک آئے گا تو ہم نے بڑی بے رُخی سے بات کرنی ہے کیونکہ اگر مُسکرا کر بات کریں تو یہ لوگ ناحق فری ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کی کئی باتیں ہوتی ہیں جو ہم خود ہی خود میں طے کر لیتے ہیں حالانکہ ہم اِس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ جن لوگوں کے بارے میں ہم سخت رویّے پر مبنی رائے قائم کر رہے ہیں، وہ ہو سکتا ہے ہمارے لیے بڑی اچھی رائے رکھتے ہوں۔ جس چپڑاسی کرموں کو ہم چھٹّی نہ دینے اور جھڑکیاں دینے کا فیصلہ صادر کر چکے ہیں وہ اس بار چھٹّی کے لیے بہانے بازی

سے کام نہ لے رہا ہو اور اسے واقعی ہی کوئی مسئلہ یا مشکل درپیش ہو۔

ہم نے شاید کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا کہ ہمارے چہروں سے ہنسی، مُسکراہٹ کیوں ناپید ہو رہی ہے۔ بات نہیں ہے کہ ہم اچھے ہونا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ خواہش ضرور موجود ہے کہ ہم اچھے ہیں لیکن ایک عجب خوف ہمیں اس بات سے دُور کرتا رہتا ہے۔

خواتین و حضرات! میرے ماموں میرے والد صاحب سے بالکل اُلٹ تھے۔ میرے والد میرے ماموں کی نسبت بہت ہی محتاط، زیرک اور ہر کام کو پرکھ کر کرنے والے تھے جبکہ ماموں بہت کچھ اعتبار اور اعتماد پر چھوڑ دیتے تھے۔ اس کا مطلب نہیں کہ ماموں بہت سیدھے سادے یا خدانخواستہ احمق تھے۔ ایسی بات بالکل نہیں تھی۔ ماموں کا اپنا ایک فلسفہ تھا۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ ”تم لوگوں کو اپنے سے اچھا صلہ لے لینے دو، انہیں تمہیں ٹھگ لینے دو۔ اگر تم ان سے جھگڑا نہیں کرو گے، مباحثہ نہیں کرو گے، وہ صلح جو ہو جائیں گے۔ ہتھیار پھینک دیں گے۔ اچھے اور شریف ہو جائیں گے اور یقین کرنا بیٹا انسان اچھا اور شریف ہونا چاہتا ہے لیکن اس کو موقع نہیں ملتا۔ کم از کم انہیں اچھا ہونے کا

موقع ضرور فراہم کرنا۔"

اس وقت تو میں ماموں کی اس بات کو اس طریقے سے نہیں سمجھ پاتا تھا لیکن میں اب Feel کرتا ہوں کہ میں ان باتوں کو کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں کہ ایسا کرنا کیوں ضروری ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جو خرابی ہم میں موجود ہوتی ہے، ہم خیال کرتے ہیں کہ یہ خرابی ضرور دوسروں میں بھی ہو گی۔ میں آپ کو ایک دلچسپ بات سُناتا ہوں (آپ کسی اور کو نہ بتایئے گا، مُسکراتے ہوئے) میں جب بجلی، ٹیلیفون یا کوئی اور بل وغیرہ جمع کرانے کے لیے بینک کی اس کھڑکی پر کھڑا ہوتا ہوں جہاں لوگ صبح سویرے آن کر ہی کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ وہ بل جمع کروا کر اپنے اپنے کاموں کی طرف جا سکیں۔

خواتین وحضرات! میں اِن لائنوں میں کھڑے بزرگوں نوجوانوں اور خواتین کو دیکھتا ہوں تو مجھے ناگوار گزرتا ہے، گو مجھے زیادہ اس لیے بُرا لگتا ہے کہ میں کبھی ایسے ہی لوگوں کی صف میں کھڑا ہوتا ہوں۔ بل جمع کرانے والوں کی صورتِ حال دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ لوگ پیسے جمع کرانے نہیں آئے بلکہ انہیں یہاں سے مفت میں پیسے مِل رہے ہیں یا کوئی کچھ مفت میں بانٹ رہا ہے۔ اس صورتحال میں اِن لائن میں کھڑے میرے جیسوں کو سب سے زیادہ کوفت اس

وقت ہوتی ہے جب کوئی صاحب بینک کے بڑے دروازے میں سے آ کر بل جمع کرنے والے کیشیئر کو تھما کر چلا جاتا ہے۔

بات کدھر سے کدھر نکل گئی۔ میں جب بینک کی کھڑکی پر کھڑا بل جمع کروا رہا ہوتا ہوں تو کئی بار میرے ذہن میں خیال آتا ہے کہ میں نے اپنے یوٹیلٹی بِلز کے جو پیسے کیشیئر کو تھما دیئے ہیں یہ ہی نہ ہو کہ وہ پیسے لے کر یہ کہے کہ آپ نے تو مجھے پیسے دیئے ہی نہیں۔ اب میرے پاس اسے پیسے دینے کی کوئی رسید بھی نہیں اور میں کیسے کسی اور کو یقین دِلاؤں گا کہ میں نے واقعی کیشیئر کو پیسے دے دیئے ہیں۔ لیکن وہ کیشیئر بڑا ہی ایماندار ہوتا ہے اس نے میرے گہرے خدشات کے باوجود آج تک مجھے نہیں کہا کہ میں نے اسے پیسے ادا نہیں کیے اور وہ نہایت شریف النفس اور دیانتدار کیشیئر میرے بِلوں پر ٹھکا ٹھک مُہریں لگا کر اور دستخط کر کے بل آدھے پھاڑ کر میرے حوالے کر دیتا ہے۔ ہمارے انگریزی کے اُستاد میں کہا کرتے تھے کہ تم اپنے اندر اپنے بچپن کو کبھی نہ مرنے دینا۔ اس طرح تم بوڑھے نہیں ہو گے۔ اگر تم اپنے بچپن کو اپنے اندر سنبھال کر نہ رکھ سکے تو پھر تمہیں بوڑھے ہونے سے کوئی روک نہیں پائے گا۔ شاید ضرورت ہے کہ ہم سب اپنے اندر بچپن کی وہ خوبیاں اُجاگر کریں جو نفرت،

حسد اور اس جیسی برائیوں سے پاک ہوتی ہیں۔ محبّت بچپن کا خاصا ہے۔ معصوم شرارتیں اور بونگیاں ذہنی تندرستی کے لیے بہت ضروری ہے اور ماہرینِ نفسیات اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ کچھ وقت کے لیے خود پر اس کی کیفیت وارد کرنا بہت ضروری ہے جس میں ہم اپنے تعارف سے ہٹ کر اور اپنے عہدے ایک طرف رکھتے ہوئے چند منٹوں کے لیے بچّے بن جائیں۔ ویسے ہی کمرے میں بھاگیں جیسے بچّے گلی میں مُنہ سے اور موٹر سائیکل یا گاڑی کی آواز نکال کر بھاگتے ہیں۔ یا ہم شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر عجیب و غریب شکلیں بنائیں۔ (یہ کام کرتے وقت دروازہ کی کنڈی ضرور چیک کر لیجئے کا کہیں کوئی اور ہی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے)۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ زندگی میں جس طرح باقی معمولات ضروری ہیں، اسی طرح فلاح اور کسی دوسرے کو تکلیف پہنچائے بغیر شرارتوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ خوش و خرم زندگی کا راز ہے۔

سڑک پر گاڑیوں کی سپیڈ چیک کرنے کے لیے اکثر تار بچھی ہوئی ہوتی ہے۔ جب کار اس تار پر سے گزرتی ہے تو دور بیٹھے ٹریفک والوں کے پاس گاڑی کی سپیڈ ریکارڈ ہو جاتی ہے۔ فیروز پور روڈ پر نہر کے پُل سے ذرا پہلے ایسی ہی تار بچھی تھی۔ ایک روز میں نہر پر جا رہا تھا اور میرے آگے ایک فوکسی جا رہی تھی۔ اس کار کے

جیسے ہی اگلے پہیّے اس تار پر سے گزرے تو زور کی بریک لگی اور گاڑی رُک گیا۔ پھر اس گاڑی میں سے دو صحتمند نوجوان نکلے۔ انہوں نے فوکسی کے پچھلے دونوں پہیّے اُٹھا کر اس تار سے لگائے بغیر گزارے اور آگے رکھ دیئے اور وہ اس کار پر سوار ہو کر چل دیئے۔ اب میں دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ ایسی کیا بات ہے کہ ان لوگوں نے اتنی تکلیف کر کے یہ کام کیا۔

جب میں قرطبہ چوک پہنچا تو وہاں بڑا رش تھا اور ٹریفک جام تھی۔ جب میری گاڑی اُن نوجوانوں کی گاڑی کے مقابل آ گئی تو میں نے شیشہ نیچے کر کے اُن سے فوکسی کے اس طرح گزارنے کی وجہ پوچھی۔

اس پر وہ نوجوان پہلے مُسکرائے اور پھر بتایا کہ بس جی یہ ایسے ہی ایک تفریحی کھیل ہے۔ ہم اکثر یونہی کرتے ہیں۔ اس طرح ٹریفک والوں کے پاس گاڑی کے اگلے پہیّے گزرنے کا حساب تو ریکارڈ ہو گیا ہوتا ہے اور انہیں گاڑی کے پچھلے پہیّے گزرنے کا انتظار ہوتا ہے اور اب تک وہ انتظار کر رہے ہوں گے کہ پچھلے پہیّے کب گزریں گے اور اُن میں سے کچھ سارجنٹ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ شاید ولایت والوں نے کوئی گاڑی ایسی بھی بنائی ہے جس کے پہیّے ابھی آنے ہیں۔

یہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن میں ایک دم سے دکھ والم کی زندگی سے باہر نکال دیتی ہیں۔

ایک روز ہم ڈیرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے بابا جی سے پوچھا کہ جناب دنیا اتنی خراب کیوں ہو گئی ہے۔ اس قدر مادہ پرست کیونکر ہو گئی ہے۔

بابا جی نے جواب دیا "دنیا بہت اچھی ہے۔ جب ہم اس پر تنگ نظری سے نظر ڈالتے ہیں تو یہ ہمیں تنگ نظر دکھائی دیتی ہے۔ جب ہم اس پر کمینگی کی نظر دوڑاتے ہیں تو یہ ہمیں کمینی نظر آنے لگتی ہے۔ جب اسے خُود غرضی سے دیکھتے ہیں تو خود غرض ہو جاتی ہے لیکن جب اس پر کھلے دل، روشن آنکھ اور محبّت بھری نظر سے نگاہ دوڑاتے ہیں تو پھر اسی دنیا میں کیسے پیارے پیارے لوگ نظر آنے لگتے ہیں۔"

خواتین و حضرات! نیکی اور بدی دونوں کا وجود لازم و ملزوم ہے۔ اگر دنیا سے بدی بالکل اُٹھ جائے تو پھر نیکی کو نیکی کون کہے گا اور اگر نیکی اُٹھ جائے تو پھر بُرے کو بُرا کون کہے گا۔ ایک کا وجود دوسرے کے وجود کی اہمیت سے ہمیں آشنا کرتا ہے۔ اب اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ نیکی کے ساتھ بدی کا ہونا بھی

ضروری ہے۔

خواتین وحضرات! زندگی اتنی مشکل بھی نہیں ہے جتنی مشکل ہم نے سمجھ رکھی ہے۔ ایک زمانے میں مَیں لال صابن سے نہاتا تھا۔ میرے بالوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ میں کھانا کھاتا تھا تو مجھے ہاتھ ڈیٹول سے نہیں دھونے پڑتے تھے۔ تو شاید ایک خطرناک جراثیم بھی کم تھے لیکن اب شاید جراثیموں کی بہتات ہوئی ہے یا پھر ہم سوچتے ہی اس طرز پر ہیں میں آج تک اس راز کو نہیں سمجھ پایا ہوں کہ ایک خرادیہ یا موٹر میکینک جو سارا دن کام کرتا ہے وہ جب کھانا کھانے لگتا ہے تو وہ ڈیٹول استعمال نہیں کرتا، کسی مہنگے صابن سے ہاتھ نہیں دھوتا، کسی نئے تولیے کو استعمال نہیں کرتا، اس عام پانی سے ہاتھ گیلے کرکے کسی عام سے کپڑے سے خشک کرتا ہے اور کھانا کھانے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بیمار نہیں ہوتا لیکن ہم جو بڑی احتیاط کرتے ہیں، پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، جلدی بیمار ہو جاتے ہیں۔ جب ہم چھوٹے تھے تو اس وقت ہم اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے اچانک روٹی کا لقمہ میری ماں کے ہاتھ سے زمین پر گِر گیا۔ جونہی وہ لقمہ ماں کے ہاتھ سے گرا انہوں نے بسم اللہ کہہ کر وہ لقمہ زمین سے اُٹھایا۔ اس پر پھونک ماری اور اسے کھالیا۔ اس پر میری بڑی بہن نے شور مچادیا کہ امّاں اس طرح سے

آپ کو یہ روٹی کا ٹکڑا نہیں کھانا چاہیے تھا۔ یہ جراثیموں سے آلودہ ہو چکا تھا۔ لیکن میری ماں کچھ نہ بولی اور اس نے اطمینان سے وہ ٹکڑا نگل لیا۔ میں اب سوچتا ہوں کہ میری ماں جراثیموں سے زیادہ خدا سے ڈرتی تھی۔ وہ خدا کی دی نعمت کی قدر کرتی تھی اور شاید ہم خدا سے زیادہ جراثیموں سے ڈرتے ہیں۔ میں ایک بار اپنی گاڑی کا کام کروا رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا تو ورکشاپ میں وہ کاریگر وغیرہ روٹی کھانے گئے۔ انہوں نے مجھے بھی دعوت دی لیکن میں نے شکریہ کہہ کر معذرت کرلی۔

خواتین وحضرات! گاڑی کا وہ میکینک کام کرتے کرتے اُٹھا، اس نے پنکچر چیک کرنے والے ٹب سے ہاتھ گیلے کئے اور ویسے ہی جا کر کھانا کھانا شروع کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اللہ کے بندے اس طرح گندے ہاتھوں سے کھانا کھاؤ گے تو بیمار پڑ جاؤ گے۔ ہزاروں جراثیم تمہارے پیٹ میں چلے جائیں گے۔ کیا تم نے اس طرح کی باتیں کبھی ڈیٹول یا صابن کے اشتہار میں نہیں دیکھیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ "صاحب جب ہم ہاتھوں پر پہلا کلمہ پڑھ کر پانی ڈالتے ہیں تو سارے جراثیم خود بخود مَر جاتے ہیں اور جب بسم اللہ پڑھ کر روٹی کا لقمہ توڑتے ہیں تو جراثیموں کی جگہ ہمارے پیٹ میں برکت اور صحت داخل ہو جاتی ہے۔

مجھے اس میکینک کی بات نے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ اس کا توکّل تھا جو اسے بیمار نہیں ہونے دیتا تھا۔ میں اس سے اب بھی ملتا ہوں۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی وہ مجھ سے زیادہ صحت مند ہے۔ آپ لوگوں کی بڑی مہربانی کہ آپ نے اتنی دیر سُنا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے۔ آپ کو بچپن، نرم خوئی اور توکّل کی دولت اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

ضمیر کا سگنل

ہم سب کی طرف سے اہلِ زاویہ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

زندگی ہمواریوں اور ناہمواریوں سے وابستہ ہے۔ نشیب و فراز اس جیتی جاگتی زندگی کا خاصا ہے۔ ہر شخص کو اپنی زندگی میں ایسے حالات و واقعات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ کوئی شخص آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہے کہ اس کی زندگی ایک ہی سمت ڈائریکشن یا لَے میں جا رہی ہے۔ زندگی کے سچ، جھوٹ، اچھائی، برائی، اونچ نیچ سے وابستہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ہی شخص سچا بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جھوٹ بھی بولتا ہے۔ شریف اور پرہیز گار بھی ہے اور بددیانت بھی، ایسا نہیں ہو سکتا۔ جو سچا ہے تو وہ سچ ہی بولے گا لیکن اس حوالے سے اہم بات یہ بھی ہے کہ جو جھوٹا ہے وہ سچ بھی بول سکتا ہے۔ ہمارے بابے جن کا ذکر میں عام طور پر کرتا رہتا ہوں اور وہ ہماری گفتگو میں کہیں نہ کہیں سے درمیان میں آن کھڑے ہوتے ہیں وہ کہا کرتے ہیں کہ کسی کافر سے اس کے

کافر ہونے کی وجہ سے نفرت نہ کرو بلکہ اگر آپ کا مزاج اس کے قریب جانے کو نہیں کرتا تو اس کے کفر کے باعث ایسا کرو۔ ہمدردی اور محبّت کا حقدار انسان ہوتا ہی ہے۔ ایک کافر کل کو مومنِ کامل اور خدا کا قرب حاصل کر سکتا ہے اور یہ نہ ہو کہ آپ اس کے کافر ہونے پر اس سے نفرت کرتے رہو۔

یہ ایسی باتیں ہیں جو کسی وقت میری سمجھ میں بھی نہیں آتی تھیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اب کچھ کچھ میں انہیں سمجھنے لگا ہوں۔ کلی طور پر شاید نہیں۔

خواتین و حضرات! آپ کو زندگی میں ہر طرح کے انسانوں سے واسطہ پڑے گا۔ کچھ ایسے بھی ہوں گے جو کسی طور الگ مزاج کے ہوں گے۔ کچھ غصیلی طبیعت کے اور کچھ نہایت نرم خو۔

میں نرم خوئی کا حکم ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کے فعل پر ہمیں بہت غصّہ آ رہا ہوتا ہے لیکن آپ اس کے باوجود کہ اس پر غصّہ کیا جانا چاہیے، آپ غصّہ نہیں کرتے ہیں۔ یہ ان کا کمالِ فن ہوتا ہے یا پھر وہ نان ڈگری ماہرِ نفسیات ہوتے ہیں۔ ایک بار ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ میں

ایک ضروری میٹنگ کے سلسلے میں مری گیا۔ وہ بارشوں کا موسم تھا۔ اب میں جلدی میں تھا اور میں نے دو جوڑے ہی کپڑوں کے ساتھ لیے تھے۔ راستے میں موسلا دھار بارش ہوئی اور خوب برسی۔ اس شدید بارش میں مَیں باوجود بچنے کے شدید طور پر بھیگ گیا۔ میں شام کو مری پہنچا۔ میں خود بھیگ چکا تھا جبکہ دوسرا جوڑا میرے پاس تھا۔ پانی اس میں بھی گھس گیا۔ اب میں سخت پریشان۔ اگلے روز میٹنگ بھی اٹینڈ کرنا تھی۔ خیر میں مال روڈ پر گیا کہ کہیں سے کوئی لانڈری وغیرہ مل جائے تاکہ وہ کپڑے سکھا کر استری کر دے۔ مجھے مال پر تو کوئی لانڈری نہ ملی البتہ لوئر بازار میں چھوٹی سی ایک دُکان نظر آئی جس پر لکھا تھا ”کپڑے چوبیس گھنٹے میں تیار ملتے ہیں۔“ میں یہ پڑھ کر بہت خوش ہوا اور جا کر کپڑے کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ دُکان کے مالک باباجی نے کپڑوں کو غور سے دیکھا پھر بولے ”ٹھیک ہے، پرسوں شام کو لے جانا۔ جمعرات کی شام مغرب سے پہلے۔“

میں نے ان سے کہا کہ ”حضور آپ نے تو چوبیس گھنٹے میں تیار کرنے کا بورڈ لگایا ہوا ہے؟“

وہ باباجی (ذرا بڑی عُمر کے تھے) مُسکرا کر بولے ”ٹھیک ہے بیٹا چوبیس گھنٹوں میں ہی تیار کر کے دیتے ہیں لیکن ہم روزانہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرتے ہیں۔ آٹھ

گھنٹے آج، آٹھ گھنٹے کل اور آٹھ پرسوں۔ یہ کل چوبیس گھنٹے بنتے ہیں۔ آپ کے کپڑے پرسوں شام چوبیسواں گھنٹہ ختم ہونے سے پہلے مل جائیں گے۔"

اب میں حیران و پشیمان کھڑا بابا جی کا مُنہ دیکھ رہا ہوں کہ انہوں نے کس طرح سے چوبیس گھنٹے پورے کر دیئے اور میرے پاس کوئی جواب بھی نہ تھا۔

غصّہ آنا ایک فطری عمل ہے اور ہم یوٹیلٹی بِلز اور دیگر مسائل کے باعث دبے ہوئے اور پسے ہوئے ہیں، ہمیں تو شاید غصّہ آتا بھی بہت ہے۔ ہم شدید غصّے کی حالت میں اپنے ہی آپ جج بھی بن جاتے ہیں، ملزم بھی اور گواہ بھی۔ سارے اختیارات اپنے ذمّے لے کر خود کو مسئلے میں ڈال لیتے ہیں حالانکہ چاہیے تو یہ کہ ہم ایسی صورتحال سے جب دوچار ہوں تو خود کو ڈھیلا چھوڑ دیں اور اپنے خول میں ہی رہیں۔ اپنے خول سے باہر نہ نکلیں کیونکہ جب انسان اپنے خول سے باہر نکل آتا ہے تو وہ بے لباس اور برہنہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے اکثر مسائل ہمارے اپنے ہی پیدا کردہ ہیں۔ ہم کسی بات سے کیا واقعہ سے اپنے تئیں فیصلہ کر لیتے ہیں اور حتمی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ ایک مولانا اپنی بڑی اور خوبصورت گاڑی میں لبرٹی

مارکیٹ کے باہر غلط ہاتھ جا رہے تھے۔ اسی دوران ان کی نئی خوبصورت ٹیوٹا کرولا کے پاس سے پولیس کی نیلی جیپ گزری اور وہ آناً فاناً مولانا کی گاڑی سے ٹکرا گئی اور ٹکر مار کر آگے نکل گئی۔ مولانا نے اپنی گاڑی روکی، اس کا بغور معائنہ کیا۔ ان کی کار کے پچھلے مڈ گارڈ میں چِب پڑ گیا تھا۔ اب وہ مولانا غصّے میں سیخ پا ہو گئے اور مُنہ ہی مُنہ میں شدید طور پر کچھ بڑبڑانے لگے۔ یہ واقعہ وہاں ایک گنڈیری فروش دیکھ رہا تھا۔ اس نے اُونچی آواز میں مولانا کو مخاطب کیا اور کہا ”مولانا صاحب بس یہی مقام ہے جہاں دین اور دنیا آپس میں ملتے ہیں۔“

جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے عرض کیا کہ زندگی ایک ہی دھارے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رواں دواں نہیں رہتی۔ بتدریج پہلو بدلتی رہتی ہے۔ اس طرح سے ہمارے انداز، زاویے، سٹائل اور طرزِ عمل اور بودوباش کے رنگوں میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ زندگی ٹھہرتی نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی راستے اور منزل کی جانب گامزن رہتی ہے۔ یہ حرکت اور Movement ہی ہے جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔ اگر جمود یا ٹھہراؤ آ جائے تو وہ زندگی قرار نہیں دی جا سکتی ہے لیکن ایک بات جو آپ نے بھی نوٹ کی ہو گی اور شاید میں نے بھی کہ ہم اپنے طریقۂ بودوباش میں آئے روز تبدیلیاں کرتے ہیں لیکن آخرکار کچھ دہائیوں، صدیوں

بعد اپنے پرانے طریقہ کار کی جانب بھی لوٹ آتے ہیں۔ میں نے گزشتہ چند دنوں سے اس بارے بہت غور کیا کہ آخر یہ کیوں ہے؟ کسی دور میں کوٹ کے کالر اور آستین بڑے بڑے ہوتے تھے۔ لوگ فور بٹن کوٹ پسند کرتے تھے۔ کسی زمانے میں لوگوں میں کھیڑیاں زیادہ پہنے جانے کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ کبھی لوگ لمبے بال رکھنے لگتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ ان سب اعمال کے برعکس زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر چند سالوں یا دہائیوں کے بعد پھر سے پرانے سٹائل کو اختیار کر لیتے ہیں لیکن ایک چیز نہیں بدلی، لوگ جس زمانے میں بھی چاہے جتنے مرضی "ممی" "ڈیڈی" ہو جائیں وہ دیسی آٹے کی روٹی اور مکھن کو پسند کرتے ہیں۔ گاؤں کے پُر فضا ماحول کو شہر کی نسبت بہتر خیال کرتے ہیں۔ اگر کسی کو دیسی گھی چاہیے ہوتا ہے تو وہ گاؤں سے منگوانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سچ کی اہمیت بھی وہی ہے اور جھوٹ سے نفرت بھی وہی ہے۔ دیانتداری کو اب بھی بڑا سرمایہ خیال کیا جاتا ہے۔ (گو ہم آج کل دیانتدار کو بے وقوف سمجھتے ہیں کسی حد تک) اور اکثر لوگ اچھائی کو اب بھی اچھائی سمجھتے ہیں۔ یہ خیالات نہیں بدلے۔

میرے ایک دوست جو ماہرِ نفسیات ہیں اور میں ان کی بڑی قدر کرتا ہوں، ان کا

نام ڈاکٹر اجمل صاحب ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ چھانگا مانگا کے ایک لکڑہارے نے انار کلی سے گزرتے ہوئے اپنے دوست سے کہا کہ اِن دکانوں کے درمیان اور نالی سے ذرا اوپر ایک جھینگر کی آواز آرہی ہے۔ اب اس کے ساتھ اس کا ایک شہری دوست تھا جس کی بھی ہماری طرح گاڑیوں اور دیگر شور سُن کر سُن سکنے کی صلاحیت وہ نہیں رہی تھی جو ایک تندرست انسان میں ہوتی ہے۔ لکڑہارے کی بات سُن کر اس شہری نے جل کر کہا کہ اس ہنگامے اور شور وغل میں کیسے ممکن ہے کہ کوئی چلتے ہوئے ایک جھینگر کی آواز سُن سکے۔

(اس نے ضرور اسے دیہاتی ہونے کا طعنہ بھی دیا ہو گا اور کوسا ہو گا کہ تم لوگ پتہ نہیں کہاں سے اُٹھ کر آ جاتے ہو، تمہیں کیا پتہ شہر کیسے ہوتے ہیں اور تمہارے اب کان بھی بجنا شروع ہو گئے ہیں)۔

لکڑہارے نے کہا کہ مجھے یہ آواز آتی ہے اور میں تجربہ کر کے تمہیں مشاہدہ کرا سکتا ہوں کہ آواز واقعی آرہی ہے۔

اس نے اپنی جیب سے ایک روپے کا سکہ نکالا اور اسے ہاتھ ذرا اُونچا کر کے سڑک پر اچھال دیا۔

خواتین و حضرات! اس نے جیسے ہی وہ سکہ سڑک پر پھینکا سو گز اِدھر اور سو گز اُدھر کے راہگیروں نے چلتے چلتے پیچھے مُڑ کر اور آگے ہو کر اسے دیکھا۔ اس سکے کی آواز پر ایک لڑکا تو بوٹوں کی دُکان کے اندر سے باہر نکل کر گردن گھما کر دونوں جانب دیکھنے لگا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے وجود کو اندر اور باہر سے اس قدر پکا، کرخت کر لیا ہے کہ ہم کوئی ایسی آواز سُننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے مزاجوں میں اتنی سختی پیدا کر لی ہے اور اپنے تیئں ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی طبیعت اور کیفیت کا اپنے اُوپر وار کر لینا ٹھیک ہے۔ ہم مُسکرانے یا ہنسنے کے لیے اپنے ہونٹوں کو ذرا سی جنبش دینے کو بھی بار خیال کرنے لگے ہیں تو پھر ہمیں اتنے شور اور یوٹیلٹی بِلز کے بوجھ میں کسی جھینگر یا ترنّم کی آواز کیسے آئے گی۔ جب ہم اپنے دل کی آواز جو ہمارے جسم سے آ رہی ہوتی ہے اسے نہیں سُن سکتے۔

خواتین و حضرات! آپ بھی شام کو جب اکیلے لیٹے ہوئے ہوں تو ایک پہلو لیٹ کر ایک کان تکئے سے لگا کر اور دوسرے کان پر بازو رکھ کر دیکھئے گا آپ کو اپنے دل کے دھڑکنے کی واضح آواز آئے گی۔ آپ دیر تک اس کا مشاہدہ ضرور کیجئے گا۔ اس آواز میں کئی باتیں پوشیدہ ہیں، کئی سبق اور اسرار موجود ہیں جن پر غور

کرنے کی ضرورت ہے۔ قدرت نے انسان کو ایک ایسی بڑی نعمت سے نوازا ہے جسے ہم ضمیر کہتے ہیں۔ جب بھی ہم سے کوئی اچھائی یا برائی سرزد ہو تو یہ اپنے خصوصی سگنل جاری کرتا ہے۔ ان سِگنلز میں کبھی شرمندگی کا احساس نمایاں ہوتا ہے تو کبھی ضمیر سے آپ کو Very Good کی آواز آتی ہے۔ آپ کی یتیم کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہیں یا کسی نابینا کو اپنا ضروری کام چھوڑ کر سڑک پار کرواتے ہیں تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے ضمیر نے آپ کو شاباش دی ہے۔ پیار سے تھپکی دی ہے۔ انسان خود میں عجیب طرح کی ایک تازگی اور انرجی محسوس کرتا ہے۔ جب ہم اپنے کسی نوکر کو جھڑکیاں دیتے ہیں، کسی فقیر کو کوستے ہیں یا کوئی بھی ایسا عمل کرتے ہیں جس کی ہمیں ممانعت کی گئی ہے تو یہ ضمیر تنگی محسوس کرتا ہے۔ ایک ایسا سگنل بھیجتا ہے جس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ کام کچھ درست نہیں ہوا۔

خواتین و حضرات کسی کو خوش کرنے میں یا آرام دینے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنے ضمیر کو سکون کی طرف مائل کرتے ہیں اور کسی کو خوش کرنے کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس پر کچھ خرچ بھی نہیں اٹھتا ہے اور اس مہنگائی کے دور میں بھی اس کا وہی پرانا ریٹ چل رہا ہے۔

آپ میرے لیے بھی دُعا کیجیے گا کہ میں بھی اس پرانے ریٹ سے فائدہ اٹھا سکوں اور اس مشکل دَور میں کسی کے لیے آسانی کا سبب بن سکوں۔ گو باوجود کوشش کے میں ایسا کر تو نہیں سکا ہوں اور اس لکڑہارے کی طرح انار کلی کے بھرے بازار میں اس جھینگر کی آواز سُن سکوں جو کم کم لوگ ہی سُن پاتے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

آمین اللہ حافظ۔

سائنس مذہب اور نفس کی کھوج

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

مذہب مسئلوں کو نہیں جانتا اور نہ ہی اس کے جوابوں کو جانتا ہے۔ مذہب بالکل ایک بچّے کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک حیرت کے عالم میں بچّہ جب چند گھنٹوں کا ہوتا ہے تو وہ چند دنوں تک دنیا کو یا زندگی کو Black and White ہی دیکھ سکتا ہے پھر کہیں جا کر اسے دنیا کی رنگین یا کلر دیکھنے کا اذن ہوتا ہے اور وہ ان نئے نئے واقعات سے مبہوت اور حیرت زدہ ہی رہتا ہے۔ تحیّر میں، ادب میں کسی سے کوئی سوال کرنا بے ادبی کا مظاہرہ کرنا ہے۔

عالمِ تحیّر کو قتل کرنے کا پہلا قدم سوال کرنا ہے۔ سوال بے کیفی و بے تصوّفی کی ابتدا ہے۔ سائنس کئی سال سے بے کیفی اور بے تصوّف کی کیفیت پیدا کرنے کے عمل میں مصروف ہے لیکن یہ کامیاب نہیں ہو سکتی چاہے کتنی بھی کوشش کر لے۔ یہ اپنی منزل کو نہ پہنچ سکے گی۔ سائنس اس ضمن میں بُری طرح سے

ناکام ہو چکی ہے لیکن پھر بھی کوشش کیے جاتی ہے۔ بڑی ہی ڈھٹائی سے، باز نہیں آتی ہے۔ جس قدر ناکام ہوتی ہے لیکن اسی قدر اور کوشش میں مصروف ہو جاتی ہے۔

سائنس بھی اس کوشش میں اتنے ہی طریقے اپنا رہی ہے جس قدر مغرب والے ہمیں خواتین کے بارے میں پُر تشدّد اور ظالم گردانے کے لیے بہانے تلاشنے میں لگا رہے ہیں حالانکہ مغربی ممالک میں طلاق کی شرح پاکستان یا اس کے ہمسایہ ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کا مطلب نہیں کہ خواتین جب آزادی چاہتی ہیں طلاق لے کر ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتی ہیں بلکہ طلاق کا مطلب اپنے جیون ساتھی سے غیر محفوظ اور غیر مطمئن اور انڈرسٹینڈنگ کا نہ ہونا ہے۔

میری پوتی کو ایک بار جاگنگ کا خبط سوار ہوا تو وہ علی الصبح بند گلے اور بند ٹخنوں کا لباس پہن کر جاگنگ کے لیے جانے لگی لیکن وہ کھل کر جاگنگ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ جب وہ تیز یا آہستہ قدموں سے بھاگتی تھی تو علاقے کے کتّے اسے پڑتے تھے جس سے اسے بار بار رُکنا پڑتا تھا۔

اس کے بڑے بھائی نے اپنی بہن کی مدد کی اور اس نے ترکیب سوچی کہ وہ ایک

زنّاٹے دار چھڑی لے کر سائیکل پر سوار ہو کر اپنی بہن کے پیچھے پیچھے چلے گا اور اس طرح وہ کتّوں کو بھگا دے گا اور اس کی بہن بے فکری سے جاگنگ کرے گی۔ یہ سلسلہ بڑا کامیاب رہا۔ ایک روز ایک امریکی گھرانے نے اپنی کار سڑک کنارے روک کر سب اہلیانِ کار کو یہ نظارہ دکھایا۔ گاڑی چلانے والا امریکی گھرانے کا وہ بڑا یہ سین دیکھ کر اُونچی آواز میں کہنے لگا "مشرقی لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں اب اس سنگدل کو دیکھو کس طرح اپنی عورت کے پیچھے جا رہا ہے اور اس کو ضربِ تازیانہ کر دیا ہے۔"

وہ امریکی سمجھ رہا تھا کہ یہ آگے آگے اس کی بیوی ہے اور اس کا خاوند چھڑی لے کر اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ یہ سائنس بھی انہی چکروں میں پڑی ہوئی ہے۔ سائنس کی تمام تر کوشش اس بات پر صرف ہو رہی ہے۔ وہ زندگی کے راز کھول کر کے رکھ دے اور ہستی کو Demystify کر دے۔ سائنس کی آرزو ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب فراہم کرے، ہر انسان کو صاحبِ علم Knowledgeable بنا دے۔ اگر سائنس اس جہت میں کامیاب ہو گئی تو ایک دن ایسا آئے گا جب سب سوالوں کا جواب نکل چکا ہو گا اور ہر طرح کی پر اسراریت اور تحیّر انسانی زندگی سے ختم ہو چکا ہو گا۔ ایک لمحے کے لیے اس

وقت کا اور اس دنیا کا تصوّر اپنے ذہن میں لائیں جب انسان سارے سوال حل کر کے دیوار سے ڈھولگا کر بیٹھا ہو گا۔ تب اس کے لیے کوئی بھید، بھید نہ ہو گا۔ کوئی اسرار اسے حیران نہیں کر رہا ہو گا۔ کوئی حیرت اس کے سامنے رقص کناں نہ ہو گی۔ وہ جس سوال کا جواب چاہتا ہو گا۔ کمپیوٹر روم میں جا کر بٹن دبا کر اس کا جواب نکال لیتا ہو گا۔ انسائیکلوپیڈیا میں دیکھ لیتا ہو گا۔ وہ انسانی زندگی کا بور ترین زمانہ ہو گا اور اس وقت انسانی زندگی سے تمام خوشیاں نکل چکی ہوں گی۔

تجسس کا ایک اپنا حسن اور خوبی ہے جبکہ علم خوشی کو فنا کر دیتا ہے۔ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ علم مسرّتوں کا جلّاد ہے۔ ایک بار میں اپنی خالہ کے گھر گیا۔ وہ اور اُن کی بیٹی گلاب کہ قلمیں بونے کے لیے زمین تیار کر رہی تھیں۔ حالانکہ وہ موسم قلمیں لگانے کا ہرگز نہ تھا۔ میں نے کہا کہ خالہ آپ یہ کس موسم میں گلاب کی قلمیں لگا رہی ہیں۔

وہ کہنے لگیں کہ کیوں موسم کو کیا ہوا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اس موسم میں قلمیں پھوٹا نہیں کرتی ہیں اور وہ شگوفے نہیں نکالتی ہیں۔ یہ سُن کر خالہ کی بیٹی نے اپنے ہونٹوں پر اس طرح سے انگلی رکھی کہ میں فوراً چپ کر جاؤں۔ پھر وہ میرے قریب آ کر سرگوشی سے بولیں "ان قلموں کو کیا معلوم کہ یہ موسم

شگوفے نکالنے یا انہیں بونے کا نہیں ہے۔" وہ مجھے سمجھانے لگیں کہ آہستہ بولو کہیں یہ سُن نہ لیں کیونکہ انہیں موسم کی خبر نہیں ہے۔

ان کے کہنے کا شاید یہ مطلب تھا کیا قلمیں بے خبر ہیں اور وہ بے موسم بھی پھوٹ پڑیں گی۔ مذہب علم پر یقین نہیں رکھتا۔ تمام مذاہب معصومیت پر یقین رکھتے ہیں اور انسانوں کو معصومیت کی راہ سے پاکیزگی عطا کرتے ہیں۔ مذاہب کے رہنما اور پیغمبران ہمیشہ ایسے ہوتے ہیں اور معصوم ہوتے ہیں اور وہ معصومیت کے ذریعے پاکیزگی عطا کرتے ہیں۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ انسان مذہب کی طرف رجوع کیوں کرتا ہے۔ وہ مذہب سے جڑا رہنا کیوں پسند کرتا ہے۔ کوئی بھی انسان ہو وہ کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ رہنا پسند کرتا ہے۔ عبادت میں سکون محسوس کرتا ہے۔ ہر شخص احساساتی طور پر اور ہیجانی طور پر بے چین ہے، پریشان ہے، پراگندہ ہے۔ ہر شخص احساساتی اور ہیجانی طور پر سکون اور شانت بھی ہو سکتا ہے۔ سکون اور شانتی حاصل کرنے کے لیے کسی پریکٹس، قواعد یا عمل کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے کایا پلٹے یا قلابازی لگانے کی ضرورت ہے۔ پہیہ گھوم رہا ہے اور تیزی سے گھوم رہا ہے۔ جس پر گھوم رہا ہے وہ دھرا ساکن اور ایک جگہ پر فٹ ہے۔ ایک

عمل کے پیچھے کیسی پُر سکون بے عملی ہے۔ زندگی کے کنارے پر خلا موجود ہے۔ ہماری بھرپور زندگی کو خلانے گھیر رکھا ہے۔ ایک بگولے کے سکون کے ساتھ ساتھ کاغذ، گتّے، چیتھڑے، ڈبے اور جوتے گھوم رہے ہوتے ہیں اور اُوپر کو اُٹھ رہے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی اتفاق ایک بار میرے ساتھ ہوا اور میں بگولے کے اندر چل رہا تھا۔ کئی چیزیں بگولے کے باعث متحرک تھیں جبکہ میرے بال اور کپڑے بالکل ساکت تھے۔

درحقیقت خلا زندگی کا مرکز ہے۔ دُھرا ہی زیست کا سہارا ہے۔ اس کے سہارے زندگی قائم و دائم ہے۔ میں صرف اسی کو جانتا اور اس کو پہچانتا ہوں۔ یہی اصل حقیقت ہے اور یہی زندگی کا راز۔ اصل بات اپنے اندر کے خلا کو ڈھونڈنا ہے۔ اس کو تلاش کرنا ہے جس پر زندگی گھوم رہی ہے۔

خرد مسائل کا حل نہیں ڈھونڈ سکتی۔ زمین کو زندگی کے بنیادی مسائل کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔ خرد صرف سوال بنا سکتی ہے۔ سوال پوچھ سکتی ہے۔ ان سوالوں کا جواب دینے سے کلی طور پر قاصر ہے۔ جواب ہمیشہ خلا سے آتا ہے۔ حل ہمیشہ دھرا تلاش کر کے دیتا ہے۔ حق اور سچ کی اور اصل علم کی پیاس اس وقت تک نہیں بجھ سکتی جب تک اپنے نفس کو نہ جانا جائے اور اپنی ذات سے واقفیت

حاصل نہ کی جائے۔ انسان بڑے علوم سے واقف ہونے کی بات کرتا ہے۔ چاند پر قدم رکھ کر اس کے اسرار جان جانے کا دعویدار ہے لیکن وہ اپنے اندر کی تلاش کا دعوی نہیں کرتا۔ علوم عقلیہ اور سائنسی علوم سچا علم نہیں ہیں۔ یہ سچائی کے علم نہیں بلکہ سچائی کی افادیت کے علم ہیں۔ یہ صرف بلاواسطہ مشاہدے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح self کو بھی بلاواسطہ طریق پر ہی جانا جا سکتا ہے۔ مذہب اور عبادت ملتی جلتی چیزیں ہیں۔ عبادت مکمل خاموشی میں ہی مکمل ہے۔ عبادت کسی عمل کا نام نہیں ہے بلکہ جب ذہن کسی عمل میں مبتلا نہ ہو، بالکل خالی ہو، وہ وقت عبادت کا ہوتا ہے۔ عبادت کوئی عمل نہیں بلکہ ایک حالت کا نام ہے۔ کوئی ایسا لمحہ بھی آتا ہے جب انسان بغیر کسی شدّ و مد اور اہتمام کے اپنے معبود کے قریب تر آ جاتا ہے۔ سخی سائیں راضی فرماتے ہیں کہ جو مانگتا ہے وہ پالیتا ہے۔ جو جھولی پھیلاتا ہے اس کی جھولی بھر دی جاتی ہے لیکن اس شخص میں سپردگی کا حوصلہ ہونا چاہیے۔

اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا حوصلہ اپنے آپ کو تباہ کر دینے کا یارا، اپنے آپ کو خلا بنا دینے کی جرأت سچ اور حق ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن Self مدہوش ہے۔ اس کی مثال اندھی آنکھوں کے لیے روشنی ہے۔ ہم اپنے نفس کا تو احتساب

نہیں کرتے اس کا تجزیہ نہیں کرتے اور حقیقت کے تذکرے میں ضرور مصروف رہتے ہیں۔ بابے کہتے ہیں ایسی حماقت کبھی نہ کرنا، ایسا وقت آن پڑے توساری کھوج چھوڑ کر خاموشی اختیار کر لینا۔

مجھے اپنے آپ کو دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے کہ میں زندگی میں گوڈے گوڈے دھنسا ہوا ہوں۔ میرے اندر کوئی خلا نہیں ہے۔ وہ شخص جس کے اندر کسی قسم کا خلا نہ ہو وہ کس طرح سے آزاد ہو سکتا ہے۔ انسان کے اندر وسعت اور خلا کی ضرورت ہے باہر نہیں۔ اپنے اردگرد کی آزادی اور خلا سے انسان کی صورت آزاد ہو ہی نہیں سکتا۔

بارش کے موسم میں مَیں نے چولستان میں خاص طور پر دیکھا کہ بڑے بڑے ٹیلے توخشک رہ گئے اور چھوٹے چھوٹے "نمانے نمانے" ٹوٹے گڑھے پانی سے بھر گئے۔ انسان کو ان گڑھوں کی طرح ہونا چاہیے۔ اپنے اندر کچھ سمانے کا یارا ہونا چاہیے۔ ہمارے بابا سائیں سرکار کہا کرتے تھے کہ دیکھو اپنے آپ کو بھر کر مت رکھنا، خالی خالی رکھنا بر کھا اس گڑھے کو زیادہ بھرتی ہے جو خالی خالی ہوتا ہے اور جو برتن مُنہ تک بھرا ہوتا ہے اسے نہیں۔ ہم نے اپنے اصل کو کئی تہوں اور خانوں میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ہمارا اپنا وجود ہمیں ہی نکھر کر نظر نہیں آتا اسے

پھر دوسرے کیسے دیکھ پائیں گے۔

جارج برناڈ شا سے اس کہ عمر کے آخری حصّے میں ایک صحافی نے پوچھا "شا! تم مرنے کے بعد اگر پھر انسانی صورت میں اُٹھائے جاؤ تو کیا بننا پسند کرو گے اور کون بننا چاہو گے۔"

شا نے کہا "میں ایسا جارج برناڈ شا بننا چاہوں گا جیسا اسے ہونا چاہیے تھا، ایسا نہیں جو ہو کر گزر گیا۔"

بات یہاں آ کر رُک جاتی ہے۔ اسے کام، اپنے وجود اور نفس کے تلاش کی ہے۔ اگر انسان اپنے آپ کو کسی طرح پہچان لے تو اس کے کئی مسائل خود بخود دم توڑ دیں گے اور اس پر کئی اسرار افشا ہو جائیں گے اور شاید اس سے سائنس کی مشکل بھی کسی حد تک آسان ہو جائے گی۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

محبّت کی حقیقت

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

تخلیق ہمیشہ محبّت سے پھوٹتی ہے۔ اس کو محبت ہی پال پوس کر پروان چڑھاتی ہے۔ پھر یہ محبّت ہی کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور اس میں گم ہو جاتی ہے۔ پھر تم پوچھتے ہو کہ میں محبّت کو خدا کیوں کہتا ہوں۔ بھائی میں اسی وجہ سے کہتا ہوں!

ہم نے کئی بیماریوں پر قابو پالیا ہے۔ یا کم از کم اُن کو محدود کر کے مقید کر دیا ہے لیکن اس صدی کی سب سے خطرناک بیماری وہ ہے کہ جب انسان اس میں مبتلا ہوتا ہے تو خودکُشی پر مائل ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو تباہ کرنے کی تدبیریں کرنے لگتا ہے۔ اس بیماری کو کیا نام دوں۔ کہ اس کو کوئی نام دیا جانا بہت ہی مشکل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب انسان کے دل اور اندر اس کی محبّت کی باؤلی سوکھنے لگتی ہے تو یہ بیماری پیدا ہوتی ہے۔ اس دنیا میں سب سے بڑا افلاس محبّت کی کمی ہے۔ وہ شخص جس میں محبّت کرنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی وہ اپنے پرائیویٹ

دوزخ میں ہر وقت جلتا رہتا ہے۔ جو محبّت کر سکتا ہے وہ جنّت کے مزے لوٹتا ہے۔ لیکن محبّت کا دروازہ اُن لوگوں پر کھلتا ہے جو اپنی انا اور اپنے نفس سے مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ اپنی انا کو کسی کے سامنے پامال کر دینا مجازی عشق ہے۔ اپنی انا کو بہت سوں کے آگے پامال کر دینا عشقِ حقیقی ہے۔ محبّت جنسی جذبے کا نام ہیں۔ جو لوگ جنس کو محبّت کا نام دیتے ہیں وہ ساری عمر محبّت سے عاری رہتے ہیں۔ جنس تو محبّت کا ایک مظہرِ گزراں ہے۔ یہ قدرت کی مشینری کا ایک پرزہ ہے۔ بقائے نسل کا ایک طریق ہے۔ محبّت اونچے محلوں پر رہنے والی چیز ہے اور جوں جوں محبّت بڑھتی ہے جنس ختم ہوتی جاتی ہے۔ جو طاقت پہلے جنس میں نظر آتی تھی وہ محبّت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

محبّت جنسی قوّت کی تخلیقی صلاحیت کا نام ہے۔ اس لیے جب محبّت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے اس وقت جنس خود بخود معدوم ہو جاتی ہے۔ لیکن جنس سے انحراف کر کے یا اس کو دبا کر اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ محبّت میں اتر کر اس سے گلو خلاصی کرائی جا سکتی ہے۔

محبّت کا سفر اختیار کرنے کے لیے پہلی منزل فیملی یونٹ کی ہے۔ جو پہلی منزل تک ہی نہیں پہنچ پاتا وہ آخری منزل پر کسی صورت میں بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اگر

پہلی سیڑھی ہی غائب ہے تو پھر اُوپر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ فیملی کو اور کنبے کو قائم رکھنے کی محبّت ہی ذمّہ داری ہے۔ جب فیملی یونٹ مستحکم ہوتا ہے اور اس کے افراد، فیملی ممبرز سوسائٹی میں پھیل جاتے ہیں تو محبّت کو وسعت نصیب ہوتی ہے اور محبّت سوسائٹی میں دُور دُور تک پھیل جاتی ہے۔

محبّت کے بغیر انسان ایک فرد ہے۔ ایک ایگو ہے۔ خالی انا ہے۔ اس کا کوئی گھر بار نہیں، کوئی فیملی نہیں۔ اس کا دوسروں کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ کوئی تعلق نہیں۔ یہ بے تعلقی یہ نارشتہ داری موت ہے۔ زندگی تعلق ہے، رشتہ داری ہے، سمبندھ ہے۔

یہ کبھی نہ کہو کہ میں اس وقت نماز پڑھ رہا تھا۔ ذکر کر رہا تھا۔ مراقبے میں تھا کیونکہ جب آپ یوں کہیں گے تو مطلب یہ نکلے گا کہ کبھی آپ نماز نہیں بھی پڑھ رہے ہوتے، ذکر نہیں بھی کر رہے ہوتے، عبادت میں نہیں بھی ہوتے۔۔۔ یاد رکھئے جو کسی وقت بھی عبادت سے باہر ہے وہ کبھی بھی عبادت میں داخل نہیں تھا۔ عبادت کوئی کارکردگی، کوئی ایکٹویٹی نہیں، کوئی کھیل نہیں کہ کبھی آپ اس کے اندر ہیں کبھی اس سے باہر۔ عبادت تو محبّت کی انتہا اور محبّت کی بھرپورتا ہے۔ یہ کوئی مشغلہ یا سرگرمی نہیں۔

خواتین و حضرات! کیا بالآخر ہم اپنی لذّتوں سے تھک نہیں جاتے۔ عاجز نہیں آ جاتے۔ کیا آخر میں ہماری لذّتیں بور اور تھکا دینے والی نہیں بن جاتیں لیکن کیا آپ نے کبھی کوئی ایسا شخص دیکھا جو اس لذّت سے تھک گیا ہو جو لوگوں کو عطا کرتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں کہ وہ لذّت جو ہم دوسروں کو عطا کرتے ہیں صرف وہی آنند میں تبدیل ہوتی ہیں اور آنند کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ نہ ختم ہونے والا ہے۔

محبّت اور وابستگی (Attachment) بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ وابستگی محبّت کے فقدان کا نام ہے۔ وابستگی، نفرت کے برعکس ہے اور چونکہ برعکس ہے اس لیے ان کا جوڑا بن سکتا ہے۔ یہ کبھی بھی نفرت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ نفرت کے برعکس محبّت نہیں ہوتی۔ بالکل نہیں ہرگز نہیں۔۔۔۔ یہ وابستگی سے بھی الگ چیز ہے۔ محبّت تو ایک اور ہی جہت کا نام ہے۔ یہ وابستگی اور نفرت دونوں کے فقدان کا نام ہے۔ پھر بھی یہ ایک منفی جہت نہیں ہے۔

علم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ علم حاصل کرنے والے میں ساتھ ساتھ عدم جارحیت کا جذبہ پیدا نہ ہو چکا ہو۔ چنانچہ کسی کے علم کا صحیح ٹیسٹ اس کے اندر عدم تشدّد کی موجودگی سے لگایا جا سکتا ہے۔ عدم تشدّد انسانی

زندگی کا آخری سوال اور آخری پڑتال ہے۔ کسی انسان کی دین داری کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس (عدم تشدّد) کی بھٹی میں سے ہو کر کندن ہوا یا نہیں۔

جب علم وابستگی سے آزاد ہوتا ہے تو یہ دانش کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اپنی ذات کا علم اپنی ذات کے ذریعے سے دانش کہلاتا ہے۔

خواتین و حضرات! زندگی کے چشمے پر اپنی گاگر بھرنے کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات کنارے پر زانو ٹیکنے پڑتے ہیں لیکن ہم اپنی گاگر بھرنے کے لیے جھکنے کا فن بھول گئے ہیں۔ ہماری انا ہمیں جھکنے نہیں دیتی۔ عجیب بات ہے کہ زندگی ایک حسن اور صورت اور کوملتا دینے کے بجائے کوشش، جدوجہد، سر گردانی اور لکڑ ہاری میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ جہاں بھی تھکنے کے خوبصورت فن سے ناآشنائی ہوگی وہیں جدوجہد اور سر پھٹول کے داؤ اور دھوبی پٹڑے ہوں گے۔

جھکنے اور سیس نوانے کا آنکڑا انسان کو گروپ کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے جو اس فن سے ناواقف ہے، وہ انسانوں سے ہی نہیں کائنات کے وجود سے بھی ٹوٹ

جاتا ہے۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جھکنے اور سیس نوانے کا علم قدرتی اور اندر سے پیدا ہونے والا ہو، باہر سے مسلط کیا ہوا نہ ہو، سیکھا یا پڑھا ہوا نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو یہ نفس کو اور بھی موٹا کر دے گا۔ جو سیس نوائی جان بوجھ کر کی جائے گی اس میں ایک طرح کی اڑی اور ضد ہو گی جس کا علم حلیم اور بردبار کو نہ ہو گا اور وہ یہ سمجھتا رہے گا کہ وہ حلیم بردبار اور صاحبِ برداشت ہے۔ یہ جھکاؤ جب بھی ذہن کے زور پر ہو گا یا ذہن کی سوچ کے مطابق ہو گا تو اصل ہو گا نہ طاقتور ہو گا اور نہ ہی مکمل ہو گا۔ پھر اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہو گا کہ بعد میں مایوسی اور پشیمانی ہو گی اور ذہن یہی نتیجہ نکال کر دے گا کہ خواہ مخواہ ایسے ہی ذلیل و خوار ہوئے اور دوسرے کے سامنے جھکے۔ اصل جھکنا ایسے ہے جیسے تند ہوا کے چلنے سے گھاس کے ڈنٹھل جھکتے اور کورنش کرتے رہتے ہیں۔ ان کو ہوا کے خلاف نہ جب شکایت ہوتی ہے نہ بعد میں۔ وجہ یہ ہے کہ گھاس کے ڈنٹھلوں میں انا اور تکبّر نہیں ہوتا۔ جس روز انسان اپنے اندر کے قدرتی جھکاؤ کو تلاش کر لیتا ہے وہ ابلیس کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے اور خدا کی دہلیز پر پہنچ جاتا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ کو مسرّت اور آنند کی تلاش ہے لیکن آنند تلاش سے

کس طرح مل سکتا ہے۔ آنند اور آسانی تو صرف اُن کو ملتی ہے جو آسانیاں تقسیم کرتے ہیں، جو مسرّتیں بکھیرتے پھرتے ہیں۔ اگر آپ کو آنند کی تلاش ہے تو لوگوں میں آنند تقسیم کرو تمہارے بورے بھرنے لگیں گے۔ طلب بند کر دو۔۔۔۔! یہ دولت صرف دینے سے بڑھتی ہے۔ احمقوں کی طرح بکھیرتے پھرنے سے اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ سائیں کے طریق نرالے ہیں۔ آنند کے دروازے پر بھکاری کی طرح بھی نہ جانا، بادشاہ کی طرح جانا، جھومتے جھامتے دیتے بکھیرتے۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ بھکاریوں پر ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے اور بھکاری کون ہوتا ہے۔ وہ جو مانگے، جو صدا دے، کلیان کرے، تقاضا کرے۔ اور شہنشاہ کون ہوتا ہے، جو دے، عطا کرے، لٹاتا جائے۔ پس جس راہ سے بھی گزرو بادشاہوں کی طرح گزرو، شہنشاہوں کی طرح گزرو۔۔۔ دیتے جاؤ، دیتے جاؤ۔ غرض وغایت کے بغیر شرط شرائط کے بغیر۔

انسان کی زندگی اصل نہیں ہے۔ اس کی زندگی زندگی نہیں ہے۔ دیکھیے ناں جہاں نہ امن ہو، سکون ہو، نہ حسن ہو، نہ ترتیب ہو، نہ امتزاج ہو، نہ بل ہو، نا آنند ہو، ہم اس کو زندگی اس طرح سے کہہ سکتے ہیں؟ ایک افراتفری درہمی برہمی کو کس طرح سے زندگی کہا جا سکتا ہے! ہم میں سے اکثر لوگ بلکہ تمام

لوگ اس افراتفری اور درہمی برہمی کے دور سے گزر کر موت کی وادی میں پہنچ جاتے ہیں۔ گویا وہ زندگی کا مزا لیے بغیر فوت ہو جاتے ہیں۔ سب لوگ پیدا ضرور ہوتے ہیں لیکن صرف چند زندگی گزارتے ہیں باقی کے ہلے گلے اور Fight کی شوٹنگ کروا کر فوت ہو جاتے ہیں۔

"محبّت!" اس ایک لفظ میں انسان کے خدا تک پہنچنے کا راز پوشیدہ ہے اور اس ایک لفظ کے اندر ہی ساری کائنات ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ محبّت تم اُسی وقت کر سکو گے جب تم اندر سے خوش اور پُرباش ہو گے۔ محبّت جھنڈی نہیں ہے کہ گھر کے باہر لگا لی یا تمغہ نہیں ہے کہ سینے پر سجا لیا۔ یا پگڑی نہیں ہے کہ خوب کلف لگا کر سر پر باندھ لی، دستارِ محبّت! یہ تو تمہاری روح ہے، تمہارے اندر کا اندر۔ اور تمہاری آتما کی آتما ہے۔ اس کو تو دریافت کرنا پڑے گا۔ ڈھونڈنا پڑے گا اس کی کھوج لگانی ہو گی۔ یہ عائد نہیں کی جاتی، اندر سے باہر لائی جاتی ہے۔

اگر ایک انسان دکھی ہے اور مُضطرب ہے تو وہ تشدّد پر ضرور مائل ہے۔ اگر وہ خوش ہے اور سیٹی بجا رہا ہے تو تشدّد سے دُور ہے بلکہ اس کو تشدّد کا لفظ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی شخص بھی عدم تشدّد کا مرتکب نہیں ہوتا۔ کیونکہ عدم تشدّد

کوئی فعل یا کوئی ایکشن نہیں ہے یہ تو ایک وجودیت ہے ایک وجود کا حوالہ ہے۔ یہ انسان کے کردار کی تبدیلی کا نام ہیں اس کی ذات کی تبدیلی کا مظہر ہے۔ اہم بات یہ نہیں ہوا کرتی کہ میں کیا کرتا ہوں یا میرا کردار کیا ہے بلکہ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ میں کیا ہوں، کون ہوں۔

جب کوئی شخص اپنی مصیبتوں اور اپنے دکھوں پر دولت کا یا شہرت کا یا طاقت کا جھول ڈال لیتا ہے اور آپ کے سامنے ڈٹ کر بیٹھ جاتا ہے تو ہم سب کہتے ہیں کہ دیکھئے اس نے کیا اپنی زندگی بنائی ہے اور کس قدر کامیاب زندگی بنائی ہے اور کس قدر محنت کے ساتھ بنائی ہے۔ وہ کامیاب شخص آپ کی داد وصول کر کے آداب عرض، آداب عرض کیے جاتا ہے لیکن اس کے اندر کا وجود یہ بات نہیں مانتا۔ اندر کا وجود اچھی طرح سے جانتا ہے کہ اس نے اپنے کرب اور اپنے دکھوں کو دولت اور طاقت اور شہرت کا نشئی کر لیا اور انہیں ہر وقت غٹ رکھتا ہے۔ ایسے لوگ ہم سب کی ہمدردی کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ زندگی حاصل نہیں کی ہوتی بلکہ اس کو کھو دیا ہوتا ہے۔ اپنے دکھوں کو نشئی بنا کر انہوں نے خُودکُشی کر لی ہوتی ہے۔ ایک بات یاد رکھنا کہ اپنے رب کو پہچانا اور اس کا پورا ادراک رکھنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے اپنی بصیرت کے بیج کو اپنی

روح کی سرزمین میں بو دیا ہے۔ اپنے رب کے ساتھ تعارف حاصل کرنا اور اس سے بھاگ نہ جانا اس زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس تعارف سے ذات میں ایسی نشوونما ہوتی ہے اور وجود میں ایسے گُل بوٹے کھلتے ہیں کہ اس سطح پر روح نے پہلے کبھی سفر نہیں کیا ہوتا۔

محبّت آزادی ہے، مکمل آزادی۔ حتیٰ کہ محبّت کے پھندے بھی آزادی ہیں جو شخص بھی اپنے آپ کو محبّت کی ڈوری سے باندھ کر محبّت کا اسیر ہو جاتا ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں آزادی کی تلاش میں مارے مارے نہ پھرو، محبّت تلاش کرو۔۔ آزادی کی تلاش بیسیوں مرتبہ انسان کو انا کے ساتھ باندھ کر اسے اس کے بندی خانے میں ڈال دیتی ہے۔ محبّت کا پہلا قدم اُٹھتا ہی اس وقت ہے جب وجود کے اندر سے انا کا بوریا بستر گول ہو جاتا ہے۔ محبّت کی تلاش انا کی موت ہے۔ انا کی موت مکمل آزادی ہے۔

انا دنیا پر قبضہ جمانے کا پروگرام بناتی ہے۔ یہ موت سے غایت درجہ خوف کھاتی ہے۔ اس لیے زندگی پر پورا پورا قبضہ حاصل کرنے کے پلان وضع کرتی ہے۔ انا دنیاوی اشیاء کے اندر پرورش پاتی ہے اور مزید زندہ رہنے کے لیے روحانی برتری میں نشوونما حاصل کر سکتی ہے۔ اس دنیا کی غلامی اور چاکری کی ڈور انا کے ساتھ

بندھی ہے۔ اناخود غلامی ہے، خود محکومی ہے۔ انا کو آزاد کرانا اور اسے غلامی سے نجات دلانا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام توخود کو انا کی غلامی اور محکومی سے آزاد کرانا ہے۔ یاد رکھئے انا کبھی بھی اپنایت سے، قربانی سے، مذہب سے، علم سے، خوفزدہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اِن سب کے لیے تن من کی بازی لگا دیتی ہے۔ اگر خوفزدہ ہے تو صرف محبّت سے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

تاؤ(TAO)

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

خواتین و حضرات! آج ہم بات کریں گے تاؤ پر۔

تاؤ کا مطلب ہے "کیونکر، کیسے۔"

کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ کس طرح سے عمل کرتے ہیں ۔۔۔ تاؤ اس کائنات کا واحد اصول ہے۔ تاؤ احد ہے۔

تاؤ کی تعریف نہیں کی جاسکتی کیونکہ ہر چیز پر ہر وقت وارد ہوتا ہے۔ پھر کسی شے کی خود اُسی کے معنوں میں کیا تعریف کی جاسکتی ہے؟

اگر آپ ایک اصول کی تعریف کر سکتے ہیں یا ایک اصول Define کیا جاسکتا ہے تو وہ تاؤ نہیں ہے۔

تاؤ ایک اصول ہے۔ ایک تخلیق ہے بلکہ ایک عمل ہے۔ گویا ایک اصول اور

عمل ہے۔ ایک کیونکر ہے اور ایک کیا ہے۔ تاؤ کی کوئی تعریف نہیں بتائی جا سکتی لیکن اس کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے معلوم کرنے کا طریقہ مراقبہ ہے۔ یا جو کچھ گزر رہا ہے اس کے احساس اور گہرے شعور میں اُترنے کا نام ہے۔ جب ''جو کچھ ہو رہا ہے'' اس کے ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے تو پھر مجھے یہ بھی پتہ چلنے لگتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ مجھ میں تاؤ کا ہلکا سا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔

اپنی ''پیش آمدن'' کے احساس کے لیے مجھے اپنی زبان کھول کے رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے اپنے تعصبات اور غرض مندی اور جھکاؤ کو ایک طرف کر کے غور کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ غرض مند اور متعصّب اصحاب ایک ہی رُخ میں سوچ سکتے ہیں کہ ان کے تعصّبات کو کون سی چیز راست آرہی ہے۔

مراقبہ کا اصول یوں کام کرتا ہے کہ اصول اور عمل کبھی جدا نہیں ہوتے۔ سارے عمل ایک بنیادی اور ایک ہی اصول کی وضاحت کرتے ہیں کہ میں تاؤ کو سمجھ سکتا ہوں۔ میں خدا کو جان سکتا ہوں۔

تاؤ کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ میں واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے علم سے واقفیت رکھتا ہوں۔ تمام سلوک اور Behaviour تضاد اور Attitude پر مبنی

ہے۔ اگر میں کوئی چیز زیادہ سے زیادہ کرتا ہوں اور بار بار کرتا ہوں تو اس کا تضاد پیدا ہونا لازمی ہے۔ مثلاً اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کی لگاتار کوشش آپ کو بدصورت بنا دے گی یا کریم اور شفیق ہونے کا دیوانہ وار عمل آپ کو خود غرض اور سفاک بنا دے گا۔

ایک زور دار راہِ عمل اور ایک سلوک اپنی ضد پیدا کر کے رہے گا۔

زندہ رہنے کی دیوانگی لازماً موت کے خوف کی وجہ سے ہو گی۔

حقیقی سادگی آسان کام نہیں ہے۔

شیخی خورہ، متکبّر اور بڑبولا ہمیشہ احساسِ کمتری کا اور خوف کا شکار ہوتا ہے۔

جو اوّل ہونے کی کوشش کرے گا وہ آخر ہو کر رہے گا۔

تضاد کا عمل جاننے کے لیے سیانے لوگ واقعات کو دھکیل کر سامنے نہیں لاتے بلکہ عمل کو ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

رہبر مثال سے سکھاتا ہے، بھاشن سے نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ مسلسل دخل اندازی گروہ کے عمل کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دے گی۔ وہ اس بات پر مُصِر

نہیں ہوتا کہ واقعات کو اس طرح سے رونما ہونا چاہیے۔

قلندر رہنما نہ تو زیادہ دولت کا خواہشمند ہے اور نہ ہی زیادہ مدح اور تعریف کا حالانکہ اس کے پاس دونوں ہی وافر مقدار میں موجود ہوتی ہیں۔

ایک صاحبِ حال اپنی تقدیس کی نمائش نہیں کرتا۔ اپنے خصائص اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کا اشتہار نہیں دیتا۔ ایسا کرے تو کامیابی اور ناکامی کی فضا پیدا ہو جائے۔ مقابلے اور حسد کا میدان گرم ہو جائے۔

مادی کامیابیوں پر زور دینا اور ان پر ہنکارنا بھی ایسے ہی ہے جن کے پاس بہت ہوتا ہے وہ لالچی بن جاتے ہیں۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا وہ چور بن جاتے ہیں۔ جب آپ ظاہر پر زور دیتے ہیں تو لوگ خوش کرنے کے لیے کدو کاوش کرنے لگ جاتے ہیں۔

صاحبِ حال ہر پیش روی کو احترامی توجّہ سے نوازتا ہے۔ اس طرح سے گروہ میں پیش روی کی بہت سی ممکنات پیدا ہو جاتی ہیں۔ لوگ اس طرح سے زیادہ سیکھتے ہیں کہ ساری جہتیں اُن پر واضح ہو جائیں۔ اس طرح سے غبی ہو جاتے ہیں کہ صرف گرو کو ہی خوش کرنے میں لگے رہیں۔

صاحبِ حال جانتا ہے کہ سٹائل، اصل کا اور مغز کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔۔۔۔
وہ جانتا ہے کہ چند حقائق کو جان لینا دانش سے قوّی تر نہیں ہے۔ جعلی عکس اندر
کے مرکز سے مضبوط نہیں ہو سکتا۔

چیلے یہ سیکھتے ہیں اور ان پر واضح ہو جاتا ہے کہ مؤثر عمل خاموشی سے پیدا ہوتا
ہے اور کارگر پیش قدمی اپنے ہونے کے صحیح احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں
ان کو امن اور سلامتی اور سکون کا گہرا ساگر مل جاتا ہے۔ ان پر یہ عیاں ہوتا ہے
کہ جو شخص Down to Earth ہے وہ بہتر اور گہرے اور صحت مند عمل میں
داخل ہو سکتا ہے، بمقابلہ اس شخص کے جو مصروفیت میں جُتا ہوا ہے اور صرف
کام ہی کر رہا ہے۔

آپ کتنی بھی کوشش کر لیں، کتنے پاپڑ بیل لیں، کتنا گہرا کیوں نہ کھود لیں آپ کو
نہ تو تاؤ ملے گا اور نہ خدا۔ تاؤ کوئی چیز نہیں ہے کہ ڈھونڈنے سے مل جائے اور
کھودنے سے برآمد ہو جائے۔ تاؤ تو ایک اصول ہے، ایک قانون ہے۔ تاؤ کا
مطلب ہے کیونکر؟ کس طرح؟

دنیا کی تمام اشیاء تاؤ کی خواہش کے مطابق کام کرتی ہیں۔ اس کی مرضی کے

مطابق کام کرتی ہیں۔ لیکن تاؤ کا کوئی عمل نہیں ہوتا۔ یہ خود کچھ نہیں کرتا۔ کیونکہ تاؤنہ توکوئی چیز ہے اور نہ ہی کوئی عمل ہے۔ تاؤتوساری اشیاء کا قانون ہے، ان کو باندھنے والا اور راست رو کرنے والا قانون۔

تخلیق کا چیز سے اور واقعے سے تعلق ہوتا ہے اور تمام چیزیں اور واقعات متحرک ہیں۔ ان میں ارتعاش ہے۔ ارتعاش کی حرکت متضاد ہوتی ہے۔ ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی طرف بڑھتی ہے۔ تضادات (ارتعاش) یاتو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر امدادِ باہمی کی داغ بیل ڈال لیتے ہیں۔ ان میں کوآپریشن پیدا ہو جاتی ہے یا پھر ان میں Conflict پیدا ہو جاتا ہے جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

لیکن تاؤ کوئی مرتعش وجود نہیں۔ اس میں ارتعاش پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ کوئی آواز نہیں کہ اس میں پھیلنے والی لہریں پیدا ہوں۔ ان میں تضادات ہوں، اختلافات ہوں۔

تاؤ ایک ہے۔ واحد ہے۔ احد ہے۔ تاؤ کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ جس طرح خدا کا کوئی خالق نہیں ہے۔

قانون، قدرت اٹل ہے۔ اس کا انصاف کچھ ایسا ہی Exact ہے۔ کسی شخص کے

کردار اور اس کے عمل کے نتائج ناقابلِ مفر ہیں۔ جو کسی نے کیا ہو گا اس کا نتیجہ ضرور بر آمد ہو گا۔ یہ کوئی عذر نہیں کہ جناب میں انسان ہوں اس لیے شرمندہ ہوں اور معذور ہوں۔

صاحبِ حال مرشد لوگوں کو ان کے اپنے حال سے محفوظ نہیں رکھتا۔ ان کی کیفیت ان پر چھپنے نہیں دیتا۔ احساس کی روشنی مناسب اور نامناسب پر ایک جیسی پڑتی ہے اور ساری سطحوں کو ایک سا روشن کرتی ہے۔ انسان دوسری مخلوقات سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ قانونِ قدرت کا سب پر ایک سا اطلاق ہے۔ ایک شخص اتنا ہی اچھا ہے جتنا کہ دوسرا۔ پھر رورعایت کیا کرنی۔

خدا کا چونکہ کوئی وجود نہیں ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کی کوئی ہستی نہیں۔

ذرا سی عاجزی ہی قانون کا راز ہے اور اس راز کو جان کر مرشد کوئی خاص شے بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ متقابل نظریات کی بحث میں نہیں الجھتا۔

خاموشی طاقت کا سب سے بڑا راز ہے۔

کیا تم ایک شنوندا (Receptive) ہونے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ ایک کشکول بن سکتے ہو؟ خاموش اور بغیر خواہش یا کچھ کرنے کے آرزومند ہو؟ کھلے اور پذیرا اور قبولی ہونے کو مدین کہتے ہیں۔ یا وادی کہتے ہیں یا کچھ اور۔۔۔۔۔۔!

سوچو کہ وادی کے اندر ایک جھیل ہے۔ جب جھیل ساکت ہے اور خاموش ہے۔ تو اس کی سطح ایک آئینے کی مانند ہے۔ اس آئینے میں تم تاؤ کو دیکھ سکتے ہو۔ خدا کو دیکھ سکتے ہو، خالق کا نظارہ کر سکتے ہو۔

جیل کو دیکھو اور دیکھتے جاؤ۔ تمہاری خاموشی میں اضافہ ہو گا۔ جھیل کبھی بھی خشک نہیں ہو گی۔

جک جھیل اور تاؤ اور وادی یہ سب تمہارے اندر ہیں باہر نہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

حقیقت اور مُلّا سائنسدان

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

خواتین و حضرات! میں نہیں جانتا حقیقت کیا ہے سچائی کیا ہوتی ہے!

سچائی کا تجربہ نہ کوئی خیال ہے نہ ہی احساس ہے اور نہ ہی کوئی تصوّر ہے۔ یہ تو آپ کے سارے وجود کے اندر ایک جھنجھناہٹ، ایک ابال، ایک تلاطم کا نام ہے اور پھر حیرانی کی بات یہ ہے کہ سچ آپ کے اندر نہیں ہوتا۔ آپ سچ کے اندر ہوتے ہیں۔ کوئی ایک تجربہ یا مشاہدہ نہیں۔ کوئی علم نہیں جو آپ محسوس کر رہے ہیں۔ یہ تو سارے کا سارا آپ ہی ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ یہ آپ سے آپ کی ذات سے اور آپ کے وجود سے بھی بڑا ہے کیونکہ ساری کائنات اور ساری ہستی اس کے اندر سمائی ہوئی ہے۔

اور پھر یہ بھی یاد رکھو کہ سچ کا اُلٹ جھوٹ نہیں ہے کیونکہ جھوٹ کا اُلٹ بھی جھوٹ ہی ہوتا ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت ساری دنیا گم کردہ راہ ہے اور اس کو راستہ نہیں مل رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان نے تحقیق کے سارے دھارے باہر کی طرف موڑ دیئے ہیں اور اس نے باہر کے وجود کو باہر کی دنیا کو طبیعی اور جسمانی دنیا کو کھوجنا شروع کر دیا ہے اور اپنے اندر کی دریافت ترک کر دی ہے۔ ایک سیدھی کی اور قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ انسان کو انسان سے زیادہ اور کوئی چیز عزیز نہیں ہونی چاہیے۔ انسان کو اپنے سے زیادہ تو اور کسی سے پیار نہیں ہونا چاہیے اور انسان کو انسان سے زیادہ تو اور کسی پر تحقیق نہیں کرنی چاہیے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو نہیں جانے گا، خود کو نہیں پہچانے گا اس کی باہر کی ساری کی ساری تحقیق ناکام اور نامراد ہو گی اور جو شخص خود ناشناس ہو تخلیقی کام کس طرح سے کر سکتا ہے۔ اگر انسان خود کو سمجھ جائے، اپنا آپ پہچان جائے، صرف اس وقت وہ کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو پھر اس کی ہر کاوش اپنی قبر ہی کھودتی رہے گی اور وہ مجبور ہی رہے گا۔

ہم نے مادّی قوّت پر بڑا کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ لیکن ہم انسانی دل کے اندر کی گہرائیوں سے واقف نہیں ہیں۔ ہمیں دل کے اندر کے زہر اور امرت سے شناسائی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ ہم نے ایٹم کی ساخت تو دریافت کر لی ہے لیکن

روح کے ایٹم کو جانچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور ہماری سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ ہم نے طاقت اور پاور تو حاصل کر لی ہے لیکن سکون اور روشن ضمیری سے محروم ہو گئے ہیں۔

ہماری ساری تحقیق، طاقت اور طاقت کی تلاش سے وابستہ ہے۔ اور ہم اپنے ہاتھوں پیدا کیے ہوئے خطرات میں گِھر گئے ہیں اور امن و سکون سے کوسوں دُور رہ گئے ہیں۔ اصل میں ہمیں طاقت کے بجائے امن کی اور سکون کی ضرورت تھی اور اس کی طرف ہم نے کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ اگر ہماری توجّہ امن و آشتی کی طرف رہتی تو ہماری تحقیق کا دھارا خود بخود انسان کی طرف اور روح کے ایٹم کی تلاش کی طرف پھر جاتا اور ہم کو قدرت کے بہت سے سربستہ راز جلد معلوم ہو جاتے۔ لیکن افسوس یوں نہ ہو سکا۔

خواتین و حضرات! لیکن میرا ایمان ہے کہ مستقبل کی سائنس مادے کی سائنس نہیں ہو گی بلکہ انسان کی سائنس ہو گی۔ یہ تبدیلی جلد رونما ہو جانی چاہیے۔ پیشتر اس کے کہ اس میں مزید تاخیر ہو جائے۔ وہ سائنس دان جو اس وقت بے جان چیزوں کی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں، دراصل کٹر ضدی اور مُلّا قسم کے سائنس دان ہیں۔ ان کے ذہن روایت سے اور رواج سے بندھے ہوئے ہیں۔

اب ضرورت ہے کہ بیدار مغز اور روشن فکر لوگ سامنے آئیں اور سائنسی تحقیق کا رُخ بدلیں۔ سائنس پر انسان کو اور اس کے وجود اور اس کی روح کو پرکھنے کا فرض واجب ہوتا ہے۔

پیغمبروں نے آکر انسانوں کی کایاپلٹ دی۔ اب (چونکہ پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ بند ہو چکا ہے) سائنس دانوں پر فرض واجب ہوتا ہے کہ جس کام کی ابتدا انبیوں نے کی اور جس علم کو نبیوں نے پھیلایا اب اس کو سائنس دان اختتام تک پہنچائیں!

ہم نے اب تک مادے کے بارے میں جو سائنسی معلومات حاصل کی ہیں وہ کمال کی معلومات ہیں۔ لیکن جو علم ذات اور سیلف کے بارے میں گیانیوں نے جانا ہے وہ سائنسی علم سے ارفع ہے۔ گزشتہ زمانوں میں یہ علم چند گُنی لوگوں کے پاس ہی ہوتا تھا اور اب بھی چند ہی لوگ اس سے واقف ہیں۔ لیکن اگر کہیں سائنس دان اس کی طرف متوجّہ ہو جائیں تو دنیا سکھی ہو جائے اور امن و سکون کی دولت سے مالا مال ہو جائے اور علم گھر گھر ہو جائے۔ جیسے ٹیپ ریکارڈر، مِکسر، بلینڈر اور ٹی وی گھر گھر پہنچ چکے ہیں۔

عزیزو! میری بات ذرا دھیان سے سُننا اور اس پر غور کرنا کہ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ افراد کی حاصلِ ضرب کا نام ہے۔ یہ ہمارے ذاتی تعلقات کے پھیلاؤ کا نام ہے۔ جو کچھ ایک فردِ واحد پر وارد ہوتا ہے وہ ساری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ جنگوں کے اسباب اور معاشروں کے انحطاط کی وجہ افراد کے ذہنوں میں مقید ہوتی ہے۔ اگر ہمیں معاشرے کو تبدیل کرنا ہے تو ہمیں فرد کو تبدیل کرنا ہوگا۔ اگر ہمیں معاشرے کو بہتر بنانا مقصود ہے تو پھر فرد کو ایک نئی زندگی عطا کرنا ہوگی۔

ہم نے مادے پر تو فتح حاصل کر لی ہے لیکن وہ انسان جس کے لیے مادے کو مسخّر کیا گیا ہے بالکل ناشناس چھوڑ دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں انسان پر توجّہ دینی چاہیے۔ سائنس اور مذہب کا مرکز انسان ہونا چاہیے، مادہ نہیں۔

سائنس کی ایجادات اور اختراعات انسان کو سکون اور طمانیت عطا نہیں کر سکتیں۔ ان سے آرام اور آسائش میں ضرور اضافہ ہوتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ آسائش اور آرام معدوم ہو جاتے ہیں۔ اور انسان پھر چیخنے اور چلّانے لگ جاتا ہے۔ ذرا سی دیر میں ہم ان Comforts کے عادی ہو جاتے ہیں اور تھوڑی ہی دیر بعد پھر بے چین اور بے کُل ہو جاتے ہیں۔ یہ سارے آرام اور آسائشیں

ہمارے دکھوں اور اُلجھنوں کو دبا تو دیتی ہیں لیکن ان کا علاج نہیں کر پاتیں۔ بے چینی کے بعد ہم نئے آرام و آسائش کی تلاش میں لگ جاتے ہیں اور نئی ایجادات کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس تلاش سے ہمیں نراشا، مایوسی، بے چینی حاصل ہونے لگتی ہے اور ہم دیوانگی کی حدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں ہم باہر کی چیزوں کے حصول میں امیر ہو جاتے ہیں ہم اندر سے غریب ہونے لگتے ہیں۔ جب بدھا اور سکندر کو اپنی حکومت مملکت اور دولت کا احساس ہوا، انہیں اندر کی غریبی کا گہرا علم نصیب ہونے لگا۔

زندگی نہ اندر ہے نہ باہر، نہ مادہ ہے نہ روح۔ یہ اس سے عظیم تر ہے۔ اگر انسان اپنے اندر پر توجّہ مرکوز کرتا ہے تو وہ اپنے محیط سے بے بہرہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ صرف محیط پر نگاہ رکھتا ہے تو مرکز سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک محیط، ایک مرکز کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔ زندگی ان دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ سائنس باہر سے متعلق ہے۔ مذہب اندر سے۔ بظاہر یہ دونوں مختلف نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں دونوں ایک ہی اکائی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس طرح سانس اندر آنے کا نام بھی ہے اور باہر جانے کا بھی اسی طرح سے زندگی ہے۔ اس کے دونوں ہی رُخ ہیں۔ زندگی کی حقیقت وہی جان سکتا ہے جس کی نظریں دونوں

رُخوں پر ہیں۔

سچائی اور حقیقت کسی نکتۂ نظر کا نام نہیں۔ جب سب نکتہ ہائے نظر مفقود ہو جاتے ہیں اس وقت سچائی جنم لیتی ہے۔ جہاں بدلتے ہوئے حالات نہیں ہیں وہی حقیقت ہے۔

سائنس الفاظ ہے، اظہار ہے، ہندسہ ہے۔ مذہب خاموشی کا نام ہے۔ محیط وضاحت ہے۔ اظہار سے نمائش ہے۔ سائنس اس لیے لفظ ہے کہ مرکز خاموش ہے۔ مرکز نامعلوم ہے۔ غیر مرئی ہے۔ سائنس ایک درخت ہے۔ مذہب بیج ہے۔ سائنس جانی جا سکتی ہے، سمجھائی جا سکتی ہے، لیکن مذہب جانا نہیں جا سکتا اور باوجود اس کے کہ مذہب جانا نہیں جا سکتا، انسان مذہب کے اندر رہ سکتا ہے۔ سائنس علم ہے مذہب ہستی ہے۔ اس میں رہا جا سکتا ہے، سائنس پڑھائی جا سکتی ہے لیکن مذہب پڑھایا نہیں جا سکتا۔ اس میں بسرام کیا جا سکتا ہے۔

سائنس معلوم کی تحقیق کا نام ہے۔ مذہب نامعلوم کی دریافت ہے۔ سائنس انسانی خوشی کو وسعت دینے کا نام ہے۔ دنیا میں آسائش مبہم کرنے کی "کرتو"

ہے۔ لیکن مذہب کا مقصد ہر فرد کے لیے نامعلوم کا عرفان حاصل کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں بہت ساری سائنسیں ہیں لیکن مذہب ایک ہی ہے۔ سائنس ترقّی پذیر ہے لیکن مذہب ازلی اور ابدی شے ہے۔

امان حاصل کرنے کے لیے اور سیکورٹی کے لیے اور خوشی کے لیے اور مسرّت کے لیے محیط کی طرف رجوع کرنا اپنی ذات سے اور جوہر سے دُور ہونا ہے، باہر کو پھیلنا ہے لیکن زندگی کا سربستہ راز یہ ہے کہ جب انسان اپنے مرکز کی طرف رجوع کرتا ہے حقیقت کے قریب تر ہوتا ہے تو آنند پاتا ہے۔ لطف حاصل کرتا ہے اور جب وہ لطف حاصل کرتا ہے تو محیط غائب ہونے لگتا ہے اور جب وہ بالکل غائب ہو جاتا ہے تو حق رہ جاتا ہے۔ اس وقت نظارہ اور ناظر اور شاہ اور مشہود ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ سائنس تو مذہب سے جھگڑتی ہے لیکن مذہب سائنس سے کوئی جھگڑا نہیں کرتا۔ محیط تو اپنے مرکز سے باہر نکل سکتا ہے، پھیل سکتا ہے، دوری اختیار کر سکتا ہے، لیکن مرکز نہیں۔ مرکز سے یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ بیٹا ماں سے دُور ہو سکتا ہے، الگ ہو سکتا ہے لیکن ماں نہیں کیونکہ بیٹے کی ہستی ماں کے اندر ہی ہوتی ہے۔

اور پھر بھلا سائنس نے انسانیت کے لیے کیا کیا ہے؟ بڑی بڑی تحقیقوں اور

ایجادوں نے سائنس کا بڑا رتبہ بلند کیا ہے اور اُس کو اِس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ اس وقت ہے۔ مگر میری اصل ان چیزوں کے نیچے دبی پڑی ہے اور میرے اوپر ایک بھاری سِل رکھی ہے۔ کیا یہی سب کچھ ہے؟ کیا یہی میں ہوں؟ بس اتنا ہی ہوں؟ اگر اس کا جواب لفظوں میں ملے، خیال میں ملے، شکلوں میں ملے، تو سمجھ لو کہ تم کو دھرم کا شعور نہیں ہو سکے گا۔ کبھی بھی نہیں ہو سکے گا۔ تصوّر اور خیال کبھی بھی خیال سے آگے نہیں جاسکتے اور خیال کی حد خیال ہی ہوتی ہے۔ اس سے آگے نہیں۔۔۔۔۔ ایک پیاز کو چھیلتے جاؤ، چھیلتے جاؤ، آخر میں کیا رہ جائے گا؟ کچھ بھی نہیں، صرف پیاز کی خوشبو رہ جائے گی، اس کی توس رہ جائے گی بس یہی اصل ہے اور یہی حقیقت ہے۔ جب انسان انتخاب کرنے اور اختیار کرنے سے باہر نکل جاتا ہے اس وقت خیال اور تصوّر بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے۔ اس وقت شعور اور جانکاری رہ جاتی ہے اور یہی زندگی کا جوہر ہے۔ اس طرح سچ سے بھی ملاقات اس وقت ہوتی ہے جب آپ لفظوں سے باہر نکل جائیں۔ لفظوں کو چھیل چھیل کر اسے پیاز کی طرح بنا دیں۔

جب میں اپنے آپ پر نگاہ ڈالتا ہوں اور غور سے دیکھتا ہوں تو مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ نجات اور عرفان اُس زمین سے نزدیک تر ہے جس پر میں چلا جا رہا ہوں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

اجرامِ سماوی کا جغرافیہ

(ربوبیت کے اسرار)

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

خواتین و حضرات! جیسے کہ آپ جانتے ہیں اس وسیع و عریض کائنات میں صرف ایک ہی زمین نہیں بلکہ ہمارے کرۂ ارض کی طرح متعدد زمینیں موجود ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور انہی کی طرح زمینیں بھی۔ ان سب میں امرِ اعلیٰ نازل ہو رہا ہے تا کہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر شے پر محیط ہے۔ (طلاق:۱۲)

ہماری کائنات میں کہکشاں (Galaxies) کی تعداد اربوں تک پہنچ چکی ہے اور خود ایک ایک کہکشاں میں ان گِنت ستارے موجود ہیں تو پھر زمینیں صرف سات

ہی کیوں؟ اس کا جواب دینا قبل از وقت ہے کیونکہ سائنسی نقطۂ نظر سے ہماری زمین کے سوا کسی بھی دوسرے سیارے (Planet) میں زندگی کا وجود ثابت نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے آثار اور امکانات تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اب یہ سوال اس وقت پیدا ہو گا جب خود سائنس سات سے زیادہ اجرام یا کُرّوں میں زندگی کا وجود ثابت کر دے۔ اس لحاظ سے موجودہ حالات میں تو ہمیں سائنس سے زیادہ قرآن اور حدیث زیادہ ترقّی یافتہ نظر آتے ہیں۔ سائنس جب اور زیادہ آگے نکل جائے گی تو وہ اور زیادہ ترقّی یافتہ نظر آئیں گے۔

بہرحال قرآن میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ ہماری زمین ہی کی طرح بہت سے اجرامِ سماوی میں بھی ہر قسم کے جاندار پائے جاتے ہیں۔

اور اس کے وجود دلائل و نشانات میں سے ہے۔ یہ بات کہ اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ان میں ہر قسم کے جاندار پھیلا دیئے۔ (شوریٰ:۲۹)

اس آیتِ کریمہ میں جن اجرام کو سماوات کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے انہی اجرام کو سورۃ طلاق میں زمینوں کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اوپری زمین نیچے والوں کے لیے بمنزلہ آسمان (سماء) کے ہے۔

پس اس نے دو دن (دو مرحلوں) میں سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کا معاملہ رکھ دیا۔ (حم: سجدہ:۱۲)

اس آیت سے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ مختلف سیاروں کی شکل و صورت، چہرہ مُہرہ، رنگ ڈھنگ اور حال چال میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شہابیوں کے کیمیائی تجزیہ سے پتہ چلا ہے کہ ان کائناتی پتھروں کے بنیادی اجزا بالکل وہی ہیں جو ہماری زمین کے اجزا ہیں۔ مگر ان شہابیوں کے Compounds (مرکبات) اور ہماری زمین کے مرکبات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا ان اجرام میں آباد شدہ مخلوق کی جسمانی ساخت اور کیفیت میں بھی اسی قسم کا اختلاف ہو سکتا ہے جیسے دو زبانوں میں باوجود بعض حروفِ تہجی اور ان کے صوتی لہجوں میں اشتراک ہونے کے ان کے الفاظ و حکمات کی شکل و صورت میں کوئی یکسانیت اور ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ مثلاً اُردُو، انگریزی یا جرمن اور سنسکرت میں حروف کا آہنگ ایک جیسا ہو سکتا ہے لیکن لفظی صورت اور اُن کے معانی بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

اب زمین اور چاند کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ مثلاً چاند پر ہوا، پانی، آکسیجن، پیڑ، پودے اور حیوانات وغیرہ کا وجود نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

اور زمین میں تمہارے لیے ایک خاص وقت تک جائے قرار اور سامانِ زندگی رکھا گیا ہے۔(اعراف:۲۴)

کہہ دو کہ میرے رب کی باتوں کے لیے اگر سمندر بھی روشنائی بن جائے تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا۔ اگرچہ ہم اس کی مدد کے لیے ایک اور سمندر لے آئیں۔(کہف:۱۰۹)

اور اگر زمین میں جتنے بھی درخت ہیں اُن کے قلم بن جائیں اور سمندر جس کے بعد مزید سات سمندر لے لیے جائیں تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اللہ تو بڑا ہی غالب اور دانا بینا ہے۔(لقمان:۲۷)

اور اللہ ہی نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ جن میں کوئی پیٹ کے بَل چلتا ہے، کوئی دو پیروں پر چلتا ہے اور کوئی چار پیروں پر چلتا ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (چار پیروں سے زائد بھی عطا کر سکتا ہے)۔ یقیناً اللہ ہر چیز کے پیدا کرنے پر قادر ہے۔(سورۃ نور:۴۵)

ایک مقام پر اللہ اور غور طلب حقیقت کا اظہار فرماتا ہے کہ اس کے نشانات میں سے ہے زمین اور اموات کا پیدا کرنا اور ان جانداروں کا پھیلانا(شوریٰ:۲۹)

اس آیت کے مطابق دیگر سیاروں میں بھی ''دابہ'' کا وجود پایا جاتا ہے اس لیے وہاں پر بھی پانی کا وجود لازمی ہے کیونکہ ہر جاندار شے پانی سے پیدا ہوئی۔ ''دابہ'' لغت کی رُو سے چلنے پھرنے اور رینگنے والے جانور کو کہتے ہیں کیونکہ دب کے معنی رینگنے کے ہیں (لیکن آئمہ لغت کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق عموماً ہر قسم کے جانداروں پر ہوتا ہے) اور سورۃ نور کی مذکورہ آیت بھی خوشی سے اس پر روشنی ڈال رہی ہے۔ چنانچہ دابہ کا اطلاق Unicellular (یک خلوی) سے لے کر ایک بڑے سے بڑے ہاتھی، وہیل اور گینڈے پر بھی ہو سکتا ہے۔

غرض ان تصریحات کے مطابق ماء اور دابہ یا پانی اور جاندار لازم و ملزوم ہیں جن میں چولی و دامن کا ساتھ ہے اور اس کی تائید حسبِ ذیل آیات سے ہوتی ہے۔

کیا ان منکرینِ خدا نے مشاہدہ نہیں کیا کہ ابتدا میں زمین و اجرامِ سماوی آپس میں ملے ہوئے تھے۔ پس ہم نے ان کو بکھیر دیا (جس کے نتیجے ہیں اور مختلف کُرّے بن گئے) اور ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز کی تخلیق کی ہے تو کیا یہ منکرین ایمان نہیں لائیں گے۔ (انبیا:۳۰)

اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ ہماری زمین کی طرح دیگر اجرامِ فلکی کے تمام

جانداروں کی زندگی میں پانی ایک بنیادی عنصر اور لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر ارشادِ ربّانی ہے:

ہم نے تمہارے اوپر سات راہیں پیدا کر دی ہیں (یعنی سات آسمان) اور ہم اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہیں اور ہم نے آسمان سے ایک معیّن مقدار میں پانی برسایا، پھر اس کو زمین میں ٹھہرایا اور اس پانی کو ہم غائب بھی کر سکتے ہیں۔ پھر ہم نے اس پانی سے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اُگائے اور تمہارے لیے ان باغوں میں بہت سے پھل بھی مہیا کیے اور تم ان باغوں میں کھاتے ہو۔ اس کے علاوہ ہم نے ایک اور درخت بھی اُگایا ہے جو طُورِ سینا میں اُگتا ہے۔ وہ تیل اور کھانے والوں کے لیے سالن لے کر برآمد ہوتا ہے اور یقیناً تمہارے لیے چوپائیوں میں بھی ایک بڑا سبق موجود ہے۔ ہم اُن کے پیٹ میں موجودہ چیزوں میں سے تمہیں پینے کے لیے دیتے ہیں اور تمہارے لیے ان چوپائیوں میں بہت سے فوائد بھی ہیں۔ تم انہیں کھاتے ہو، ان چوپائیوں اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔ (مومنون:۱۷/ ۲۲)

یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآن حکیم میں اسرارِ کائنات اور رازہائے ربوبیت کا

بیان عموماً اشاروں کنائیوں کی زبان میں ملتا ہے تا کہ سائنسی نقطۂ نظر سے چودہ سو سال پہلے کی غیر ترقّی یافتہ اقوام کو کوئی الجھن نہ ہو اور وقت آنے پر یہ حقائق غور و خوض کی بدولت بے نقاب بھی ہو جائیں۔

حسبِ ذیل آیہ کریمہ اس راز پر سے پردہ اُٹھا رہی ہے کہ مختلف اجرامِ سماوی میں جو زندگی کے مظاہر سے مالا مال ہوں۔ دھوپ اور سائے کا نظام بھی کار فرما ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ہر جہان کے لیے ایک سورج یا اس کی نوع کا سسٹم بھی ہوتا ہے۔

زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے، خوشگواری سے یا ناگواری کے ساتھ صبح و شام اللہ ہی کے آگے سجدہ ریز ہیں اور ان کے سائے بھی سر بجود ہیں۔ (رعد:۱۵)

یہاں پر سائے کے لفظ سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ اجرامِ سماوی میں بھی دھوپ چھاؤں موجود ہے جو بغیر کسی سورج کے ممکن نہیں۔ اس سے پچھلے صفحات کے نظریہ کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ہر نظامِ شمسی میں کوئی نہ کوئی ایسی زمین بھی ہو گی جو گرمی اور سردی کے لحاظ سے معتدل اور زندگی کے لیے ساز گار ہو گی، جیسے ہماری زمین جو نہ تو عطارد اور زہرہ کی طرح بے انتہا گرم ہے

اور نہ مریخ اور مشتری اور نیپچون اور پلاٹو کی طرح بے انتہا سرد!

خواتین و حضرات! سائنس دان ابھی تک اجرامِ فلکی میں زندگی کے وجود یا عدم وجود پر کسی قطعی رائے پر نہیں پہنچ سکے۔ ٹھیک ہے انسان کا علم ہی کتنا ہے کہ وہ لاکھوں کروڑوں نوری سالوں کے فاصلوں کا حتمی اور یقینی فیصلہ کر سکے۔ اب خالقِ کائنات نے تو بتا دیا ہے اور حتمی طور پر بتا دیا ہے لیکن سائنس دان بھی کبھی نہ کبھی اپنے مشاہدے اور شواہد کے زور پر اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔

بہرحال قرآن کے ذریعے پندرہ سو سال قبل یقینی اور حتمی طور پر اعلان و انکشاف کیا جا چکا ہے کہ ہماری زمین کی طرح بہت سے سیّاروں پر بھی صرف ہر قسم کے جانداروں کا وجود پایا جاتا ہے بلکہ وہاں پر عقل و شعور کی قوّتوں سے متصف ایک ترقّی یافتہ مخلوق بھی موجود ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اور اس کے نشان ہائے (وجود) میں سے ہے یہ بات، کہ اس نے زمینوں اور آسمانوں کو پیدا کیا اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلا دیئے۔ اور اس کو اس بات کی قدرت حاصل ہے کہ وہ جب چاہے انہیں (کسی ایک مقام پر) اکٹھا کرے۔ (شوریٰ:۲۹)

کیا ان لوگوں کو زمین اور آسمان پر اور ان دونوں کے درمیانی مظاہر پر قابو حاصل ہو چکا ہے! اگر یہ بات ہے تو وہ کمندوں کے ذریعے اُوپر چڑھ جائیں۔ یہ ایک حقیر سا لشکر ہے جو وہاں (اجرامِ سماوی پر) موجود فوجوں سے شکست کھا جائے گا۔ (ص:۱۱-۱۰)

اس سے منکشف ہوتا ہے کہ اجرامِ فلکی میں کوئی اعلیٰ درجے کا ترقّی یافتہ تمدّن موجود ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر فوجی عسکری قوّتیں بھی پائی جاتی ہیں جن کے تمدّن کی حالت زمینی تمدّن سے زیادہ ترقّی یافتہ ہے۔ موجودہ خلائی پروازوں کی روشنی میں یہ داستان ایک حقیقت کے طور پر نظر آ رہی ہے۔

چنانچہ مفسرین کی ایک بڑی جماعت اجرامِ سماوی میں مختلف قسم کے جانداروں کے وجود کی قائل رہی ہے حالانکہ ان کے دور میں کوئی سائنسی تصور یا اس کا امکان بھی موجود نہ تھا۔ چنانچہ زمخشری، ابنِ کثیر، ابوحیان، امام رازی اور علامہ آلوسی بغدادی وغیرہ نے اپنی تفسیروں میں پوری صراحت کے ساتھ دوسرے سیّاروں میں مختلف قسم کی مخلوقات کا امکان تسلیم کیا ہے۔

امام رازی تحریر فرماتے ہیں۔۔۔۔ یہ بات بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں

میں قسم ہا قسم کے حیوانات پیدا کر رکھے ہوں جو بالکل اسی طرح چلتے پھرتے ہوں جس طرح انسان زمین پر چلتا ہے۔

علامہ شہاب الدّین آلوسی بغدادی نے لکھا ہے کہ یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہر آسمان میں طرح طرح کے حیوانات پھیلے ہوئے ہوں جن کا علم ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اور میری تحقیق کے مطابق ملائیکہ کا اصل مقام سماوات ہے اور دابہ زمین اور سماوات دونوں میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُن تمام جہانوں میں جہاں پر ترقّی یافتہ اور متمدن ''دابہ'' کا وجود ہو وہاں پر نظامِ شریعت بھی نافذ ہو گا۔ اس کی تشریح اس آیت سے نمایاں ہوتی ہے کہ:

کیا تجھے علم نہیں ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں سب کے سب (اپنی زبان حال اور قال سے) اللہ ہی کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور پرندے بھی پر پھیلائے ہوئے ان میں سے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کے طریقے خوب جانتا ہے۔ (نور:۴۱)

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

Cardiac Arrest

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

محبّت کے جذبے بھی بڑے لازوال ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی توڑ تو ممکن ہی نہیں۔ ہم اپنے آس پاس قرب و جوار، دائیں بائیں، ماضی اور مستقبل میں محبّت کی ایسی داستانیں تو سُنتے ہی رہتے ہیں لیکن جس طرح کی محبّت کی باتیں ہم سُنتے ہیں یا جو واقعات دیکھتے ہیں اُن سے ہٹ کر بھی محبّت کے انداز ہیں۔ انسانوں کا باہم امن و بھائی چارے سے آپس میں رہنا بھی محبّت ہے۔

خواتین و حضرات! کچھ محبّت کے انداز ہماری روزمرہ کی زندگیوں سے ہٹ کر بھی ہوتے ہیں، جو عام طور پہ نہیں دیکھ پاتے۔ محبّت کا ایک مطلب اطاعت اور محبوب کی خوشنودی ہوتی ہے۔ انسانوں سے محبّت کا ہمیں خاص طور پر حکم دیا گیا ہے۔ محبّت دلوں پر وہ کام کرتی ہے جو صابن جسم پر اور آنسو روح پر کرتے ہیں۔ محبّت میں مبتلا شخص عام انسانوں سے زیادہ امن پسند اور صلح جو ہوتا ہے۔ زمانۂ

طالبِ علمی میں جب ہم انگریزی زبان سے واقفیت کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے تھے اور کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا جائے، تب ہمیں ایک لفظ نے بڑا ڈسٹرب کیا۔ ہم کئی طالب علم اس لفظ کے بارے میں کئی سال تک لاعلم بھی رہے۔ وہ لفظ تھا "Cardiac Arrest"۔ اس سے ہم سیدھا سیدھا مطلب محبّت میں دل کی گرفتاری کا لیتے رہے جس طرح Cardiac کو 'دل' اور Arrest کو گرفتاری کے معانی میں لیا جاتا ہے۔ جب ہم پر یہ آشکار ہوا کہ اس کا مطلب تو دل کے عارضے میں موت یا ہارٹ اٹیک ہے تو ہمیں بڑی مصیبت پڑی۔

یہ انگریزی زبان بھی بڑی عجیب ہے اس کے بھی بڑے مسائل ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو کسی دَور میں انگریزی زبان کے بڑے دلدادہ رہے ہیں لیکن آج کل انگریزی سے بڑی چِڑ کھاتے ہیں۔ ایک روز یونہی باتوں باتوں میں مَیں نے اُن کی اس بےزاری کی وجہ پوچھی۔

پہلے تو وہ کچھ بڑبڑاتے رہے لیکن میرے اصرار پر کہنے لگے "اشفاق صاحب کیا بتائیں۔ اس انگریزی نے تو میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ کسی زمانے میں وہ کسی خاتون سے محبّت کرتے تھے۔ اس خاتون پر غالب دور کی اُردُو کی زبان کا بڑا

اثر تھا اور مجھے انگریزی سے محبّت تھی۔ وہ مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرتی اور خود کو "ہم" کہتی لیکن میں جب انگریزی زبان کا سہارا لے کر اسے مخاطب کرتا تو اس کے لیے مجھے "You" کا استعمال کرنا پڑتا۔ وہ محترمہ کافی دیر میری اس جسارت کو برداشت کرتی رہی لیکن جب اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو اس نے مجھے کھری کھری سُنا دیں اور کہا کہ میں آپ کو ہر بار "آپ" کہتی ہوں اور آپ ہو کہ ایک عرصے سے مجھے "You" (تم) کہتے ہو اور اس طرح میرے وہ دوست اس محترمہ کو ناراض کر بیٹھے۔ اس کے بعد آج تک ہمارے وہ دوست انگریزی کی صلواتیں سُناتے ہیں۔"

خواتین و حضرات! مجھے ذاتی طور پر محبّت میں گرفتار ہونا یا محبّت میں مبتلا ہونے کی ترکیبیں کبھی بھی پسند نہیں آئیں کیونکہ آدمی گرفتار یا مبتلا تو بیماری میں ہوتا ہے۔ فکر میں ہوتا ہے یا پھر خوف میں۔ پھر محبّت تو ایک لطیف جذبہ ہے۔ محبّت کا گرفتاری سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اگر محبّت میں گرفتاری کے معاملے کو دیکھا جائے تو یہ معاملہ تو یوں بنتا ہے کہ کوئی آدمی بڑی شرافت سے لٹھّے کا سوٹ پہن کر چلا جارہا ہے اور وہ اچانک گرفتار کر لیا جائے یا کوئی شخص عام حالات سے کسی مشکل میں مبتلا ہو جائے۔ محبّت کے لیے ہمیشہ وقت درکار ہوتا ہے۔ یہ پروان

چڑھنے میں وقت لیتی ہے جیسے ایک پودا پروان چڑھنے میں وقت لیتا ہے۔ رات کو بیج بو دینے سے اگلی صبح تک پودا تیار نہیں ہوتا اس کے لیے زمین اچھی کھاد، مناسب آب وہوا، مناسب توجّہ اور اعلیٰ غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔

خواتین و حضرات! میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلی نظر کی محبّت پر میں یقین ہی نہیں رکھتا۔ یہ ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے لیکن پہلی نظر کے بعد اس کو بھی وقت چاہیے ہوتا ہے۔ پہلی نظر میں اچھا لگ سکتا ہے لیکن پھولوں سے یا پھلوں سے لدا پھدا اور جھومتا پودا بننے کے لیے اس کو بھی وقت درکار ہوتا ہے اور اس کے ساتھ خصوصی توجّہ بھی۔

ایک بار جمعہ کی نماز سے قبل میں ایک بابا جی کے پاس بیٹھا تھا اور سپیکر میں ایک مولانا تقریر کر رہے تھے۔ وہ بابا جی کافی دیر خاموشی سے مولانا کی تقریر کو توجّہ سے سُنتے رہے پھر اچانک مجھ سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ "مولانا جو لوگوں کو خُدا سے ڈرا رہے ہیں (وہ مولانا دوزخ کی سزاؤں کے بارے بتا رہے تھے) اور بڑے بڑے سانپوں اور دہکتی آگ کا ذکر کر رہے ہیں۔ کیا یہ مسجد میں آئے ان لوگوں کو یہاں سے بھگانا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا" بابا جی اس میں بھگانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ لوگوں کو شاید اس لیے خوف دلا رہے ہیں کہ وہ بُرے کاموں سے اجتناب کریں۔"

بابا جی کہنے لگے کہ "کیا مسجد میں لوگ خدا کے ڈر سے نہیں آتے اور کیا وہ بُرے کاموں سے اجتناب خدا کی محبّت میں نہیں کر سکتے۔" (اب میں انہیں کیا جواب دیتا)۔

وہ کہنے لگے "کاکا ایک خدا جو انسان سے سات ماؤں سے زیادہ محبّت رکھتا ہے۔ جس مٹی کے پتلے کو اس نے بہترین ساخت پر بنایا ہے کیا وہ سات ماؤں کا پیار ایک طرف رکھ کر انہیں دہکتی آگ میں پھینکے گا۔"

"پتر ماں تاں اک مان نئیں ہندی"

اب نہ اس بابا جی کا فلسفہ تھا جو خدا تعالیٰ کی محبّت کو سب چیزوں پر ترجیح دے رہے تھے۔ محبّت کے اپنے درجات اور رنگ ہوتے ہیں۔ میں زیادہ تو اس بارے نہیں جانتا کیونکہ مجھے تو دنیا سے ہی محبّت رہی اور میں دنیاوی معاملات کو حل کر کے آسودہ زندگی کی محبّت میں ہی سرشار رہا لیکن بابے کہتے ہیں کہ محبّت کی منازل طے کر کے ہی ہم اپنی روح تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور روح تک پہنچنے کے لیے

ضروری ہے کہ ہم کچھ وقت اپنے آپ کو دیں۔ ایسا وقت جس میں ہم اپنے آپ سے ہم کلام ہوئیں۔ ہمارے بابا جی محبّت کے معاملے پر بہت زور دیتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ہمارے مسائل کا واحد آسان حل یہ ہے کہ ہم سب ایک دوسرے سے محبّت کریں۔ ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کریں اور باہمی بھائی چارے کی وہ راہ اپنائیں جس کا درس حضور نبی اکرم نے مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں دیا تھا۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ ہماری مالی مشکلات حل ہوں گی تو ہم نماز بھی پڑھیں گے۔ انسانیت سے محبّت بھی کریں گے۔ حقیقت میں میرے جیسے لوگوں کا بہانہ ہے۔ لوگوں کو توقیر بخشے اور محبّت کرنے میں تو کوئی رسید نہیں دینا پڑتی۔ نہ کوئی اکاؤنٹ کھلوانا پڑتا ہے۔ بس آپ نے چند میٹھے الفاظ بولنے ہیں۔ ماتھے سے شکنیں ختم کرتی ہیں۔

میرے ایک دوست ہیں وہ جب دفتر جاتے ہیں اپنے ماتحتوں یا سٹاف سے معاملات کرتے ہیں تو ایک الگ طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ عینک ناک سے ذرا نیچی رکھتے ہیں۔ ماتھے پر شکنیں ڈال کر رکھتے ہیں۔ کسی کے سوال کا انتہائی مختصر جواب دیتے ہیں اور ایک طرح کے راہب بننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب وہ گھر پر ہوتے ہیں تو ایک الگ اور بدلے ہوئے آدمی معلوم پڑتے ہیں۔ بڑی

حلیم طبیعت کے خوش مزاج انسان۔

پاکستان بننے کے چند سال بعد کی بات ہے۔ ہمارا ایک ساتھی ریڈیو چھوڑ کر ایک ایسی ملازمت سے وابستہ ہو گیا جس میں اس کی تنخواہ ریڈیو کے مقابلے میں کم از کم دگنی تھی۔ وہ چار پانچ سال اس ملازمت سے وابستہ رہا اور ایک روز اچانک پھر واپس ریڈیو آ گیا۔ ہم سارے اس کے گرد جمع ہو گئے اور واپس آنے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا "جس پیشے سے تمہیں محبّت ہو اسے اختیار کرتے ہوئے خوشی کا بے بہا خزانہ میسّر آتا ہے لیکن جو پیشہ پسند نہ ہو اس میں آمدنی چاہے زیادہ ہو تو اس صورتحال میں روٹی کپڑا اور مکان کے ساتھ ساتھ خوشی بھی خریدنا پڑتی ہے۔" وہ کہنے لگا کہ تم تو جانتے ہو کہ "خوشی مہنگی ہوتی ہے۔ اس پر ہر ماہ بہت زیادہ خرچ ہو جاتا ہے۔ محبت کرنے والے تخلیقی لوگ ہوتے ہیں۔ محبّت صرف انسان ہی نہیں کرتے جانور بھی کرتے ہیں۔ آپ کچھ جانوروں کو چاہے طویل چاہے مختصر مدّت کے لیے اکٹھا رکھیں پھر اُن میں کسی جانور کو علیحدہ کریں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کی جدائی پسند نہیں کریں گے۔ شور مچائیں گے، بلائیں گے۔ انسانوں اور جانوروں کی طرح پودے بھی ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہیں۔ اس محبّت کی گفتگو میں ہم ماں کی محبّت کو کسی صورت نظر

انداز نہیں کر سکتے۔ یہ بہت خوبصورت رشتہ ہوتا ہے۔ اس کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا۔ محبّت کی اس داستان میں مٹّی کی محبّت کا باب جب تک شامل نہ کریں بات نہیں بنتی ہے۔"

خواتین و حضرات! مٹّی کی محبّت کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ اپنی مٹّی سب کو پیاری ہوتی ہے لیکن آج کل ہمارے ہاں ایک اور ہی روش شروع ہو گئی ہے۔ ایک صاحب ڈیفنس میں ایک بڑی کوٹھی بنوا رہے تھے اور مجھے کہہ رہے تھے کہ یار اشفاق صاحب آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں اور کسی بھی فارن کنٹری جا کر رہ سکتے ہیں۔ چھوڑیں یہاں کیا رکھا ہے۔ ایسی باتیں سُن کر تکلیف پہنچتی ہے کہ یہ کس قسم کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ قومیں اپنی مٹّی اور وطن کے لیے جانوں کے نذرانے دے دیتی ہیں اور ہم ہیں کہ اپنی ہی مٹّی اور لوگوں کو کوستے ہیں۔ شاید ایک قسم کا فیشن بن گیا ہے۔

خواتین و حضرات! ہم محبّت کو مادی حوالوں سے زیادہ لے لیتے ہیں حالانکہ محبّت، ہمدردی اور اُن کے رشتے مال و دولت کے قطعی محتاج نہیں ہوتے۔ ہمارے کئی دوست، احباب، رشتہ دار ہم سے وقت مانگتے ہیں۔ ہماری قربت میں رہنا چاہتے ہیں۔ وہ خواہش کرتے ہیں کہ ہم اپنا کچھ وقت اُن کے ساتھ رہ کر گزاریں۔ پلّے

سے کچھ نہیں دینا ہے۔بس اپنا وجود انہیں سونپنا ہے۔

استانی زینب بتاتی ہے کہ جب وہ بیوہ ہوئی تو میرے سسرال والوں نے مجھے اور میرے بیٹے طارق کو گھر سے نکال دیا اور اس وقت ہمارے پاس مکان کا کرایہ تک دینے "جوگے" (کے لیے) پیسے نہیں تھے تو ہم نے چودھری صاحب جنہوں نے گھر سے نکالا تھا ان کے گھر کے قریب نہایت خستہ حالی کی زندگی گزارنی شروع کر دی۔ کچھ دن کے بعد یہ خبر ملی کہ چودھری کا بیٹا علی گھر سے بھاگ گیا ہے۔ اُستانی زینب کہنے لگی کہ وہ یہ خبر سُن کر بہت حیران ہوئی اور اپنے بیٹے طارق سے کہا کہ علی کے گھر میں سب کچھ ہے، گھوڑا، گاڑی، موٹریں، فریج الغرض آسائش کی ہر چیز میسر ہے۔ نوکر چاکر بھی ہیں پھر وہ گھر سے کیوں بھاگ گیا۔

طارق نے کہا "امّاں علی کے پاس بڑا خوبصورت اور آرام دہ ماحول تھا مگر محبّت نہیں تھی اس لیے وہ محبّت کی تلاش میں گھر سے بھاگ گیا۔ ہمارے ہاں بہت پریشان کُن ماحول ہے لیکن محبّت کی فراوانی ہے اس لیے ہم ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور اس ماحول سے بھی بندھے ہوئے ہیں۔"

جانوروں اور انسانوں میں ہی محبّت کا رشتہ موجود ہوتا ہے۔ مغرب والے تو خیر ان کی محبّت میں بہت ہی آگے نکل گئے ہیں۔ کتّوں میں تابعداری کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے لوگ انہیں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپ کتّے کو ماریں، اپنے سے علیحدہ کریں وہ دُم ہلائے گا اور آپ کے ساتھ لگا رہے گا۔ اس کی محبّت اور وابستگی کا انداز بھی دنیا سے نرالا ہے۔ کتّا نہ تو حسن و جمال اور شکل و صورت کا عاشق ہے اور نہ ہی وہ کسی سے اس کے بینک بیلنس کے باعث محبّت کرتا ہے۔

جب کتّے کی وفاداری کا تذکرہ چل نکلا ہے تو یہ بات بھی بڑی غور طلب ہے کہ اگر آپ کتّے سے پیار محبت کا اظہار کریں، اسے تھپکی دیں تو وہ آپ کو دیوتا سمجھنے لگے گا۔ لیکن اگر آپ بلّی سے تھوڑی دیر پیار کریں، اسے سہلائیں، تھپکیاں دیں تو وہ خود کو دیوتا سمجھنا شروع کر دیتی ہے۔ آپ ضرور اس بات کا مشاہدہ کر کے دیکھئے گا۔

بچّو! محبّت کی داستانوں کے سلسلے بہت طویل ہیں۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

دو گولی ڈسپرین اور یقینِ کامل

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

سرکار کے کام بھی بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ یہ ایسے کام ہوتے ہیں جن میں مداخلت سے انسان قانون کی زد میں بھی آسکتا ہے۔اس لیے کوئی شریف آدمی کارِ سرکار میں آڑے آنے کی ہمّت نہیں کرتا۔ دوسرا ہم اپنے سارے مسائل سرکار کے ذمّہ لگاکر اپنا پلّو مکمل طور پر چھڑا لیتے ہیں حالانکہ یہ کسی جگہ درج نہیں ہے کہ انسان کی توقیر یا عزّت کرنے کے لیے کسی تھانیدار کی یا آئین میں ترمیم ضروری ہے یا اس کے لیے اخبار میں باقاعدہ طور پر اشتہار جاری کرنا پڑے گا۔ کچھ کام انسان کے انفرادی طور پر بھی کرنے کے ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت ہر لحاظ سے بری الذّمہ ہوتی ہے۔ اس کے ذمّے بھی بڑے کام ہیں۔ اسمبلیوں میں بیٹھنا، مہنگائی پر قابو نہ پانا جیسے دیگر کئی کام حکومت کے ذمّہ ہیں۔ (مُسکراتے ہوئے)

خواتین و حضرات! جب ہم اس مشکل دَور کی بات کرتے ہیں اور مہنگائی کے خلاف بہت زیادہ بولتے ہیں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ ایک عام مزدور، پیشہ اور سرکاری ملازم کی گزر بسر بہت مشکل سے ہو رہی ہے اور وہ بہت گھٹن میں ہے لیکن جیسے ہی کسی کمپنی کی گاڑی کا نیا ماڈل آتا ہے وہ چشمِ زدن میں سڑکوں پر آجاتی ہے اور آپ بھی غور کیجیئے گا آپ کو سڑک پر کسی بڑی شاہراہ پر نئے ماڈل کی گاڑیاں ہی ملیں گی۔ ایک مزے کی بات یہ بھی ہے کہ ان نئے ماڈل کی گاڑیوں میں بیٹھے لوگ بھی مہنگائی کا رونا رو رہے ہوتے ہیں اور حکومت پر بڑی تنقید کرتے ہیں۔

میں نہ تو اس تنقید کے خلاف ہوں اور نہ ہی حق میں ہوں کیونکہ بیچاری حکومت کے بھی مسائل ہوتے ہیں۔ انہیں بھی سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ میرے گھر کی طرف جو سڑک جاتی ہے وہ ایک بار نئی بنی تو میں بڑا خوش ہوا کہ چلو اچھا ہوا اب سڑک نئی بن گئی ہے لیکن خواتین و حضرات اگلے دن جب میں سڑک پر آیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کئی مزدور بھالے اور سڑک کھودنے کا دیگر سامان اٹھائے اس نئی نویلی سڑک کو کھودنے میں مصروف ہیں۔ میں نے گاڑی سے مُنہ باہر نکال کر اُن سے پوچھا کہ وہ نئی سڑک کو کیوں اس طرح ادھیڑ

رہے ہیں تو وہ کہنے لگے کہ "صاحب سوئی گیس کی پائپ سڑک سے دوسری طرف لے جانا ہے۔"

مغرب جس کی زیادہ تعریف کرنا مجھے کچھ زیادہ اچھا بھی نہیں لگتا اور آپ کو بھی نہیں لگتا ہوگا کیونکہ ہمیں اپنی مٹّی بڑی پیاری ہے اور ہم نے اسے کئی جانوں کے نذرانے دے کر حاصل کیا ہے۔ اس کی بنیادوں کو اپنے نوجوانوں، بڑوں، بوڑھوں اور خواتین کے خون سے سینچا ہے۔ اس کے خلاف کچھ کہنا یا سُننا ہمیں گوارا نہیں ہے لیکن حقیقت ہے کہ وہاں تعمیرات یا اپنے عوام کو سہولتیں دینے کے حوالے سے کچھ ضروری تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔ میں اٹلی میں بہت عرصہ رہا۔ وہاں اگر کوئی نئ سڑک بنی ہو تو اس کی تعمیر کا ٹینڈر پاس ہونے سے پہلے سڑک سے متعلق تمام کاموں (ظاہر ہے ان میں گیس، فون، سینی ٹیشن وغیرہ سب شامل ہیں) سے پہلے اس حوالے سے معلومات اکٹھی کی جاتی ہیں کہ سڑک تعمیر ہو رہی ہے، کسی محکمے کو اگر اپنے متعلقہ کام کرنا ہے تو بتایا جائے کہ کتنی مدّت لگے گی۔ اس کے بعد سڑک تعمیر ہوتی ہے اور اتنی عمدہ سڑکیں ہیں کہ بارش کے چند منٹ بعد آپ باہر نکلیں تو سڑکیں آپ کو صاف اور اُجلی ملیں گی۔ کہیں پانی کھڑا ہوا نہیں ہوگا۔

خبر بات کارِ سرکار کی ہو رہی تھی اور اپنی مٹّی کی۔

سرکاری کام کا اندازہ اس سے لگاتے ہیں کہ یونین کونسل نے اپنے خرچ پر ایک پُل تعمیر کیا۔ تعمیر کر چکنے کے بعد کمیٹی نے ضرورت محسوس کی کہ اس پُل کی نگہداشت کے لیے ایک چوکیدار کی ضرورت ہے۔ چوکیدار مقرر ہو گیا۔ اب اس کی تنخواہ بھی دینی تھی۔ کونسل نے پھر ہنگامی میٹنگ بلائی جس میں طے کیا گیا ایک اکاؤنٹنٹ بھی بھرتی کیا جائے جو اس کی تنخواہ کا حساب رکھے اور وقتِ مقررہ پر تنخواہ ادا کرے۔ چنانچہ وہ بھی مقرر ہو گیا۔ پھر ضرورت محسوس کی گئی کہ اِن کے کام کی نگرانی کے لیے ایک ایڈمنسٹریٹر بھی ہونا چاہیے۔ اسے بھی رکھ لیا گیا۔ چند سال ایسے ہی کام چلتا رہا پھر کونسل کو اپنے اخراجات میں کمی کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے چوکیدار کو نوکری سے نکال دیا۔

ٹھیک ہے حکومتوں کی بھی بڑی ذمّہ داریاں ہوئی ہیں لیکن کچھ ذمّہ داریاں ہماری اپنی بھی ہیں کہ ہم اپنے آپ، اپنے اِرد گرد اور اپنے لوگوں کے لیے انفرادی طور پر کیا کرتے ہیں۔ اس قومی وحدت کو اندیشوں اور نظرِ بد سے بچانے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ آپ یقین مانئیے کہ مجھ سے اس قومی وحدت کے لیے کچھ نہیں ہو سکا۔ میں نے شاید اس کے لیے اپنے کردار کی ضرورت ہی محسوس نہیں

کی یا پھر میں اپنے جھمیلوں سے ہی نہ نکل سکا لیکن ایک بات میری روح پر ضرور بوجھ ڈالتی ہے جب میں کہیں پانی کا کوئی فضول کھلا ہوا نَل یا کوئی بجلی کا بلب بِلا ضرورت جلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے دل میں سے یہ آواز آتی ہے کہ اگر یہ نَل یا بلب بلاوجہ چل رہا ہے تو ملک میں یہ کسی نہ کسی کا حق تھا جو اس سے محروم ہو رہا ہے۔

اس ملک کو بناتے وقت جس عزّت اور احترام کا لوگوں کو خواب دکھایا گیا تھا وہ ابھی تک تو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا ہے۔ ہم اپنے معاملات یا مسائل میں کچھ زیادہ الجھ کر رہ گئے ہیں یا پھر ہمیں جان بوجھ کر کسی نے الجھا رکھا ہے۔ کچھ ایسے لوگ ہم میں گھسے بیٹھے ہیں جو ہمارے اپنے نہیں ہیں۔ جو شروع دن سے اس پاک سرزمین کے خلاف ہیں اور میلی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اگر خود کچھ نہیں کر سکتے تو ہم میں باہمی انتشار پھیلا کر اس قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی ترکیبیں سوچتے ہیں لیکن مجھے یقینِ محکم ہے کہ انہیں خود مُنہ کی کھانی پڑے گی۔ ایک بار ایک محفل میں مَیں نے مٹّی یا زمین کے بڑے خواص گنوائے اور کہا کہ کیا بات ہے کہ یہ مٹّی ہمیں گندم دیتی ہے۔ کئی فصلیں دیتی ہے۔ ہماری زمین کے سینے میں معدنیات دفن ہیں۔ سونا اور تیل ہم نکال لیتے ہیں اور زمین کا ہم پر یہ بہت

بڑا احسان ہے۔

اس محفل میں ایک پروفیسر صاحب بھی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے اشفاق صاحب یہ زمین اگر ہمیں کچھ دیتی ہے تو احسان نہیں کرتی اپنا قرض اُتار رہی ہے۔ میں نے کہا کہ پروفیسر صاحب آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم ماشاء اللہ گندم میں خود کفیل ہیں۔ بہت سا غلّہ پیدا کرتے ہیں جو کروڑوں انسانوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے جناب اشفاق صاحب ہم نے بھی اس مٹّی اور زمین کو قائداعظم، علّامہ اقبال جیسے دماغ اور نوجوان خون کے جذبے عطا کیے ہیں۔ اگر یہ ہمیں اس کے بدلے میں کچھ دیتی ہے تو قرض لوٹاتی ہے۔ وافر یا مفت میں کبھی نہیں دیتی۔ نظرِ بد رکھنے والے لوگ ہمارے باہمی اتفاق و اتحاد کے خلاف ہیں۔ وہ بظاہر ہم سے بغلگیر ہوتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے دوسرے ہاتھ میں نفرت، حسد کے خنجر پکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک بھائی کو دوسرے سے لڑاتے ہیں۔ لالہ روپ کے شوری افغانوں اور انگریزوں کی لڑائی کی ایک یادگار فلم بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔ انہوں نے ڈائریکٹر سے کہا کہ لڑائی کا سین بھرپور ہونا چاہیے۔ دو ہزار آدمی اس طرف اور دس ہزار دوسری طرف۔ کم سے کم بیس ہزار ایکسٹرا کا بندوبست کیجئے۔

”لیکن شوری صاحب ہم بیس ہزار لوگوں کی پے منٹ کیسے کریں گے۔“ ڈائریکٹر نے پوچھا۔

شوری صاحب کہنے لگے ”اس کی فکر نہیں۔“

ڈائریکٹر نے پوچھا کہ ”سر کیسے؟“

”ہم دونوں پارٹیوں کو اصلی بندوقیں اور دس دس گولیاں دیں گے۔“ کہ شوری صاحب نے جواب دیا۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کی صورتحال ہے۔ افغانستان میں ہم نے سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑی۔ اس جنگ کی قیمت بھی چکائی۔ لاکھوں افغان بھائیوں کو اپنے وطن اور بھائیوں جیسا پیار دیا لیکن اس نظرِ بد اور خفیہ دشمن ہاتھ کے باعث افغانستان ہم سے ناخوش ہے اور وہ کارِ سرکار تو کیا ہمارے باہمی رشتوں میں دراڑیں ڈالنے کے لیے مداخلت کر رہا ہے۔ جس سے ہمیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس وطن کے ایک ایک ذرّے کی قدر کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایک قطرہ پانی کی اہمیت جاننے کی ضرورت ہے۔ کوئی چیز بے کار نہیں ہے یا حقیر نہیں ہے۔ جو قومیں ترقّی کو پہنچتی ہیں وہ اپنی مٹّی کی قدر اور اتفاق کی بدولت اور سخت محنت کے باعث ایسا کرتی ہیں۔ ایسے ہی

راتوں رات وہ ترقّی یافتہ نہیں بن جاتی ہیں۔ ایک ایک بلب کو بلا ضرورت بجھانے میں پہل کرتی ہے۔ اپنے وسائل کا بے دریغ استعمال نہیں کرتیں۔ چوکنی ہو کر چلتی ہیں۔

ایک کلرک نے جب اڑھائی ہزار کی ادائیگی کرتے وقت رسیدی ٹکٹ کے لیے چونّی طلب کی تو صاحب بہت بگڑے اور جھگڑا کرنے لگے۔ کلرک نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ سمجھے۔ آخر انہوں نے زچ ہو کر کہا "میاں چونّی کی خاطر کیوں مرے جاتے ہو۔"

کلرک نے خوش دلی سے کہا "سر یہ وہی چونّی ہے جس کے لیے آپ مَرے جاتے ہیں۔ میں اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔"

اپنے وطن کی قدر اور اسے اپنا جان لینے سے ہی بات بنے گی اور باہمی اعتماد ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر لا سکتا ہے۔ ہم میں اعتماد کا فقدان ہو چکا ہے لیکن ختم نہیں ہوا۔ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے محبّت کا درس دیتا ہے۔ ہم بِن دیکھے خدا پر ایمان رکھتے ہیں اس جذبے اور یقین کو کامل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس بات کا تو یقین ہے کہ دو گولی ڈسپرین سے سر درد کو فوری آرام

مِل جائے گا۔ فلاں ہارٹ سرجن اگر آپریشن کرے گا تو مریض مر نہیں سکتا چاہے وہ کچھ دیر کے لیے مریض کے سینے سے دل باہر ہی نکال کر کیوں نہ رکھ دے۔ لیکن ہمیں اس بات پر یقین نہیں ہوتا ہے کہ فلاں آیتِ مبارکہ پڑھنے سے سر درد کو فوری آرام مل جائے گا یا رزق میں برکت آئے گی۔ اس بات پر یقین نہیں کہ صدقہ دینے سے اس کا ۱۰ فیصد اضافہ دنیا اور ۷۰ فیصد آخرت میں اضافہ ملے گا۔ اگر صرف اس ایک بات پر عمل پیرا ہو جائیں گے ہم انفرادی طور پر اپنے مالوں سے صدقہ خیرات کرنا شروع کر دیں تو یقین کیجیے کہ کوئی محتاج یا زکوٰۃ لینے والا نہ رہے۔ ہم اگر باہمی اتحاد کا مظاہرہ کریں، مٹّی سے پیار اپنے عقیدے میں شامل کر لیں اور خدا کی مکمل رحمت پر یقین کر لیں تو ہم ایسے بالکل نہ رہیں گے جیسے آج ہیں۔ اگر ہمیں دو گولی ڈسپرین سے زیادہ یقین اپنے رب پر آ جائے اور ہم سرکار کو ایک طرف رکھ کر اپنے مسائل کی بابت خود سوچنے لگیں تو ہم زیادہ خوش و خرم اور توانا ہو جائیں گے۔ بات آنکھیں بند کر کے مکمل اور کامل یقین کی ہے اور اس یقین میں کوئی شک و شبہ یا وہم نہ ہو۔ ہمارا دل، جسم، یک زبان ہو کر خدا کی قدرت پر یقین رکھ کر تھیا تھیا ناچ رہے ہوں۔ پھر کسی میں نہ ہمیں جُدا کرنے کا یارا ہو گا اور نہ ہمیں کسی پر تنقید کی ضرورت ہو گی۔ ہمارا نفس مطمئن ہو گا اور ہم بھی پریشان حال نہ ہوں گے۔

آپ میرے لیے بھی دُعا کیجیے گا کہ میں بھی دو گولی ڈسپرین کی بجائے اپنے قادرِ مطلق پر زیادہ یقین کر لوں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

صاحب السیف (Warrior)

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

ایک جنگ آور، جنگجو، بہادر، دلاور یا Warrior ہر وقت اپنی تلوار ساتھ لے کر چلتا ہے۔ تلوار کی موجودگی اور سیف کی قربت اس بات کی گواہی ہے کہ جنگجو ہر وقت چوکس اور سینہ سپر ہے اور ہر وار سہنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کا جواب دینے کا یارا رکھتا ہے۔ کوئی بھی جنگجو کبھی اپنی تلوار سے جُدا نہیں ہوتا۔ آپ فلموں اور ڈراموں میں بھی دیکھتے ہوں گے کہ کس طرح فوجوں کے سپہ سالار جنگجوؤں نے اپنی تلواروں کے دستوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بچّے جو ٹی وی پر ٹیپو سلطان کا ڈرامہ دیکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح جنگجو تلواروں کے دستے نکال کر رکھتے ہیں اور انتہائی چوکسی کی حالت میں ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایسے سین جو ڈراموں میں دکھائے جاتے ہیں ان میں جو بادشاہ یا کسی حاکم کے دربار میں پکڑ کر ملزم یا دوشی لایا جاتا ہے وہ بادشاہ کی آنکھوں کے

اشاروں سے بھی خوفزدہ ہو کر تھر تھر کانپ رہا ہوتا ہے اور وہ بادشاہ کے خاص فوجی یا جسے جلّاد کہتے ہیں اس کے اس ہاتھ پر توجّہ اور نظریں مرکوز رکھے ہوئے ہوتا ہے جو تلوار کے دستے پر پڑا ہوا ہوتا ہے۔ہالی وُوڈ کی فلم ”Brave Heart“ جیسی تاریخی نوعیت کی فلم جس میں اس فلم کے ہیرو Mel Gibson (یہ سکاٹ لینڈ کی فتح کے حوالے سے فلم تھی اور اس کے حقیقی ہیرو کا نام مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔) اس فلم میں ہیرو کا آہنی ہاتھ جس انداز سے اپنی تلوار کے دستے پر رہتا ہے وہ قابلِ دید ہے۔اس کے علاوہ فلم ”Lord of the Ring“، ”The Gladiator“ اور پیٹریاٹ بھی فلموں میں ڈائریکٹروں نے نہایت فنِ کمال سے جنگجوؤں کو دکھایا ہے۔یہ بات کرنے کا مقصد ہالی وُوڈ کی فلموں کی نمائش یا تعریف کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ موضوع سے متعارف کروانا ہے۔

جنگجو فریقِ مخالف سے ڈائیلاگ یا بات کرتے ہوئے درمیان میں سیف رکھ کر دوسرے فریق سے بات کرتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرا فریق اُسے دھمکا نہیں سکتا۔لالچ نہیں دے سکتا۔احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ اس طرح رشوت دینے والا معاملہ طے کرتے وقت درمیان میں رکھی ہوئی سیف دیکھ کر کسی قسم کا سودا کرنے سے عاری یا انکاری ہو جاتا ہے۔ہمارے ایک

دوست ہیں وہ قسم کھاتے ہیں جو انہوں نے کبھی رشوت لی ہو۔ اُن کا کہنا ہے کہ رشوت کبھی انہوں نے اپنے ہاتھ سے نہیں لی البتہ اگر کوئی اپنے کام کے عوض کچھ رقم اُن کے پی اے کو دے جائے تو مضائقہ نہیں لیکن وہ

کبھی اپنے ہاتھ سے رشوت وصول نہیں کرتے اور ان کے نزدیک یہ انتہائی ناپسندیدہ فعل ہے۔ میں ایسے بھی ایک صاحب کو جانتا ہوں جو اُوپر کی کمائی (رشوت) کو گھر لے کر نہیں جاتا۔ اس کی کمائی کو وہ اپنے دوستوں میں خرچ کرتے ہیں۔ اپنے اُوپر لُٹاتے ہیں یا دعوتوں کی نذر کرتے ہیں۔ گھر کے لیے سودا سلف، چینی، آٹا، نمک اپنی تنخواہ کی رقم سے لے کر جاتے ہیں۔ وہ ایک طرف یہ تسلیم بھی کرتے ہیں کہ وہ حرام کی کمائی بچّوں کے مُنہ میں نہیں جانے دیں گے اس کے باوجود رشوت لیتے بھی ہیں اور جی بھر کر لیتے ہیں اور دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں رشوت لینے کا ایک خوبصورت اور Safe طریقہ تحائف کا وصول کرنا بھی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کو تحائف دینے کی بہت ہدایت کی گئی ہے لیکن تحائف میں فرق ہوتا ہے۔ اگر کوئی پولیس والا کسی مجرم سے اُسے چھوڑنے کے عوض کوئی تحفہ وصول کرے گا تو کیا ہم اسے بھی تحفہ ہی قرار دیں

گے۔

جس معاشرے سے عدل چلا جائے وہاں امن و امان کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس حوالے سے غور کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ اٹلی کا شہر نیپلز بھی بڑا مستانہ شہر ہے۔ ہر وقت راگ رنگ میں ڈوبا رہتا ہے اور ساحلی مزدور یہاں زیادہ کام کرنے کے عادی بھی نہیں ہیں۔

جب میں پہلی مرتبہ وہاں پہنچا تو میونسپل کمیٹی کے دفتر کے سامنے ایک اشتہار لگا کہ شہر میں کچھ چیزیں لاوارث اور بے ملکیتی پڑی تھیں۔ شہر کے میئر نے ان چیزوں کے حوالے سے باقاعدہ ایک اپیل درج کی ہوئی تھی۔

"شہر میں یہ چیزیں بے ملکیتی پڑی ہیں۔ مہربانی فرما کر اِن کے مالک توجّہ فرمائیں۔ ایک ٹریکٹر، دو گرھے، تین قبروں کے پرانے کتبے، دو ڈبل بیڈ، ایک آئس کریم کی گھریلو مشین، ایک چینی کا ٹب، ایک بڑا سوٹ کیس میں پرانے Love Letter ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے ہیں، لیکن اُن کی سیاہی ماند پڑ چکی ہے اور سترہ پرانی پتلونیں۔۔۔ ان چیزوں کے مالک توجّہ فرمائیں اور براہِ کرم انہیں اپنے تصرّف میں لائیں۔"

ایک یہ بھی انداز ہے۔ دنیا ہے۔ وہاں بھی جرائم ہوتے ہوں گے لیکن کتنا ہی اچھا ہو کہ ہمارے ہاں بھی ایسا ہی کلچر فروغ پا جائے۔ ایسے ماحول کا دَور دورہ ہو۔ کوئی شخص اپنی تکلیف درج کرانے ناظم کے پاس نہ جائے۔ کسی کی بکری گُم نہ ہو اور اسے تھانیدار کے پاس جانے کی ضرورت نہ پڑے۔ کسی کو اخباروں میں Letter to Editor لکھنا نہ پڑے۔

میں غمناک کہانیاں پڑھنے سے بھی ڈرتا ہوں۔ اگر کوئی داستان یا کتاب مجھے پڑھنے کو ملے تو میں سب سے پہلے اس کا آخری صفحہ پڑھتا ہوں۔ اگر اس صفحہ پر لکھا ہو کہ اس کے بعد سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ تو میں اس کتاب کو ضرور پڑھتا ہوں وگرنہ ہاتھ تک نہیں لگاتا۔

بات صاحب السیف کی ہو رہی تھی۔ صاحب السیف کسی کی باتوں میں نہیں آتا۔ اس میں قائدانہ صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ دکھوں، غموں اور خواہشوں کے آگے سر تسلیم نہیں کرتا بلکہ یہ چیزیں اس سے دُور بھاگتی ہیں۔ وہ ان چیزوں کا اپنی روح پر غلبہ محسوس نہیں کرتا ہے۔ اس کے اندر ایک خاص قوّت ہوتی ہے جو لالچ اور فریب سے موم نہیں ہوتی۔ صاحب السیف وہی ہے جو اپنے نفس کو اپنے اندر کی قوّت سے قابو کر کے رکھتا ہے۔ روک کر رکھتا ہے۔ پکڑے رکھتا

ہے۔ صاحب السیف مشکل مرحلے کو طے کرنے اور کسی نتیجہ پر پہنچے کے لیے اپنی موت سے سوال کر کے جواب معلوم کرلیتا ہے۔ موت کا خوف اس کے دل میں نہیں ہوتا ہے بلکہ جنگجو موت کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ موت اس کے پہلو میں بائیں جانب پانچ فٹ کے فاصلے پر رواں دواں ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کرتی ہے اور اس کی سیکورٹی کی ذمّہ دار ہوتی ہے۔ موت کا خوف بھی انہیں لوگوں کو زیادہ ہوتا ہے جو مرنا نہیں چاہتے ہیں۔ جو موت سے نہیں ڈرتے، وہ راتوں کی نیند میں اس خوف میں حرام نہیں کرتے ہیں۔ وہ زندگی میں بھی نفسِ مطمئنہ کو پاتے ہیں اور مَر کے بھی۔ انسان جس چیز سے خوف کھاتا ہے یا اسے پسند کرتا ہے یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان کی آنکھیں اسے قریب پا کر روشن ہو جاتی ہیں یا بجھ جاتی ہیں۔

چینی جوہری ہیرے جواہرات دکھاتے ہوئے گاہک کی آنکھوں پر نظر رکھتے ہیں۔ جس جواہر پر گاہک کی آنکھیں روشن ہو جائیں یہ وہی چیز ہوتی ہے جو گاہک نے لینی ہوتی ہے۔ اس کی تعریف وہ سُننا چاہتا ہے اور اسی کو بیچ کر انھوں نے پیسے لینے ہوتے ہیں۔ صاحب السیف کو کوئی چیز مسحور نہیں کر سکتی۔ اس کا مقصد اس کی اوّلین ترجیح ہوتی ہے۔ وہ جنگجو اپنی اڑائی ہی نہیں لڑ رہا ہوتا ہے بلکہ اس کے کئی

مقاصد ہوتے ہیں۔ وہ کسی سلطنت سے غیر ملکی قبضہ کو خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔
اپنی روح اور وجود پر خواہشات کے غلبے کی سرداری کے خلاف جنگ بھی ہو
سکتی ہے۔ شیر کو اپنے شکار سے بڑی محبّت ہوتی ہے۔ وہ اس کی تلاش میں اور اس
کے عشق میں دیوانہ ہوتا ہے۔ وہ سارے گلے میں سے ایک ہرن، ایک نیل
گائے یا ایک زیبرے کو شکار کرتا ہے لیکن وہ سب میں سے کسی ایک کو محبوب
گردانتا ہے اور گلے لگاتا ہے۔ وہ ابھرا، بھاگا اور نیل گائے کا تعاقب کرنے لگا۔
دونوں آگے پیچھے نہیں دوڑے، نیل گائے ناک کی سیدھ میں جارہی ہوتی ہے
جبکہ شیر اس کے دائیں ہاتھ بڑے فاصلے پر بھاگتا ہوا ایک قوس بناتا گیا اور پھر
سیدھی لکیر بھاگنے والی نیل گائے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ اس قدر تیزی میں
تھی کہ راستہ بدل سکی نہ "کنّی" کاٹ سکی اور شیر نے ابھر کر اپنی دونوں باہیں اُس
کے گلے میں ڈال دیں۔ پھر اُس نے اپنے محبوب کو زمین پر گرا لیا اور اس کے
نرخرے پر ایک بڑے سے مُنہ سے ایک بڑا سا بوسہ دیا۔ نیل گائے کچھ خوف،
کچھ مایوسی، کچھ غیر جنس مذکر ہونٹوں کو مونث گلے میں آویزاں پا کر اپنی جگہ
سے اُبھری اور دیوانہ وار آگے کو بھاگی۔ شیر مستانہ وار اس کے تعاقب میں اُبھرا
اور لذّت Kill سے دھڑا دھڑاتا ہوا لمبی جست بھر کر اس پر گِرا۔ کٹی ہوئی
گردن سے گرم گرم خون کا چشمہ اُبھرا اور محبوب دیکھتے دیکھتے اپنے عاشق کی

بانہوں میں ابدی نیند سو گئی۔ شیرنی اپنے بچّوں اور اپنی ایک سہیلی کے ساتھ آئی تو شیر نیل گائے چھوڑ کر خجالت کے ساتھ پرے ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شیرنی یہ بات ہرگز پسند نہیں کرتی کہ اس کا شیر اپنی بانہیں کسی اور کے گلے میں ڈالے۔ شیر نے مُنہ دوسری طرف کر لیا اور سوکھے درختوں پر بیٹھے گِدھوں کو دیکھنے لگا۔

جب شیرنی، اس کی سہیلی اور بچّے نیل گائے کو نوچ کھسوٹ کر واپس چلے گئے تو شیر نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر محبوب کو دیکھا۔ وہاں سوائے یادِ یار کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے اپنا سینہ زمین سے ملا کر ایک دلدوز چیخ ماری اور سر جھکا کر ایک طرف چل دیا۔ صاحب السیف خوفزدہ نہیں ہوتا ہے۔ وہ ہار کو قبول نہیں کرتا۔ ڈیپریشن کی بیماری جس نے ہم سب پر حملہ کر رکھا ہے یہ اس کا بھی شکار نہیں ہوتا ہے۔ وہ انگریزی ناول ""The Sea and the Oldman"" کے ہیرو کی طرح ہار نہیں مانتا ہے۔ وہ اس کیریکٹر کی طرح اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ "A man can be destroyed but not defeated"۔ ہمارے ہاں ڈیپریشن کا معاملہ بھی کافی سر اُٹھا رہا ہے۔ جنگجو اس معاملے کو روندتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ ہماری اِس فضا میں ایک بیماری جو ڈیپریشن کہلاتی ہے، یہ بھی شاید

روزِ اوّل سے ہمارے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ باغِ بہشت میں حضرت آدم تنہائی اور Depression کا شکار تھے۔ پھر اُن کے لیے ایک بیوی کا بندوبست کیا گیا لیکن اُن کے ڈیپریشن میں کمی نہ آئی۔ پتہ چلا کہ ڈیپریشن بھی بہشت کی بیماری ہے (مُسکراتے ہوئے) ٹیلیویژن کے ایک ٹاک شو میں ایک پیاری سی نَن سے بہت سوال کیے جا رہے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس کی زندگی ایک تہیّہ اور ایک ارادے کے تحت ہے اور اس وعدے کے ساتھ ہے، جو اس نے کئی سال پہلے کیا تھا۔ اس کے تحت میں سگریٹ نہیں پی سکتی، شراب نہیں پی سکتی، خاص قسم کی ممنوعہ خوراک نہیں کھا سکتی، شادی نہیں کر سکتی اور بچّے پیدا نہیں کر سکتی، پارٹیوں، محفلوں، ہوٹلوں اور تھیٹروں، سینما گھروں میں نہیں جا سکتی۔ حتیٰ کہ اپنے بڑوں کی اجازت کے بغیر ٹی وی بھی نہیں دیکھ سکتی۔

ٹی وی کی میزبان نے کہا "کتنے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ آپ نے زندگی کی ساری لذّتوں سے کنارہ کشی کر لی ہے۔"

نَن نے کہا "آپ ٹھیک کہتی ہیں کہ میں ساری لذّتوں سے محروم ہو گئی ہوں لیکن اس روک اور اس اجتناب نے میری ساری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا ہے اور میرے اندر شادمانیوں کے بسیرے ہیں۔

لذّتیں وقتی اور ہنگامی ہوتی ہیں لیکن مسرّتیں، شادمانیاں مستقل ہوتی ہیں۔ لذّتوں کا جسم سے تعلق ہوتا ہے اور خوشیوں کا روح سے۔ شادمانی نفس اور وجود سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ نفس سے جنگ کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ اس سے جنگ روح کو خوشی عطا کرتی ہے جبکہ خواہشات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے اسے جسمانی لذّتیں میسّر آتی ہیں، روح کو بالیدگی نہیں ملتی۔

آپ میرے لیے بھی دُعا کیجئے گا کہ خدا مجھے بھی ایسا ہی صاحبِ السیف بنادے جو دنیاوی لذّتوں، خواہشوں اور ڈیپریشن کے آگے سر نہ جھکائے اور ایسی غیر مستقل خوشیوں کو ایک ہی وار سے ختم کردے۔ آپ سب کی بڑی مہربانی۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

کلچر، تھرڈ ورلڈ کے بادشاہ اور پیوند کاری

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔ کا اصل کلچر اور سرکاری کلچر، امرائی کلچر ہے۔ ۹۷ فیصد لوگوں کا کلچر ایک ہے اور ۳ فیصد حکمرانوں کا اُن سے مختلف۔ پاکستان کے جتنے بھی بادشاہ گزرے ہیں، جمہوری بادشاہ، آمر بادشاہ، بادشاہ سبھی کا کلچر ایک جیسا تھا اور عوام سے مختلف۔۔۔۔ یہ بادشاہ عوامی کلچر سے محبّت کرتے ہیں اور کرسیاں ڈال کر اس کے مظاہرے دیکھتے ہیں۔ اس کے لیے خصوصی میلے (سرکاری میلے) تیار کر کے رکھے ہیں جہاں ایسے کلچر کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ اب اصلی میلے (میلہ چراغاں، میلہ حضرت میاں میر اور میلہ داتا صاحب) ہوتے ضرور ہیں لیکن سرکاری توجّہ کے محتاج نہیں۔

کلچر کو رواج دینے کے لیے یہاں کلچر کے ادارے قائم ہیں۔ ایسے ادارے مغربی ملکوں میں نہیں ہیں۔ وہاں کلچر کے میوزیم ضرور موجود ہیں لیکن ثقافتی ادارے نہیں ہیں۔

مذہب کے برعکس کلچر جھگڑالو مزاج رکھتا ہے۔ جس طرح اناج، دلیے، چاول اور دالوں کے اندر سُسری لگ جاتی ہے، اسی طرح مذہب کے اندر کلچر کی تفریق جنم لے کر مذہب میں تفرقے ڈالی ہے۔ مثلاً مسلمان نہیں لڑتے، اُن کا اسلام نہیں لڑتا، مذہب نہیں لڑتا اس کے اندر پیدا ہونے والے اختلافات جن کا وجود کلچر ہی ہوتا ہے وہ لڑائی شروع کراتے ہیں۔ مثلاً اسلام میں اسلام کے ماننے والوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب مسلمان ایک اللہ کو، ایک قرآن کو، ایک رسول کو اور پانچ نمازوں کو اور نمازوں میں طے شدہ رکعتوں کو مانتے ہیں۔ لیکن ایک گروہ اِن ساری باتوں کو تسلیم کر کے کہتا ہے۔ ہم تو ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔ تم ہاتھ باندھ کے پڑھتے ہو۔ کیا نالائق لوگ ہو۔ ہم تو زور سے آمین کہتے ہیں۔ تم خاموش رہتے ہو، کیا نالائق لوگ ہو۔

کلچر کی شکل و صورت ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی، اس میں دوسرے کلچروں کی پیوند کاری بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس پیوند کاری کے عجیب و غریب نتائج بر آمد

ہوتے رہتے ہیں۔ عوام النّاس تو اسی پیوند کاری سے یوں آشنا نہیں ہوتے کہ باہر کے اثرات غیر محسوس طور پر اُن کے گھر میں جذب ہو کر اسے ایک نئے روپ میں مبدل کرتے جاتے ہیں اور خواص اس سے یوں متاثر نہیں ہوتے کہ ان کا عوامی اور عمومی کلچر سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ صرف جغرافیائی طور پر اس میں آباد ہوتے ہیں لیکن سیاست کی اور حکومت کی اس بدلتے ہوئے کلچر پر کڑی نگاہ ہوتی ہے۔ اگر تو اس نئ تبدیلی اور کلچرل پیوند کاری سے بادشاہِ وقت کو کوئی فائدہ پہنچتا ہو تو وہ اس کے لیے پسندیدگی کا پروانہ جاری کر کے اس پیوند کاری کو مضبوط و منظم کرتا جاتا ہے لیکن اگر وہ اس کے پایۂ تخت کو استقامت نہ بخشے تو پھر وہ اس کلچر کو پنپنے کی اجازت نہیں دیتا۔ گویا کلچر کی تبدیلی میں دوسرے کلچر کی شجر کاری بھی اثر انداز ہوتی ہے اور حکومت کا پروپیگنڈا یا بادشاہِ وقت کا فرمان بھی تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔

یوں تو ہر آنے والا مذہب پہلے سے موجود معاشرتی گروہوں کے کلچر پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن اسلام اپنے احکامات کی وجہ سے ہر اُس کلچر پر شدّت کے ساتھ اثر انداز ہوا جس کے لوگوں نے اس مذہب کو اختیار کر کے اپنی زندگی کے چلن میں شامل کیا۔ گویا اسلام قبول کرنے والے ہر معاشرے نے اپنے کلچر کا پرانا

سلیبس ترک کرکے نیا سلیبس اختیار کیا اور زندگی کے امتحان کے مقابلے میں سمسٹر سسٹم کو اپنا کر اپنا رُخ یا سمت نئی طرف موڑ دیا۔

مذہب کہتا ہے نئی دنیا تلاش کرو۔ نیا زمانہ کھوجو، کیونکہ تمہارے "اللہ کو ہر روز ایک نیا کام ہے۔"

کلچر کہتا ہے پیپل کے درخت تلے، بابا گرودت کی کٹیا کے سامنے، پاشے کی پانی جمنی اور تین تین دن تک لوگوں نے ایک ہی جگہ بیٹھ کر کوڑیاں پھینکنا اور نرویں پیٹتے جانا۔ بڑوں نے کھیلنا، چھوٹوں نے گھر گنتے جانا۔ کیا اچھے دن تھے!

تھرڈ ورلڈ کے بادشاہ اپنی رعایا کے کلچر میں خود شریک نہیں ہوتے۔ ان کو اپنے سامنے نچواتے ہیں، سامنے رُلاتے ہیں، سامنے گنواتے ہیں اور ان میں انعام تقسیم کرتے ہیں لیکن خود اُن کے ساتھ اس کلچرل عمل میں شرکت نہیں کرتے۔ ہمارے موجودہ بادشاہوں کے اس رجحان کو خاص طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی روایت نے بڑی تقویت عطا کی ہے۔ مقامی کلچر کو تھپکی دینے کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی رسم پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر سامنے آگئی ہے۔

روٹس کی تلاش، مغرب کے ماہرِ انسانیات، معاشریات اور ماہرِ اقتصادیات تھرڈ

ورلڈ کے لوگوں، بالخصوص مسلمانوں کو، اپنے روٹس تلاش کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

جمال عبدالناصر نے بڑی محنت اور تحقیق کے بعد اپنے روٹس فراعنہ مصر میں تلاش کیے۔ شہنشاہِ ایران نے اپنے روٹس "سائرس دی گریٹ" میں تلاش کیے۔ پاکستان کے محقّقین نے اپنے روٹس داہر، سلیوکس اور رنجیت سنگھ میں تلاش کر لیے۔

میں نے روم میں اپنے اطالوی دوستوں سے کہا تم اپنے روٹس کیوں تلاش نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا عیسائیت آ جانے کے بعد ہمارے روٹس عیسائیت میں مدغم ہو گئے اور سائنس آ جانے کے بعد ہمارے روٹس سائنس (علوم) میں منتقل ہو گئے۔

بابا جی بھی یہی فرمایا کرتے تھے کہ جب درخت کو اس کی طلب کا پیوند لگ جاتا ہے تو پھر نہ جڑ کی اہمیت رہتی ہے نہ شاخوں کی۔ ساری مخلوق اس پھل سے فیضیاب ہونے لگتی ہے جو پیوند کا ماحصل ہے۔ جڑیں، شاخیں، تنے اور پتّے اس ثمر کے تابع ہو جاتے ہیں۔ جب خوش نصیب قوموں کو اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر

ملکوتی پیوند سے وابستہ کر دیتے ہیں، اُن کی دنیا بھی سنور جاتی ہے اور آخرت بھی سُدھر جاتی ہے۔ پیوند لگتا ہے تو اس کا سلیبس (نصاب) تبدیل ہو جاتا ہے۔

مولوی موسیٰ نے کہا بھائی اشفاق صاحب اپنے روڑس کی طرف جاؤ گے تو وہاں سے پھر ستّی کی رسم بر آمد ہو گی۔ کنواری کنیا کا بلیدان ملے گا۔ مختلف چہروں والے خدا ملیں گے۔ بادشاہت کی لڑیاں ملیں گی۔ ظالموں کا راج ملے گا۔ چار برن ملیں گے۔ برہمن، کشتری، ویش، شودر! آواگون کا چکر ملے گا۔ چلنا ہے روٹس کی طرف کیا پھر برہمن کو اور بادشاہ کو اپنے سر پر سوار کرنا ہے۔

میں نے کہا لیکن پڑھے لکھے لوگ اپنے روٹس بلکہ گراس روٹس کا بڑا ذکر کرتے ہیں۔

مولوی موسیٰ نے کہا اس کا ذکر وہی لوگ کرتے ہیں جن کا تعلق گھر سے ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ جو اُمّید بھری نظروں والے عوام کو چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ جن کے پاس گرین کارڈ ہوتے ہیں۔ ترقّی یافتہ ملکوں میں جائیدادیں ہوتی ہیں۔ مغرب کی سیاست سے گہرے تعلقات ہوتے ہیں اور ملٹی نیشنل کارپوریٹ میں حصّہ داریاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنی وائٹ ہاؤس کوٹھیوں کے آبنوسی ڈرائنگ

روموں میں برازیل کی کافی اور ہوانا کے سگار پیتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ جب تک اپنے ملک کی روٹس، تک بلکہ گراس روٹس تک نہیں پہنچو گے یہاں کی سیاست اور معیشت سے بہرہ مند نہیں ہو سکو گے۔ ہماری پیڑھی در پیڑھی خاندانی سیاست کا راز ہی یہی ہے کہ ہم اپنے ملک کی گراس روٹس کے بہت اندر تک اُترے ہوئے ہیں اور اس کے دم بدم تجزیے کا گہرا تجربہ رکھتے ہیں۔

پاکستان میں کوئی گراس روٹس کلچرل پالیسی لوگوں کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکے گی کہ عورتیں سر پر اوڑھنیاں لیا کریں اور مرد اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ ایسا ہوا تو معاشرے کا سب سے اہم ستون اسی روز سر بسجود ہو جائے گا اور ٹیلیویژن کا ادارہ اپنے آپ ہی ختم ہو جائے گا۔

یہ مغرب نہیں مذہب کی کلچرل تفریق ہے۔

ہم میں مذہب کا فرق نہیں ہے۔ اس میں ہماری تعلیم بھی مشترکہ ہے اور رضا بھی مشترکہ لیکن ہم خط بنواتے ہیں۔ ہم ڈاڑھی کو موٹی مشین لگواتے ہیں۔ تم محرّم میں روزمرہ کے کپڑے پہنتے ہو، ہم سیاہ لباس پہنتے ہیں۔ تم اپنے مولوی کو مولانا کہتے ہو، ہم علامہ کہتے ہیں۔ ہمارا بنیادی مذہب تو ایک ہے لیکن اس کے

اندر کے کلچرل شگوفے مختلف ہیں۔ اور ہم چھانٹ چھانٹ کر اور بین بین کر اور چمٹی سے پکڑ پکڑ کر ان ثقافتی اختلافات کو لہرائیں اور ایک دوسرے سے لڑیں۔

تم بھی اللہ کا ذکر کرتے ہو، ہم بھی کرتے ہیں۔ تم اونچی آواز میں کرتے ہو، ہم دل میں کرتے ہیں۔ ذکر میں کوئی فرق نہیں۔ الفاظ میں کوئی تفاوت نہیں۔ ادائی میں ہمارا تمہارا کلچرل پیٹرن مختلف ہے اس لیے آؤ جھگڑا کریں۔ یہ جھگڑے تو ثقافتی اختلاف کے ہیں لیکن انہیں مذہب کے کھاتے میں ڈال دیں۔

ایک لمحے کے لیے فرض کریں کہ عالمِ اسلام میں صرف مذہب اور مذہب کے احکامات میں اور کلچر نام کی کوئی شے نہیں (یہ ناممکن بات سہی لیکن دلیل کے طور پر اسے مان لیں) تو پھر مذہبی جھگڑے کا تصوّر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ سب پانچ نمازیں پڑھتے ہیں۔ ہر رکعت میں پڑھا جانے والا مواد ایک سا ہے۔ رکعتیں ایک ہی ہیں۔ سود کو بھی حرام قرار دیتے ہیں، زنا، لحم الخنزیر حرام تسلیم کیا جاتا ہے۔ اپنا مال، اپنی دولت، اپنا رتبہ، محتاجوں میں برابر کا تقسیم کرنے پر خوشحال زندگی اور مابعد میں انعام یافتہ ہونے کا وعدہ ہے۔ شرک کفر کے درجے میں داخل ہے اور اللہ کی زمین میں فساد پھیلانا سب سے بڑا گناہ ہے لیکن ان ہی احکامات کے ساتھ کلچر کی نکالی ہوئی باریکیاں نہ ہوں تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں۔

ایک توجّہ طلب بات یہ کہ مذہب (خاص طور پر اسلام) ترقّی کی طرف لے جاتا ہے اور پھر رجعت کے اُلٹے سفر کی یاد دلاتا ہے۔

مذہب کہتا ہے سچ بول، پورا تول، انصاف کر، اللہ رسول کو مان، ایف سکسٹین اُڑا۔

کلچر کہتا ہے وہ بھی کیا زمانہ تھا نمبر دار کا رنگیلا گڈا ہوتا اس میں بیبیاں بیٹھ کے ترنجاں کو جاتیں۔ صبح کا چلا ہوا گڈا دوپہر کو نیم کے چھتناروں میں پہنچتا اور دوپہر سے چل کر شام کو گھر آجاتا۔ کیا اچھے دن تھے۔

مذہب کہتا ہے سچ بول، پورا تول، انصاف کر، اللہ رسول کو مان، آپریشن تھیٹر میں جا۔ گُردے کا ٹرانسپلانٹ کر۔

کلچر کہتا ہے نائی نے موٹا آٹا، السی کا تیل، کوار گندل، آک کا دودھ ڈال کے لپری تیار کرنی اور پھر ململ کی پٹی میں باندھ کر گردوں کے گرد لپیٹ دیں۔ چودھری صاحب نے گھڑی بھر کے لیے سو جانا۔ کیا اپنے دن تھے۔

مذہب کہتا ہے سچ بول، پورا تول، انصاف کر، اللہ رسول کو مان۔ چکن مانچورین کھا۔

کلچر کہتا ہے کالو کی مینائیں کی دینی سرسوں ہونی۔ اس کو بیبیوں نے ہاتھ سے مرونڈنا۔ گھر لے جا کر پتّے الگ اور گندلیں الگ کر کے مٹّی کی ہانڈی میں اُپلوں کی آگ پر ہولے ہولے گلانا۔ پھر بیلن ڈال کر گھوٹا پھیرنا۔ ادرک تھوم ڈال کر تیل کا بگھار لگانا اور مکئی کی روٹی پر ڈال کر روٹی ہاتھ پر رکھ کر کھانا۔ واہ واہ۔ کیا اچھے دن تھے۔

گاؤں میں باسی روٹی، مکھن کا ناشتہ، تازہ بلوئی ہوئی لسّی کے ساتھ ہوتا تھا۔ پھر ناشتہ چائے کے ساتھ ہونے لگا تو گاؤں کے گھر پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ چائے کی وجہ سے کھانے پکانے کے برتن تبدیل ہوگئے۔ سرپوش، رومال اور دستر خوان بدل گئے۔ اب کوکا کولا کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ کلچر کی شکل تبدیل ہو رہی ہے۔ اب اتنی تبدیلیوں کے بعد گراس روٹس کی طرف بڑھنا اور اس کا ذکر کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس گراس روٹس کی البتہ بادشاہوں کو ضرورت ہے۔ وہ بادشاہ جو اپنے تخت و تاج کو قائم رکھنا چاہیں اور اپنی حکومت کو استحکام بخشنا چاہیں، لوگوں میں مقبول رہنا چاہیں، ان کو لوگوں کے جبلّی جذبات بڑھانے کے لیے ایسے شوشوں اور سلوگنوں کی ضرورت البتہ رہتی ہے۔ یہ بادشاہ چاہے آمریت کے بادشاہ ہوں، چاہے جمہوریت کے بادشاہ۔ عوامی بادشاہ ہوں یا

خصوصی بادشاہ۔ ماڈرن بادشاہ ہوں یا کلاسیکی بادشاہ۔ انہیں عوام النّاس کے جذباتی کھلونے کو ہر وقت کلچرل چابی لگا کر رکھنی پڑتی ہے۔ جو بادشاہ سمجھدار ہوتے ہیں وہ چابی کے بجائے اس کھلونے کو ری چارج ایبل بیڑی پر ڈال دیتے ہیں تا کہ اس میں مستقل حرکت رہے اور اس کی گردش رُکنے نہ پائے۔ اس گردش میں تسلسل قائم رکھنے کے لیے کچھ علم دوست بادشاہ اپنے لوگوں کے کلچر کی ایک پالیسی طے کر دیتے ہیں جیسے امریکہ نے ایک غیر تحریری کلچر پالیسی بنا کر اپنے عوام کو مطمئن کر رکھا ہے۔ ہر کلچر کو کئی ایک شکلوں کا سامنا رہتا ہے۔ مشکل، مصیبت، کشٹ، دکھ، صدمہ، اذیت، بوجھ، وبال اللہ کا خاص عطیہ ہے۔ یہ انسان کی ترقّی اور افزائش کے لیے ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو کائنات کی ساری افزائش رُک جائے۔ بیج کو ہی لے لیں۔ آپ سیڈ کارپوریشن سے اعلیٰ قسم کا بیج لیں۔ اسے صاف پانی میں بھگو کر چینی کی خوبصورت طشتری میں ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھیں۔ اس کو پنکھی جھلتے رہیں۔ اسے گانا سُناتے رہیں، گاتے رہیں۔ اس کی آرائش کرتے رہیں تو بھی کچھ نہیں ہوئے گا۔ جب تک ایک قبر بنا کر اندھیرے میں اسے دفن نہیں کریں گے، اسے اذیت سے نہیں گزاریں گے، یہ اُگے گا نہیں۔ یہی صورتِحال کلچر کی ہے۔ کلچر کو بننے کے لیے گھٹن اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب جا کر صدیوں بعد کسی کلچر کا جادو

سر چڑھ کر بولتا ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

”اُٹھ فرید اسُتیا“

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

یہ جو آپ کا زاویہ ہے ناں یہ عجیب و غریب رنگ دکھاتا ہے اور عجیب طریقے سے مجھ پر وارد ہوتا ہے۔ اس سے بہت سی ایسی یادیں ذہن میں اُبھر آتی ہیں جو دفن ہو کر بالکل ختم ہو گئی تھیں مگر اس نے بھی کمال کیا بہت پرانی بلکہ یہی پرانی باتوں کو ایک کُکر متّے کی طرح پرانے درخت کے سیلے تنے پر ابھار دیا۔ جس طرح حبس کے دِنوں میں زمین سے کھمبیاں بر آمد ہوتی ہیں اسی طرح ذہن کی سرزمین سے کھمبیوں جیسے واقعات نمودار ہونے لگتے ہیں۔

جب پاکستان نیا نیا وجود میں آیا تو ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کو عجب بے سروسامانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ لوگ سڑک کنارے بے یارومددگار پڑے تھے اور کچھ اپنی زندگی کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے بے سروپا ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اصل بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور ہم صرف زندہ رہنے کے لیے تگ

ودو کر رہے تھے۔

ہم کو اوکاڑہ میں ایک دُکان الاٹ ہو گئی کہ اس کا سامان بیچو اور اپنے خاندان کی پرورش کرو۔ اس کے بعد مستقل طور پر کچھ دیکھا جائے گا۔

ہم نے اس سے پہلے کبھی دُکانداری نہ کی تھی۔ نہ ہم کو اس کا تجربہ تھا اور نہ ہی اس کا کوئی شوق تھا۔ دُکان کافی بڑی تھی۔ ایک مکمل جنرل سٹور تھا اور اس کے گاہک لگے بندھے پرانے لوگ بھی تھے اور نئے بھی ان میں شامل ہو گئے تھے۔ میرے ماموں جنہوں نے سہارنپور میں ٹھیکیداری کا کام کیا تھا وہ اس کے نگران تھے۔ میرے بڑے بھائی رات کے وقت اس کی نگرانی کرتے اور رات کو دُکان میں ہی سوتے۔ وہ کراچی کچھ سامان لینے گئے تو اس دُکان پر سونے کی میری ڈیوٹی لگ گئی۔

آدھی رات کے وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ دُکان کے اندر کوئی ہے۔ میں برآمدے میں اپنی چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور کان اندر کی آہٹ پر لگا دیئے۔ اندر ضرور کوئی تھا۔ میں نے اٹھ کر دُکان کے پہلو والی گلی میں جا کر دیکھا تو مدّتوں کی بند کھڑکی کو کس قدر مختلف حالت میں پایا۔ میں نے کھڑکی کے پیٹ کو دھکیلا

تو وہ کھلا تھا۔ اس پٹ کو پورا کھول کر میں دبے پاوں دُکان کے اندر داخل ہوا تو مجھے دُکان کے اندر کے کمرے میں چور کی موجودگی کا احساس ہوا۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد کے چور، چور ہی ہوتے تھے۔ قاتل یا موزر بردار نہیں ہوتے تھے۔ باہر کے کھمبے کی روشنی سے ہٹ کر میں چھتریوں والی الماری کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے چور کا وجود تو نظر نہ آیا مگر اس کے پاؤں کے آہٹ صاف سنائی دی۔ وہ بڑے سیف کی طرف بڑھا اور اس کا دروازہ کھول کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ خدا کا شکر ہے اس دن سیف میں سوائے ایک بِلٹی کے اور میرے بھائی کے سگرٹوں کے ڈبّے کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

چور نے مایوسی کے ساتھ سیف کا دروازہ بند کر دیا اور جب وہ پلٹنے لگا تو اس کے ہاتھ سے سولا ہیٹ گر کر ایک مرتبہ اُبھرا اور پھر بیٹھ گیا۔ میں نے دیوار کے ساتھ ہاتھ پھیر کر بٹن تلاش کیا اور کھٹ سے اندر کی ایک بتّی جلا دی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر کا ایک لڑکا مجھ سے ذرا دُور کھڑا تھَر تھَر کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کو پہچان لیا۔ وہ انبالے کے سیّد گھرانے کا ایک خوبصورت نوجوان تھا جس کے والد وکیل تھے لیکن اُن کی وکالت چل نہیں رہی تھی اور وہ گھرانہ بڑی عُسرت اور تنگدستی کی زندگی گزار رہا تھا۔

میں نے قدرے اُونچی آواز میں جھڑک کر کہا ”میں نے تمھیں پہچان لیا ہے اور تم کو پولیس کے حوالے کرنے کے لیے اس وقت تھانے لے جا رہا ہوں۔“

اس نے گڑگڑا کر کہا ”مجھے معاف کر دیجئے جنابِ عالی۔ میں چور نہیں ہوں۔“

میں نے کہا ”پکڑے جانے پر چور یہی کہا کرتا ہے۔ تم بالکل چور ہو اور تھانے والے ابھی تم سے سب کچھ اُگلوا لیں گے۔ کیا آج دوپہر تم ہماری دُکان پر نہیں آتے تھے؟“

”میں بالکل آیا تھا جنابِ عالی اور جاتے ہوئے میں نے یہ کھڑکی اندر سے کھول دی تھی۔“

”یہ سب کچھ تم نے چوری کی غرض سے کیا اور اس غرض سے رات کے اندھیرے میں اندر بھی داخل ہوئے اور تم نے یہ سامنے پڑا ہوا سولا ہیٹ بھی چُرایا جو تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا ہے۔“

اس نے کہا ”آپ نے ٹھیک کہا۔ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن میں چور نہیں ہوں۔“

جب میں نے آگے بڑھ کر اس کا کان پکڑ لیا اور کہا "یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی تم کہتے ہو کہ 'میں چور نہیں ہوں۔' ابھی جب تمہارے والد کو تھانے بُلا کر اُن کے سامنے تمہاری چھترول کی جائے گی تو تم بلبلا کر کہو گے میں چور ہوں۔ مجرم ہوں اور پرانا عادی چور ہوں۔"

اُس نے سر جھک کر کہا "نہیں جنابِ عالی۔ میں چور نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "وہ کس طرح؟"

اس نے کہا "میں نے یہ ہیٹ اپنے چھوٹے بھائی ظفر کے لیے چُرایا ہے جو سولا ہیٹ پہن کر عید پڑھنے عید گاہ جانے پر ضد کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "وہ کتنا چھوٹا ہے؟"

بولا "مجھ سے تین سال چھوٹا ہے اور اس نے آتے جاتے یہ سولا ہیٹ آپ کے شو کیس میں دیکھا ہے۔ ابّا جی نے اسے یہ ہیٹ لے کر دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ بیمار پڑ گئے اور کمائی نہ کر سکے۔"

میں نے کہا "وہی پرانی غم انگیز کہانی۔ لوگوں کا دل غم آلود کرنے والی۔ میں نے

کئی مرتبہ سُنا ہے، ہزار مرتبہ پڑھی ہے۔"

اس نے کہا "کہانی نہیں ہے یہ حقیقت ہے، لیکن چونکہ یہ ظفر کی آخری عید ہے اس لیے میں یہ ہیٹ چُرانے پر مجبور ہو گیا۔"

جب میں نے اس سے آخری عید کی وضاحت چاہی تو اس نے سر جھکا کر روتے ہوئے کہا "میرا بھائی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے جس کی بنا پر وہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے اور جی سکے گا۔ ہم اسے لاہور بھی لے گئے تھے۔ وہاں تین مرتبہ اس کا بلڈ ٹیسٹ ہوا تھا۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے بھی یہی بتایا ہے۔ میں اس کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا "چلو میں نے تمہاری یہ کہانی تو سچ مان لی لیکن پھر تم نے دُکان کا سیف کیوں کھولا؟ کھولا تھا کہ نہیں۔"

اس نے کہا "کھولا تھا مگر میں نے کچھ چُرانے کی غرض سے نہیں کھولا تھا۔ بیشک آپ چل کر دیکھ لیں۔ میں نے اس میں سے کچھ بھی نہیں لیا۔"

میں نے کہا "وہ تو اس کے اندر کچھ تھا ہی نہیں۔ تم کدھر سے لیتے۔ وہ تو ہماری قسمتی کہ اس میں سے کل ہی میرا بھائی دس ہزار لے کر کراچی گیا ہے۔"

اس نے پھر ڈھٹائی سے کہا "میں کہتا ہوں جنابِ عالی میں نے اسے کچھ چُرانے کی غرض سے نہیں کھولا تھا۔"

"تو پھر کس لیے کھولا تھا۔" میں نے کڑک کر کہا۔

"میں نے اس میں کچھ رکھنے کے لیے کھولا تھا۔"

اس کی بات کا جائزہ لینے کے لیے میں نے پلٹ کر سیف کھولا تو اس میں عین سامنے جارج ششم کا ایک روپیہ پڑا تھا۔

اس نے کہا "میں نے اپنی طرف سے ہیٹ کی یہ قیمت رکھی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سے باقی سات قسطیں بھی ادا کر دوں گا لیکن میں پکڑا گیا۔"

میں نے واپس اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا "ٹھیک ہے کہ تمہاری نیّت خراب نہیں تھی لیکن تم نے جو کچھ بھی کیا غلط کیا۔ اصولی طور پر یہ چوری ہی تصوّر کی جائے گی۔ اب تم کو اس دُکان کے بقیہ سات روپے ہی واپس نہیں کرنے ہیں بلکہ ہر ہفتے میرے سامنے پیش ہو کر اس گناہ کا اعتراف بھی کرنا ہے۔"

وہ حیران ہو کر میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا تو میں نے کہا "تھانے میں 'بستہ ب'

والوں کے نام اور اُن کی تصویریں آویزاں ہوتی ہیں۔ آج سے تم 'بستہ ب' کے مجرم ہو۔ اسی لیے ہر جمعرات کو تمھیں میرے سامنے پیش ہونا ہے۔" اس نے کہا ٹھیک ہے۔

میں نے جھک کر زمین سے سولا ہیٹ اُٹھایا کہ اسے دوں۔ جھکنے سے میری جیب سے سگرٹوں کا پیکٹ اور بٹوہ فرش پر گر گئے۔ میں نے سولا ہیٹ اسے دیا اور سگرٹوں کا پیکٹ اور اپنا بٹوہ جلدی سے اُٹھا کر جیب میں ڈالا۔

میں نے حال ہی میں سگریٹ نوشی شروع کی تھی اور اپنے بڑے بھائی کے سگریٹ کھسکا کر پی رہا تھا۔ جب وہ کراچی مال لینے گئے تھے تو میں نے نوٹوں سے سو روپے کا ایک نوٹ بھی کھسکا لیا تھا۔ میری ضرورتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کا تحفہ سولا ہیٹ لے کر کھڑکی کی جانب چلا تو میں نے اسے روک کر کہا ایک منٹ ٹھہرو۔ وہ رُکا اور میری طرف پلٹ کر رحم بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "جمعرات کے جمعرات 'بستہ ب' کے مجرموں کی حاضری دو طرفہ ہوگی۔ ایک جمعرات تم میرے روبرو پیش ہوا کرو گے۔ ایک جمعرات میں تمہارے روبرو حاضر ہوا کروں گا۔" اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا لیکن مجھ سے کچھ پوچھا نہیں مبادا میں اس پر کوئی اور حکم لاگو کر دوں۔

پھر ہم باقاعدگی کے ساتھ ہر جمعرات باری باری سے ایک دوسرے کے سامنے پیش ہوتے رہے اور پوری سات جمعراتیں ہم نے اس طرح سے گزار دیں۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ اس زمانے میں ہم سچّے بھی تھے اور اچھے بھی۔ ہم اپنے ملک کو دنیا کی نظروں میں ارفع و اعلیٰ ملک دیکھنا چاہتے تھے۔

چھوٹے بڑوں سے سیکھتے ہیں اور بڑوں کی نقالی کرتے ہیں۔ میرے ماموں کو اپنے دفتر میں کچھ مشکلات کا سامنا تھا۔ ان کی اپنی باس سے نہیں بنتی تھی اور جن ملازموں کی اس سے بنتی تھی وہ بھی ماموں کو اچھے نہیں لگتے تھے۔ میرے ماموں اپنے افسر کے خلاف اور اپنے ساتھیوں کے خلاف گمنام خط لکھا کرتے تھے اور اس میں اُن کی برائیاں بڑی تفصیل سے بیان کیا کرتے تھے۔ اکثر ان کے بر خط میں پوسٹ کر کے آتا تھا اور مختلف ڈاکخانوں سے کرتا تھا کہ یہ احساس نہ ہو کہ یہ سارے خط ایک ہی Source سے آتے ہیں۔

ماموں کی دیکھا دیکھی میں نے اور گوردیال نے بھی گمنام خط لکھے کا ڈول ڈال دیا۔ سب سے پہلا ماسٹر کھچکو کو لکھا۔ یہ بڑا ہی ظالم ماسٹر تھا۔ کندھے کے نیچے ڈولے میں اس زور کی چٹکی کاٹتا کہ بازو کی بوٹی ہی نکال لیتا۔ ہم نے اس کے لیے بہت ہی محبّت بھرا خط لکھا جس میں چٹکی کاٹنے کے عمل کی روح پر تفصیل بتا کر یہ

درخواست کی گئی کہ وہ چٹکی کی کاٹ پچاس فیصد کم کر دیں۔ ہم بہتر طالب علم بن جائیں گے۔

ہم نے محبّت بھرے گمنام خط لکھنے شروع کر دیئے۔

ہمارے ایک دوست تھے۔ بہت بڑے طبیب اور بہت بڑے طبیب خانوادے کے فرزند، شاعر بھی تھے اور جوہر شناس بھی۔ باتیں بہت خوبصورت کرتے تھے۔ ان میں تجربہ بھی ہوتا، مطالعہ بھی، منطق بھی اور لوک دانش بھی۔ ان کا نام جمال سوید اتھا اور میں اکثر ان کی محفل میں شریک ہوا کرتا تھا۔

چونکہ وہ ایک بڑے جوہری تھے اور ہیروں کے اندر، باہر ذات اور صفات کا علم رکھتے تھے اور اُن کے مزاج اور اثرات سے واقف تھے۔ اس لیے اُن کی باتیں سُن کر اور بھی حیرانی ہوتی۔ جمال سوید اصاحب نے بتایا کہ اگر بڑے ہیروں کے ساتھ چھوٹے اور کم قیمت ہیروں کو ایک مخصوص تھیلی میں ڈال کر رکھا جائے تو کم قیمت اور چھوٹے ہیروں میں بھی بڑے ہیروں کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کے اندر کوئی رنگ نہیں ہوتا اُن میں بڑے ہیروں کی رنگت کا بھی مستقل چلن ہو جاتا ہے۔ (جھولا پڑنے لگتا ہے)

ہمارے گاؤں میں ایک اندھا فقیر صبح سویرے ایک صدا لگاتا ہوا گزرا کرتا تھا۔ ”اُٹھ فریدا سُتیا تے اٹھ کے باہر جا، جے کوئی بخشیا مل گیا تے توں وی بخشیا جا۔“ ”مجھے اُس وقت اُس کی بات بڑی بے معنی لگتی تھی لیکن جمال سویدا کی گفتگو کے بعد اور ہیروں کی آپس کی صحت کے بعد یہ راز کھُلا کہ تربیت انسان کو کس طرح بدل دیتی ہے۔

انہوں نے بتایا کہ ہیرا بڑا ہو یا چھوٹا، وہ اصل میں ایک سنگِ معدنی ہی ہوتا ہے، پتھر کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ جب تک وہ تراشا نہ جائے وہ ہیرا نہیں بنتا اور وہ روشنی نہیں چھوڑتا جو اُس کے اندر مقید ہوتی ہے۔ اعلیٰ درجے کے ہیرا تراش سری لنکا کے لوگ ہیں۔ خدا نے اُن کو اِس کام کی بڑی صنّاعی عطا کی ہے۔

میرے اندر ایک بڑی خرابی ہے۔ خرابیاں تو اور بہت کیا ہیں لیکن یہ سب سے بڑی خرابی ہے۔ ساری خرابیوں کی Head of the wept کہ میرے اندر کدورت بہت ہے۔ ایک مرتبہ کسی کے خلاف کوئی گانٹھ بندھ جائے تو کھلتی نہیں۔ اس میں کچھ میرے پیشے کا بھی تعلق ہے۔ ادیب لوگ دوسرے کی زیادہ تعریف ہونے پر حسد سے جل جاتے ہیں۔ وہ شخص ہی اچھا نہیں لگتا حالانکہ اس نے آپ سے کچھ کیا نہیں ہوتا۔

بس میں سفر کرتے وقت سامنے کی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی ویسے ہی بُرا لگنے لگ جاتا ہے حالانکہ وہ بڑے آرام سے گودی میں دونوں ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہوتا ہے۔

جمال سویدا صاحب نے کہا جو آدمی بُرا لگتا ہے اس میں کوئی خرابی نہیں ہوتی اصل میں وہ سنگِ معدنی Uncut ہیرا ہوتا ہے۔ اس کی روشنی اس کے اندر قید ہوتی ہے۔ اگر اس کو کوئی اچھا سا الماس تراش مل جائے تو وہ ایسا درخشندہ ہو جائے کہ آپ اس کی روشنی کی تاب نہ لا سکیں۔ ہر Cell کے اندرونی موجود ہوتی لیکن جب تک اس کے آگے بلب نہیں لگے گا اس کی روشنی واضع نہیں ہو گی اور یہ بلب ایک بندہ ہی عطا کرتا ہے۔ ''اُٹھ فرید اُستیاتے اُٹھ کے باہر جا، جے کوئی بخشیا مل گیاتے توں وی بخشیا جا۔''

بعض اوقات نہیں اکثر اوقات ہم کسی بھی شخص کو شک کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور ہمیں وہ چور نظر آتا ہے۔ اگر ہمیں اس پر یہ شک ہو کہ وہ چغلی خور ہے تو وہ ہمیں چغلی خور ہی دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم کسی کے بارے میں رائے قائم کر لیں وہ بڑا ہی اچھا شخص ہے تو بلاشبہ وہ نہایت اچھا آدمی بن جائے گا۔ بس یہی طرزِ عمل اختیار کرنے کی اشد ضرورت ہے تو پھر ہم سات جمعراتیں ایسے ہی ملیں گے اور عام پتھر سے قیمتی پتھر بن جائیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

سائنسی ملوکیت

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام ہے۔

میں نے اس پر خوب غور کیا ہے اور کافی توجّہ دی ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ تشکیک زندہ ہے اور تحقیق مُردہ ہے۔ جو بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی اور اس کی بات فلسفیوں اور دانشوروں اور سائنسدانوں نے طے کر دیا۔ سو ہتھ رسّہ سرے پر گانٹھ دے دی وہ بات ختم ہو گئی اور مر گئی لیکن جس کے بارے میں شک کیا جا رہا ہے، کچھ لوگ مانتے ہیں کچھ اس کو وہم اور بکواس خیال کرتے ہیں۔ وہ بات زندہ ہے اور پروان چڑھ رہی ہے اور ہر عہد کے لوگوں کے لیے ایک چیلنج بن کر کھڑی ہے۔

The evermore rigorous application of the scientific to all subjects and disciplines have destroyed method .of ancient wisdomeven the last remnants

اس وقت بڑے اعلیٰ درجہ کی سائنٹیفک زبان میں اور نہایت زور دار فقروں میں باتیں کہی جا رہی ہیں کہ اقتدار اور معانی سوائے Defence Machine کے اور کچھ نہیں۔ یہ رجعت پسندی اور ری ایکشزی ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ ایسے فقروں، اس قسم کے بیانوں اور ایسی تحریروں کا جو سائنس کے نام پر وضع کی ہیں کوئی کیا جواب دے سکتا ہے۔

لوگ روٹی مانگتے ہیں اور اس کے بدلے ان کو بلوے اور ہنگامے عطا کیے جاتے ہیں۔ انہیں حق مانگنے کے نعروں پر اکسایا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کو روٹی دینی چاہیے۔ لوگ 'بینتی' کرتے ہیں کہ انہیں بتایا جائے کہ وہ کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں، کیسے بقا حاصل کر سکتے ہیں، کیسے Save ہو سکتے ہیں اور ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ بقا اور دائمیت بکواس ہے۔ اس کی حقیقت Infantile Humour سے زیادہ نہیں۔ ان کی آرزو ہے کہ ان کو سمجھایا جائے کہ انسانیت سے اور شرافت سے اور صداقت کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کی جا سکتی ہے اور انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ تم مشین ہو جس طرح کمپیوٹر ہوتے ہیں اس طرح کے آلات ہو۔ نہ تمہارا کوئی اختیار ہے کہ تمہاری کوئی ذمّہ داری ہے۔ بس تمہیں کام کرتے رہنا ہے۔ محنت کرتے رہنا ہے۔

کئی صدیاں مذہب کی حکمرانی کے بعد اب ایک نیا اور زیادہ خوفناک دور آیا۔ گزشتہ تین صدیوں سے "سائنسی ملوکیت" کا دور چل رہا ہے۔ اس نے لوگوں کو اپنے مرکز سے اکھاڑ دیا ہے۔ ایک بے مقصد، بے مرکز گردہ پیدا کر دیا ہے جس کی باگ ڈور زیادہ تر نئی نسل کے ہاتھ میں ہے۔ اس عمل سے کرۂ ارض کی ساری انسانیت کسی بھی شدید بحران کا شکار ہو سکتی ہے۔

آج کی زندگی یوں ہے جیسے ہم کسی غیر ملک میں ہوں۔ کسی اجنبی جزیرے میں ہوں اور زندگی ہم پر تھوپی جا رہی ہو۔ ہماری مرضی کے خلاف، ہم سے پوچھے بغیر، ہم کو ریڈی کیے بغیر، ہم کو ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں جن کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے۔ ہم کو ڈاکٹر، انجنیئر بن جانا پڑتا ہے کیونکہ وقت کے تقاضے اس قسم کے ہیں۔ یا جس وقت تک ہم کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں یا پہنچ سکتے ہیں اس وقت تک ہم ڈاکٹر، انجنیئر یا میکینک یا آرکیٹیکٹ بن چکے ہوتے ہیں۔ جب ہم فیصلہ کر کے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہم کو اپنے بوڑھے والدین اور اپنے جوان ہوتے بچّوں کے درمیان رہنا چاہئے، اس وقت تک ہم کینیڈا یا کویت یا انگلستان یا دوبئ شارجہ پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ یہ عمل نوجوانی یا جوانی میں ہی نہیں ہوتا، ساری زندگی جاری رہتا ہے اور ہم حیوانوں اور چوپایوں کی طرح یقین اور اعتماد کے

ساتھ اپنے گھروں پر ایستادہ نہیں ہوتے۔ ہر وقت ڈگمگاتے رہتے ہیں۔

اس میں کیا کروں؟

یا۔۔۔میں کیا کروں کہ اپنے آپ کو بچا کر اور سنبھال کر رکھ سکوں؟

دیکھو میں تمہیں اس کا جواب بتاتا ہوں۔پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ پھر میں تمہیں وہ طریقے بتلاؤں گا جن سے وہ چیز حاصل ہو سکے۔

"یہی تو مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ شاید میں زندگی کی خوشیاں چاہتا ہوں۔ ان کا طلبگار ہوں۔"

"اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ ہمیں اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے؟"

"مجھے کیا معلوم میں تو بس خوش رہنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر سنو تمہارے خوش رہنے کے لیے تمہیں دانش کی ضرورت ہے؟"

"یہ دانش کیا چیز ہے؟"

”تو پھر تم کو حقیقت کی تلاش ہے۔ ایسی سچائی کی تلاش جو تم کو آزاد کر دے۔“

”لیکن سچائی کیا ہے جو ہم کو آزاد کر دے۔ یہ کہاں مل سکتی ہے؟ کس کے ہاں دستیاب ہے؟ کون میری رہنمائی کر سکتا ہے کہ سچائی کہاں ہے۔ کم از کم دور کھڑا ہو کر ہاتھ کے اشارے سے ہی بتا دے کہ سچائی اس طرف کو ہے؟“

The traditional wisdom had considered the human as but, open-ended, that is capable of reading weak higher and higher levels. Its beyond itself towards are quite high., voltage may be low but, its amperes They can produce heavy spark if applied at a proper .time

مجھے تو سمجھ نہیں آتا کہ اس زندگی کے ساتھ۔ یہ جیون جو مجھے میری مرضی کے خلاف مل گیا ہے، اس کے ساتھ کیا کروں۔

پاسکل نے کہا:.

Man wishes to be happy and only exists to be happy

andcannot wish not to be happy.

کانٹ نے کہا: انسان کو پتہ ہی نہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے اور وہ یقین کے ساتھ کہہ بھی نہیں سکتا کہ اس کو کون سی چیز خوشی عطا کرے گی۔ آنند بخشے گی۔

روایتی دانش اور جٹکی بات کا خیال ہے۔ انسان کی خوشی کا سارا دارومدار بلندی حاصل کرنے پر ہے۔ ارفع خصوصیات پیدا کرنے پر ہے۔ اونچی ارفع اور افلا کی فلاسفی تلاش کرنے پر۔ خدا کے درشن کرنے پر ہے!

اگر انسان نیچے کی طرف جاتا ہے اور اپنی Lower خواہشات اور سفلی خصوصیات استوار کرتا ہے تو وہ حیوانوں اور مویشیوں کی سطح پر آجاتا ہے اور یہ چیز اس میں حزن اور ملال پیدا کر دیتی ہے۔ اس کو ناخوشی سے بھر دیتا ہے۔ وہ اتھاہ مایوسیوں کا اور مستقل مریض بن جاتا ہے۔ یہ کوئی روحانی بات نہیں۔ اوپر اُٹھنے اور اونچا جانے کی خواہش موڈرن انسان میں بھی ہے جو روحانیت پر اور مذہب پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ دولت حاصل کر کے دوسروں سے اُونچا ہونا چاہتا ہے۔ علم حاصل کر کے دوسروں سے ارفع ہونا چاہتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے زور پر ترقّی یافتہ کہلانا چاہتا ہے۔ آسمانوں پر کمندیں ڈالنا چاہتا ہے۔ خلا میں

اُبھر کر چاند تک جانا چاہتا ہے۔

انسان اور حیوان میں ایک شے مشترک ہے اور وہ ہے لذّت حاصل کرنے کی خواہش۔ The enjoyment of pleasure. انسان زیادہ تر اس کو جسمانی زندگی اور نفسی حرکتوں کے ساتھ حاصل کرتا ہے۔

میرے ماڈرن دوست اور میرے ترقّی پسند قاری اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے کہ آنند صرف ان طریقوں سے حاصل ہو سکتا ہے اور ان راہوں پر چل کر مل سکتا ہے جن سے ماڈرن لوگ قطعی طور پر ناآشنا ہیں۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب تک بلندی اور رفعت اور اونچائی کہ جسے حاصل کرنے کے لیے انسان تڑپتا ہے، اپنے وجود میں خصوصی Qualitative نہیں ہوگی محض بلندی حاصل کرنے اور سیدھے اوپر کو نکل جانے سے کچھ نہیں ہوگا کیونکہ اونچائی محض جسمانی اونچائی اور چاند تک پہنچنے کا نام نہیں ہے۔

اس وقت سائنسی نمونہ یا سائنسی نقشہ جو ساری دنیا پر حاوی ہے نیوٹن کی فزکس Newtonian Physics کارٹسے کی منطق اور ڈارون کی حیاتیات ہے۔ اس نقش اور نمونے کے اندر ایٹم کو پھاڑا گیا۔ چاند پر چہل قدمی کی گئی۔ پرانے دِلوں

کی مرمت کی گئی یا ان کی بدلی کی گئی اور لوگوں نے آواز سے بھی تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرنا شروع کیا۔ ایسی چیزوں کو ترقّی کا نام دیا جاتا ہے اور اس کو ترقّی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لوگ خوش ہیں لیکن کوئی بھی ان چیزوں سے واقف نہیں ہے۔

لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ انسان کی اخلاقی ترقّی کے بغیر کوئی ترقّی صحیح معنوں میں ترقّی نہیں۔ اخلاقی ترقّی کے بغیر صرف سائنسی ترقّی بڑی خطرناک اور ہولناک ہو جاتی ہے اور انسانی گرفت سے نکل جاتی ہے۔ یہ بات کہی تو بڑی دیر سے جا رہی ہے اور بار بار کی جارہی ہے لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ ہم طبعی زندگی کو اور اس کے ہزاروں لاکھوں برس پرانے ٹھکانوں کو ایک نیوکلیئر پلانٹ سے بھسم کر سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو اقتصادی ترقّی (Economic Development) سے اس کو برباد کر سکتے ہیں۔ فراوانی اور تکنیکی ترقّی جو کچھ کے لیے طاقت اور آسودگی کا سامان فراہم کرتی ہے دوسرے بے شمار لوگوں کے لیے اکتاہٹ، سختی، مشقت، انتدال اور بے مروّتی پیدا کرتی ہے۔ دنیا کی کثیر آبادی, بے گھر, بے دَر اور بے رزق زندگی بسر کر رہی ہے اور غربت اور افلاس صنعتی سوسائیٹیوں کے دِلوں کو چیر کر اندر گھس رہا ہے اور ان سوسائیٹیوں میں نئی طرز کے بے کار، بے اُمّید اور بے نام و نشان لوگ

نوکریوں، ملازمتوں اور معاش سے پرے جنم لے رہے ہیں۔

ا یہ زمانی بہت بڑی تبدیلی، ایک بڑے انقلاب کا منتظر ہے لیکن تبدیلی اپنے بھرپور انداز میں ایک تخلیقی قوّت بن کر صرف انفرادی سطح پر آیا کرتی ہے۔ تو کیا فرد واحد کی وجہ سے گروہ میں تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ضرور ہو سکتی ہیں، ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فرد اور گروہ ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور یہ ایک ہی سِکّے کے دو رُخ ہیں۔

یکجائی، تمامی اور خود مختاری (Autonomy) کلیدی تصوّرات ہیں۔ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، الگ نہیں۔ خود مختاری کے بغیر یکجائی کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا اور کل تمام اور سالم کے بغیر خود مختاری بے معنی شے ہے۔ اس کے بغیر خود مختاری موجود ہے تو پھر یوں سمجھ لیجئے کہ یہ مصنوعی خود مختاری ہے جو صاف سوسائٹی کی پیداوار ہے۔ ایک ایسی خوشی ہے جو سرکنڈوں کی اوٹ میں اور کار کے اندر پردے کھینچ کر حاصل کی جا رہی ہے۔

صرف ایک مکمل اور آزاد شخص ہی کام کر سکتا ہے۔ Act کر سکتا ہے۔ وہی مدافعت کر سکتا ہے۔ وہ رُک کر چل سکتا ہے۔ کوئی نئی تعمیر کر سکتا ہے، مکمل اور

Whole ہونے کی صورت میں ہی اس کو یہ راز سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ لوگوں کی نا سمجھی، کم فہمی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ایک مادہ پرست سرمایہ داری مصرف اور Competitive سوسائٹی ہی اس کی ذمّہ دار ہے۔ جب ہر قسم کی اکانومی کو پڑھنا اور پھلتا پھولنا ہو گا تو موجود ذرائع ضرور کریں گے۔ اگر مسلسل گروتھ کا عمل جاری رکھنا ہے تو پھر یہ عمل منطقی طور پر اسی طرح ختم ہو گا جیسے برطانیہ کا جزیرہ اسفالٹ میں ڈوب گیا۔ اگر خوشی کسی ایک فرد کے لیے فراہم کی جائے گی اور ایک فرد کو شخصی آزادی عطا کرنے کا اہتمام کیا جائے گا تو پھر ایک اور شخص دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی بھی علاقے میں غم سہنے پر ضرور مجبور ہو گا۔

ثبوتی سوچ کی طرف پیش قدمی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان میں خود شناسی کا جوہر پیدا ہو رہا ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

علم فہم اور ہوش

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

اس دنیا میں کسی شخص کو بھی مردانگی اور شخصیت بھی بنائی عطا نہیں کی جاتی۔ یہ ایسی شے ہے جو اسے خود تیار کرنی پڑتی ہے۔ اپنی محنت سے بنانی پڑتی ہے لیکن یہ رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ رحمت اس لیے کہ اپنے آپ بنانے اور اپنی تعمیر کرنے کے لیے یہ عمل آزاد ہے اور زحمت اس لیے کہ اندیشہ ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے کہ اپنے آپ کو بنائے بغیر اور اپنی تعمیر کیے بغیر کہیں فوت ہی نہ ہو جائیں۔

اس زندگی میں خود شناسی اور خود نگری کی سب سے بڑا عمل ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان ایک مشین سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔۔۔ جو شخص خوابیدہ ہے وہ ایک نہیں بلکہ بہت سے اشخاص کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک گروہ ہے، ایک انبوہ ہے۔ انسان کے اندر کئی اذہان ایک ساتھ مصروفِ عمل ہوتے ہیں اور بہت سارے

اذہان اور بہت سارے گروہ کوئی فیصل نہیں کر سکتے۔ ایک گروہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا۔ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتا۔ لازم ہے کہ ہم ایک ہو کر ایکتا ہو کر رہیں۔ کثیر المقاصدی ترک کر دیں۔ ہمیں اپنی ذات کا شعور ہونا چاہیے۔ پھر ہی ہم ردِّ عمل سے عمل کی طرف لوٹ سکیں گے۔ یوگی اس ایکتائی کو اپنے مرکز کے حصول کا نام دیتا ہے۔

موت زندگی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ موت پیدائش کے عمل کا ایک اہم جزو ہے۔ موت اچانک اور آناً فاناً وارد نہیں ہوتی۔ پیدائش اور موت زندگی کے دو پول ہیں لیکن اس پیدائش سے ماورا ایک اور بڑی زندگی بھی ہے۔ جب تک اس کا حصول نہیں ہو گا ہم تباہ ہو جائیں گے اور مارے جائیں گے۔

عام زندگی کا چالو دھار اور چکروار حرکت ہم کو کبھی بھی چوٹی کی طرف نہیں لے جاتی۔ آنند کی طرف اور روشن فکری کی طرف نہیں لے جاتی۔ یہ ایک ازلی قانون ہے کہ کوشش کے بغیر ہر شے گر جاتی ہے۔ موت بن بلائے آجاتی ہے۔ لیکن زندگی کو بُلانا پڑتا ہے۔ دعوت دینی پڑتی ہے۔

اگر کوئی شخص مجھے نہ جانے اور نہ پہچانے تو مجھے کوئی افسوس نہیں لیکن اگر میں

خود کو جانوں اور نہ پہچانوں تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔ اس دنیا میں تقریباً سبھی لوگ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر سے پہچانتے اور انہی کی نظر سے جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی تاریکی سے تاریک تر ہوتی چلی جارہی ہے۔ تم اپنے اردگرد کس طرح سے روشنی پھیلا سکتے ہو جب تم اپنے آپ ہی کو نہیں جانتے۔

کیا تم اپنے نفس کو خود کو جاننا چاہتے ہو۔ اس کی اصل معلوم کرنا چاہتے ہو؟ اس کا ایک آسان سانسخہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے 'ناخود' کو اپنے Non-Self کو جاننے کی کوشش کرو، اس کو سمجھو۔ اس کو بکھاؤ۔ پھر اس سے پوری پوری واقفیت حاصل کرو۔ اس کا ادراک پیدا کرو۔ آہستہ آہستہ ہر شے معدوم ہو جائے گی اور اس کے نیچے سے چڑیا کے بوٹ جیسا Self نکل آئے گا۔ وہ خالی خولی، سادامر ادا، بالکل پھوکا ہو گا اور تھوتھا ہی بھرپور ہو گا۔ تھوتھا ہی اصل عین ہو گا۔

جاننا چاہیے کہ ذہن یا خاطر (Mind) وہ نوکر ہے جس نے اپنے مالک کے گھر پر اس کی غیر موجودگی میں قبضہ کر رکھا ہے۔ کیا نوکر چاہے گا کہ اس کا مالک واپس آجائے! وہ اپنے مالک کی واپسی بالکل پسند نہیں کرے گا۔ ایسے ایسے حیلے اور

ایسی ایسی ترکیبیں سوچتا رہے گا کہ گھر کا مالک واپس گھر نہ آ سکے۔ اس کے بہانوں اور ترکیبوں میں سب سے بڑی ترکیب یہ ہو گی کہ وہ خود کو ہی گھر کا اصل مالک سمجھنے لگ جائے اور خود ہی سب کو بتاتا پھرے کہ وہ ہی بلا شرکتِ غیرے مالک ہے۔ چنانچہ ذہن یا خاطر Mind کبھی بھی شعور کو اور Consciousness کو اندر داخل ہونے نہیں دے گا جو اصل مالک خانہ ہے لیکن اگر شعور کو گھر واپس لانا چاہتے ہیں اور حقدار کو اس کے مکان کا قبضہ دلانا چاہتے ہیں تو پھر Mind کو Relax کرنے کا طریق اپنا لیں۔ اس کی کارکردگی اور عمل سے نکال لیں۔ اسے خالی کر دیں، کھلا چھوڑ دیں۔ اس کو نیوٹرل کلچ میں ڈال دیں۔ اس کی موت واقع ہونے لگے گی اور جونہی اس کی موت واقع ہو گی گھر کا قبضہ اصل مالک کو مل جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے نفس کو فتح کرنا بہت ہی مشکل کام لیکن اس سے بڑی بھی اور کوئی حقیقت نہیں کہ اپنے نفس کے بجائے انسان اور کس شے کو کر سکتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی سُن لو کہ جس نفس کو فتح کر لیا اس کے لیے باقی کی ساری چیزیں خود بخود مغلوب ہو گئیں اور یاد رکھو کہ اس دنیا میں بس ایک ہی فتح ہے اور ایک ہی شکست۔ اپنے نفس سے اس کے ہاتھوں ہزیمت کھانا شکست

ہے اور اپنے نفس پر اُسی کے ہاتھوں حکمرانی کرنا فتح ہے۔

علم کہتا ہے میں بالکل خالی ہوں اور تھوتا ہوں اور خلا ہوں اور اس خلا کے اندر ہی خدا ہے۔ جہیل کہتا ہے میں بھرا ہوا ہوں، بھاری ہوں اور میں خود ہی خدا ہوں۔ تکبّر جہیل کو ہمیشہ بیکار، بے معنی اور بے حقیقت رکھتا ہے۔

عظمت سے زیادہ آسان اور کوئی شے نہیں اور آسانی ہی عظمت ہے۔

اخلاق کا ایک طے شدہ مجموعہ مذہب نہیں ہوتا لیکن مذہب یقیناً اخلاق ہی ہوتا ہے۔ اخلاقی ضابطہ یا مورل ایک خاکے اور نقشے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ چند اصول اور ضوابط ہوتے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ باہر سے عائد کیا ہوا ایک حکم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک "اخلاقی آدمی" کبھی بھی فارغ نہیں ہوتا۔ ایک مشین کی طرح چلتا جاتا ہے اور اس ضابطے پر اس کا انحصار بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس سے اس کا شعور بیدار نہیں ہوتا اور وہ آہستہ آہستہ ایک گہری نیند میں اُترنے لگتا ہے۔ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ بالکل نشئی ہو جاتا ہے اور نشے میں ڈوبا ہوا ہیروئن کا عادی بن جاتا ہے۔ اس طرح ایک بد اخلاق آدمی بھی اپنی بد اخلاقی کے ضابطے کا اسیر ہوتا ہے۔ بد اخلاق آدمی اپنے

نفس کا غلام ہوتا ہے اور اخلاقی آدمی معاشرے کے بنائے ہوئے ضابطے کا۔ دونوں ہی باہر کے ضابطے کے پابند ہوتے ہیں۔ دونوں ہی وابستہ اور محتاج ہوتے ہیں۔۔۔۔ آزاد صرف وہ ہے جو اپنےSelf کی تلاش میں ہے اور بالکل آزاد وہ ہے جو اس کو پا جاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے۔ جب تک کسی انسان کو یہی معلوم نہ ہو کہ وہ اصل میں کیا ہے اس وقت تک وہ کیسے آزادی حاصل کر سکتا ہے؟

ایک بات زندگی بھر یاد رکھنا اور وہ یہ کہ کسی کو دھوکا دینا اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ دھوکے میں بڑی جان ہوتی ہے وہ مرتا نہیں ہے۔ گھوم پھر کر ایک روز واپس آپ کے پاس ہی پہنچ جاتا ہے کیونکہ اس کو اپنے ٹھکانے سے بڑی محبّت ہے اور وہ اپنی جائے پیدائش کو چھوڑ کر اور کہیں رہ نہیں سکتا۔

دنیا میں اس سے بڑا اور کوئی عذاب نہیں کہ انسان وہ بننے کی کوشش میں مبتلا رہے جو کہ وہ نہیں ہے۔ گو اس خواہش کی اور اس آرزو کی کوئی حد نہیں ہے۔ ہم لوگ کوشش کر کے اور زور لگا کے اپنے مقصد کو پہنچ جاتے ہیں اور بالآخر وہ نظر آنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو کہ وہ نہیں ہوتے۔ اپنے آپ کو پہچانو اور خود کو جانو اور دیکھو کہ تم اصل میں کیا ہو۔ اپنی فطرت اور اپنے اصل کے مطابق رہنا ہی اس دنیا میں جنّت ہے۔

ایک قبر پر یہ کتبہ رکھا تھا کہ یہاں وہ شخص ابدی نیند سو رہا ہے جس نے اپنی زندگی میں اعلیٰ اور ارفع قسم کے خوابوں اور معمولی قسم کے کاموں سے نفرت کرنے میں گزار دی۔

کیا اس دنیا میں اور کوئی مائی کالال ایسا ہے جو ہم کو دھوکا دے سکے۔ میرا مطلب ہے جو دھوکا ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں اس سے زیادہ دے سکے۔ مذہب کے اندر انسان اس وقت داخل ہوتا ہے جب وہ اپنا بہترین دوست بن جائے۔

جو شخص اپنی انا کے اندر گھرا رہتا ہے وہ دنیا کے جکڑ بندوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ان سے باہر نکلنے کا نام خدا میں بسرام کرنا ہے۔

اپنی انا کو ترک کرنے اور اپنی انا سے جان چھڑانے کا ایک ہی سیدھا راستہ ہے کہ اپنی انا کے اندر چھلانگ لگا دو اور اس کو پاتال تک ڈھونڈو۔ جونہی تم اس کے اندر چھلانگ لگاؤ گے تمہیں پتہ چلے گا کہ اس کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

انانیت سے بڑا جہنم اور کوئی ہے ہی نہیں۔ انا سے جان بچاؤ اور سکھ پاؤ۔

تکبر بھی علم کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیتا۔ جو علم عاجز ہیں، منکر نہیں۔ وہ محض ایک دھوکا ہے۔ ایک گھمنڈ اور تکبّر سے لبریز علم اس بات کی نشان دہی

کرتا ہے کہ یہ علم چوری کا ہے اور دوسروں سے لوٹا گیا ہے۔

ایک آدمی نے کہا میں غلطی کرنے سے اس قدر ڈرتا تھا کہ میں نے ساری زندگی کوئی کام ہی نہیں کیا۔ میں نے کہا اس سے بڑی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان زندگی بھر کوئی کام ہی نہ کرے۔

جو ہے وہ نہیں بھی ہو گا۔ جو موجود ہے وہ ناموجود بھی ہو سکتا ہے۔ جو کام ہو اوہ ملیامیٹ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا میں الجھا ہوا ہے تو وہ اس سے آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا انحصار، آزادی میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے۔

جس چیز کی خواہش میں تم مرے جارہے ہو اس سے تکمیل اور سکون حاصل کرنا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے۔ تم اپنی آرزو پوری بھی کر لو۔ گو ہر مقصود حاصل بھی کر لو، تب بھی وہ وقتی ہو گا۔ جب زبان ہی وقتی اور عارضی شے ہے تو اس کی طلب وقتی اور عارضی کیوں نہ ہو گی۔

گناہ کیا ہے؟ گناہ اپنی پاکیزگی کے بطلان کا اور اپنی پاکیزگی کے انکار کا نام ہے۔ اپنی پاکیزگی کے احساس سے بڑی اور کوئی نیکی نہیں۔

تم نے گناہ چھوڑ دیا۔ بہت اچھا کیا۔ اب مہربانی کر کے نیکی اور ثواب بھی چھوڑ دو

جب تک ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی تمہارا قبضہ رہے گا تمہارا تکبّر برقرار رہے گا۔

خوف کرنا چھوڑ دو۔ خوف سے اجتناب کرو۔ جب تک تم کسی شخص سے خوف کرو گے وہ تم کو نہیں چھوڑے گا۔ وہ ہر لمحہ تمہارا پیچھا کرتا رہے گا۔ تمہاری شکست تمہارے خوف سے نسبت رکھتی ہے۔ جتنا بڑا خوف ہو گا اسی قدر بڑی شکست ہو گی۔

ہم اس دھوکے میں زندہ ہیں کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں ہر راز کا اور ہر بھید کی اصل معلوم ہے۔ ہم اس کی وجہ جانتے ہیں۔ جو ذہن نام نہاد علم سے لبریز ہو گا وہ نامعلوم سے ناآشنا ہو گا اور جہاں کچھ بھی نامعلوم نہیں ہے تحیّر مفقود ہے۔ وہاں کوئی خوشی نہیں، سکون نہیں۔ آنند نہیں۔ میں تو کہتا ہوں اس نام نہاد علم کو جانے دو اور نامعلوم کو آنے دو کیونکر معلوم دنیا ہے اور نامعلوم خدا ہے۔

خود شناسی سے جس قدر آسانی ہے اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ اُسی قدر پیچیدہ بھی ہے۔ خود شناسی ویسا علم نہیں ہے جس سے ہم متعارف ہیں یا جس کی ہمیں تعلیم

دی گئی ہے یا جو ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے۔ یہ ایک موضوع اور کتاب کا رشتہ نہیں۔ ایک منظر اور ناظر کا عمل نہیں۔ تو ایک عجیب اور عظیم علم ہے۔ اس کے حصول کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا۔ نہ معلوم نہ نامعلوم، نہ گیان نہ مورکھتا۔ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

تم اتنا تو جانتے ہو کہ تم موجود ہو لیکن تم کون ہو، کیا ہو اس کا علم تمہیں نہیں ہے۔ اب اس سلسلے میں کیا کیا جائے۔ اب اس سلسلے میں یہ کیا جائے کہ پہلے اپنی صلاحیت کو جانچا جائے اور اس بات کو تولا جائے کہ تم میں اس بات کا علم حاصل کرنے کی کتنی قوّت موجود ہے۔

جب علم کسی شے کے ساتھ یا موضوع کے ساتھ وابستہ کیا جائے تو وہ علم اس شے پر یا اس موضوع پر بیٹھ جاتا ہے جیسے مرغی انڈوں پر بیٹھتی ہے۔ جب علم کسی شے کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے تو اس وقت وہ اپنی اصل فارم اور شکل میں ہوتا ہے۔ وہ اصل شکل وہ اصل فارم اور وہ خالی پن ہی دراصل خودشناسی اور خودفہمی کا علم ہوتا ہے۔

لاؤٹزے نے فرمایا کہ ”سچ کے بارے میں جو چاہو کرلو، جس طرح چاہو اس کی

وضاحت کرلو، تمہارا کہنا اور وضاحت کرنا ہی سچ کو ناسچ کر دے گا۔"

وہ شخص جو اپنی ذات کو تلاش کرتا ہے۔ اپنے Self کو اس طرح سے ڈھونڈتا جیسے وہ دوسری چیزوں کو ڈھونڈا کرتا ہے تو وہ ہمیشہ غلط راستے پر ہوتا ہے۔ سیلف مطالعے کی شے نہیں ہے۔ اس پر نشانہ نہیں باندھا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ڈھونڈنے والے کی فطرت، اُس کے جوہر کا نام ہے۔ اُس میں شے، اس کی ڈھونڈ اور ڈھونڈنے والا سبھی ایک چیز ہیں۔ پھر اس کو کھوجا کیسے جا سکتا ہے۔ البتہ جو لوگ کسی اور چیز کی تحقیق میں یا تلاش میں نہیں ہیں وہ اسے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو ہر طرح کے علم سے خالی کر دیتے ہیں وہ اس کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

کسی نے بُدھا سے پوچھا "بابا تم نے دھیان کے اندر کیا پایا؟" بُدھا نے کہا "کچھ بھی نہیں پایا، البتہ کھو بہت کچھ دیا۔ میں نے لالچ کو کھو دیا، ہوس کو کھو دیا، کام، کرودھ کو کھو دیا اور پایا وہی کچھ جو ازل سے تھا اور بس وہی سب کچھ تھا اور وہی سب کچھ ہے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ تم ایک گلاب نہیں بن سکتے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اگر

تم گلاب نہ بن سکو تو پھر ایک کانٹا بن جاؤ۔ یہاں ایک راز کی بات ہے اور وہ میں تمہیں بتا ہی دیتا ہوں کہ جو کانٹا نہیں بنا وہ بالآخر گلاب بن جاتا ہے۔

جو شخص اپنے اندر ہی اندر گہرا چلا جاتا ہے وہی اُوپر کو اُٹھتا ہے اور وہی رفعت حاصل کرتا ہے۔ یہ قدرت کا اصول ہے۔ جو درخت جس قدر گہرا زمین کے اندر جائے گا اسی قدر اُوپر کو جا سکے گا اور اس قدر تناور ہو گا۔

ہم اپنی ساری زندگی اوپر ہی اوپر، اپنے خول کے شعور اور اپنے باہر کو جاننے پر لگا دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اصل انسان ہمارے اندر رہتا ہے۔ جب میں اپنے اندر نگاہ مارتا ہوں تو اس کے اندر کچھ الفاظ، کچھ تصوّرات، کچھ خیال، کچھ یادیں، کچھ شکلیں اور کچھ خواب پاتا ہوں۔

کہتے ہیں تمام آرٹ اور سارے جمال کی بنیاد مذہب ہے۔

انسانی تاریخ میں انسان صرف بنیادی ضرورتوں اور اقتصادی مسئلوں کے حل کرنے کے لیے ہی زندہ نہیں رہا بلکہ اس کے علاوہ بھی زندہ رہا۔ کبھی کبھی تو زندگی کی حفاظت سے بے نیاز ہو کر اور اپنی بقا کو بھلا کر بھی انسان کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اپنی زندگی کا بلیدان دیتا ہے۔ اصل میں وہ اپنے وجود اور اپنے ہونے کا

راز بھی دریافت کرتا رہتا ہے۔ اب بھی کر رہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ یہ کہ سچ کیا ہے؟ خدا کون ہے؟ اور اس سوالوں سے بھری ہوئی دنیا میں مَیں کون ہوں؟ کیا میرا اپنا بھی کوئی وجود ہے یا میں صرف اپنے ماحول کے حوالے سے پہچانا جاتا ہوں۔ اس موضوع پر پھر کبھی تفصیل سے بات ہو گی۔ آپ کوشش کیجئے گا کہ آپ اپنی، عقل فہم اور ہوش کے استعمال کے ساتھ ساتھ اپنی اصل کا بھی تجزیہ کریں جو بہت ضروری ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

&Corporate Society

Premature Living

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

زمانہ جب سے معرضِ وجود میں آیا ہے اسی ڈگر پر چل رہا ہے وہ جس کو ہم زمانہ قبل از تاریخ کہتے ہیں یا جس کو پتھر اور دھات کا زمانہ گردانا جاتا ہے۔ اس میں اور موجودہ دور میں کوئی خاص فرق نہیں۔ صرف لباس، رہائش اور شکل وصورت بدل گئی ہے۔ زندگی کا چلن اور معاشرت کا روئے سخن اسی طرف کو ہے جس طرف پہلے تھا۔

پہلے بھی بادشاہ، نواب، سردار پنج ہزاری، ست ہزاری ہوتے تھے۔ اب بھی حکومتوں اور حکومتوں کو چلانے والے تجارتی اداروں میں ایک سردار ہوتا ہے۔ ان کے نام اب اور ہو گئے ہیں۔ بورڈ کا چیئرمین، ایگزیکٹو، گورنر، جنرل منیجر، منیجنگ ڈائریکٹر، پریذیڈنٹ، چیئرمین۔

ادارے کے سارے کردار وہی پرانا رول ادا کرتے ہیں جو رول زمانہ قبل از تاریخ

کے لوگ ادا کیا کرتے تھے۔ آج کا سیلز مین وہی پرانا شکاری ہے۔ مزدور، غلام ہے (فیکٹری ورکر غلام زادہ ہے) مینجنگ ڈائریکٹر، سردار ہے۔ بورڈ اور ڈائریکٹر وہی پرانا جرگہ ہے، بڑوں کا جرگہ یا بڑوں کی پنچائیت، سٹینو، سیکرٹری، فائل، کلرک، چپڑاسی، اکاؤنٹنٹ اور دوسرا عملہ وہ ہانکے والے ہیں جو شکار کو گھیر کر نرغے میں لاتے ہیں۔
گویا ہم سارے پتھر اور دھات کے زمانے کے مرد اور عورتیں ہیں فقط ہماری صورتیں اور لباس تبدیل ہو گئے ہیں۔

پچھلے پچاس ساٹھ لاکھ سال سے جوان مرد مل کر شکار کرتے رہے۔ جنگل میں انسان چھوٹا کمزور، سست اور بے حفاظت تھا۔ اس لیے ان کو مل کر شکار کرنا پڑتا تھا۔ ابتدائی قبیلوں میں جن گروہوں کے پاس سامان خوردونوش فاضل تھا۔ حملہ کرنے کی طاقت زیادہ تھی وہ زندہ رہے باقی مٹ مٹا گئے۔ ایک اکیلا یا چھوٹا گروہ خود ہی آفت کی تاب نہ لا کر ختم ہو گیا۔ جو غول کے اندر رہے وہ کامیاب رہے اور ان کی کامیابی کی یہ خصوصیت ان کے ساتھ چلتی چلتی آج کے جمہوری گروہ تک پہنچ گئی اور پارٹی سسٹم پر مضبوط ہو گئی۔

انسان کے لیے سب بڑا غارت گر درندہ انسان ہی ہے۔ اس کے سامنے چھوٹا اور کمزور گروہ مار کھا جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ حملہ آور درندے (انسان کے روپ میں) اس کے مردوں کو ہی مارتے تھے کیونکہ مردوں کے ختم ہونے سے گروہ خود بخود کمزور ہو جاتا تھا۔ جو بڑے گروہ کو آپریٹیو یا امدادِ باہمی کی بنیادوں پر دوسرے

گروہوں سے لڑتے تھے وہ خوب کامیاب ہوتے تھے۔

سیاسی ادارے بھی اپنے اپنے قبیلے بنا کر رکھتے ہیں۔ گاؤں تنظیم، ضلع تنظیم، صوبہ تنظیم اور ملکی تنظیم پھر وہ پرانے قبیلوں کی طرح بھلائی کے کاموں اور اپنے لوگوں کی دیکھ بھال اور انہیں سکھ پہنچانے کے لیے بھی رفاعی ادارے بناتے ہیں جن میں پولیس، محکمہ ذرائع آمدورفت، مواصلاتی ادارے اور ملکی دفاع بہت ہی اہم ہیں۔ جو لوگ اپنی حفاظت کے لیے حکمرانی سیاسی ادارے کی فیس جمع کراتے ہیں وہ وہی لوگ ہیں جو اپنی حفاظت کے پرانے زمانے میں سردار کو اور اس کے قبیلے کو جزیہ دیا کرتے تھے۔ ووٹ وہ شناختی نشان ہے جسے دیکھ کر قبیلے کا بڑا جان لیتا ہے کہ ہمارا ہی آدمی ہے۔

سب سے بڑا سردار حکمران پارٹی کا سربراہ ہوتا ہے۔ وہ پرانے قبیلہ سردار کی طرح اپنے بندوں کو مرنے، مارنے اور اس خطہ زمین کی حفاظت کرنے پر مامور کرتا ہے جس میں قبیلہ سردار رہتا ہے۔ قبیلہ سردار کی فوج کی چھاؤں تلے اس گروہ کے دینی اور درسی ادارے، سکول، عبادت گاہیں اور تجارتی ادارے پرورش پاتے ہیں۔
ٹیلیویژن وہ جھروکے درشن ہے جس میں قبیلہ سردار بیٹھ کر اپنے درشن کراتا ہے اور لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ ٹیلیویژن نے اب چوپال کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہے جہاں شام کو بستی کے لوگ جمع ہو کر شکار پر نکلنے یا کسی پر حملہ کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح پرانے زمانے میں رات کو لوک رقص اور لوک گانے ہوتے

تھے، اسی طرح یہی کام اب ٹی وی کرتا ہے۔ پہلے زمانے میں قصّہ سُنانے والے، داستان گو اور رزمیہ نظمیں پڑھنے والے اپنے بندوں اور غلاموں کو حاضرین بنا کر رکھتے تھے اور سرکاری ڈونڑی پیٹتے تھے۔ یہی کام اب ٹی وی کے ذمّہ ہے۔ جس طرح پرانے زمانے کے ہیرو اور قبیلے کے جنگجو پرستش کیے جاتے تھے اب وہی ہیرو، ایکٹروں، ایکٹرسوں اور کھلاڑیوں کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

پرانے زمانے میں بچّے آزاد کھیلتے تھے اور جب وہ جوان ہوتے تو سردار کی بتائی ہوئی رسم کے مطابق انہیں جنگجو گروہوں میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اب جب بچّہ جوان ہوتا ہے تو اس کو ڈگری دے کر اور ملازمت کی رسم ادا کر کے اداروں میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں جوان کے قبیلے کے کارکن گروہ میں شامل ہونے کے لیے پروں کی کلغیاں اور پھولوں کے ہار اور رنگ برنگی راکھ بدن پر لتھیڑ کر شامل کیا جاتا تھا۔ اب ان کو رنگ برنگے گاؤن، پھمن والی ٹوپیاں اور ہاتھوں میں رولز آف آنر دے کر داخل کیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں جوان کو شکار مارنے، شکار تلاش کرنے اور موقع آنے پر دوسرے قبیلے کے لوگوں کو ختم کرنے کے لیے رکھا جاتا۔ آج کے زمانے میں اسے روٹی کما کر لانے، اس کا ذخیرہ جمع کرنے اور مدِّ مقابل کو شکست دے کر اپنے لیے نئی راہیں پیدا کرنے پر متعیّن کیا جاتا ہے۔

آج کے ادارتی قبیلے کا بھی ایک ہی مقصد ہے، خوراک کے ذرائع پیدا کرنا۔ گوشت کا نعم البدل جمع کرنا۔ اس پوری دنیا میں نسل بعد نسل، انسانوں کے گروہ ایک جیسے اور

ایک سی صفات کے حامل چلے آتے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ تمام انسانی گروہ کسی قدیم قدرت کے اصولوں پر چلے آرہے ہیں جن پر ہمارے باپ داداEvolution سے پہلے اور Evolution کے بعد چلتے آئے۔ جس چیز کو ہم جمہوری معاشرے کا نام دیتے ہیں یہ حقیقت میں جدید قبائل ہیں اور ان میں قبائلی کی سوچ کارفرما ہے۔ اپنی زمین میں وسعت پیدا کرنا اور پڑھنے پھولنے کی صلاحیت اپنانا۔ اب دولت پیدا کرنا علاقائی توسیع اور اداروں میں بڑھوتری اہم کام ہے۔

اگلے زمانے میں سِکّہ کی جگہ بھیڑ بکریاں اور مویشی دولت کی نشانی تھے۔ جس کے پاس زیادہ مال ہوتا وہی مالدار کہلاتا تھا۔ لیکن اس میں ایک بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کسی بھی شخص کے ڈھور ڈنگر اور مال مویشی سردار کے مال سے زیادہ نہ ہوں۔ آج کے زمانے میں تجارتی ادارے مال مویشی کی بجائے سِکّہ سے کام لیتے ہیں۔ ادارے کے کارندوں کو اچھے اچھے القاب اور ڈیزگنیشن دی جاتی ہیں لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ان کو سکّوں کی صورت میں زیادہ معاوضہ نہ دیا جائے کیونکہ زیادہ معاوضہ صرف مالکانِ ادارہ کا حق ہے اور ان کے کوئی کام نہ کرنے کے باوجود ہوتا ہے۔ بڑا سرمایہ بڑے بونس، رہائشی آسانیاں، شیئرز سارے کے سارے سردار کے لیے اور اس کے خانوادے کے لیے ہوتے ہیں۔ خواتین و حضرات ہم قدیم اور جدید طرزِ زندگی کو ایک مختلف نظر سے یوں بھی دیکھ سکتے ہیں:

1. پرانے قبیلوں اور جدید اداروں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں میں مرد اور

عورتیں کارکن گروہوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

2. دونوں میں Hierarchy کا سسٹم کیا ہوتا ہے۔ چوٹی پر ایک فرد ہوتا ہے اور باقی سب درجہ بدرجہ اس کے نیچے ہوتے ہیں۔ جانوروں کے غول میں بھی یہی طریقہ کارفرما ہے۔

3. دونوں کی کارکردگی بڑوں کی کونسل یا جرگہ کے ماتحت ہوتی ہے جس سے رائے لی جاتی ہے۔

4. دونوں اپنے اپنے عہد کے "ماہرین" کی رائے کے تابع ہوتے ہیں۔ پہلے زمانے میں جادوگر، ساحر، روحانی پیشوا اور ستارہ شناس ماہر ہوتے تھے۔ آج کل اونچے انجنیئر، بڑے وکیل، مالی امور کے جادوگر اور سیاسی بصیرت والے ماہرین ہوتے ہیں۔

5. دونوں میں پیداوار کا بڑا حصّہ قبیلہ سرداروں اور کمپنی چیئر مینوں اور سیاستدانوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے۔

6. دونوں اپنے لیے بہترین جگہ کا انتخاب کرکے رہتے ہیں چاہے وہ اونچان پر جھوپڑا ہو یا کانفرنس ٹیبل کا اہم پاسہ۔ چاہے لپا تپا چبوترا یا اوپن ویو والا دفتر۔

7. دونوں کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔ بہترین زندگی اور اپنی زندگی کا خوشگوار

تسلسل۔

8. دونوں جگہ جگہ گھوم کر نئی نئی شکار گاہیں تلاش کرتے ہیں۔ پرانے قبیلے قریبی جنگلوں میں نئے قبیلے دُور دراز کے ملکوں میں مال بیچ کر اور اپنی انڈسٹری کے کارخانے قائم کر کے ایسا کرتے ہیں۔

خواتین و حضرات! اس لیے پرانے قبائلی اور جنگلی نظام اور طرزِ معاشرت اور آج کے اداروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ ہم نے اپنے دل میں نفرت اور کدورت کو پہلے سے کہیں زیادہ جگہ دے دی ہے۔ پہلے زمانے کا انسان اپنا جسم ڈھانپنے کی کوشش کرتا تھا اور اس میں جنگلی ہونے کے باوجود یہ شعور موجود تھا کہ اس نے اپنے جسم کو ڈھانپ کر رکھنا ہے۔ اگر کچھ اور یا مختلف زاویوں سے دیکھا جائے تو شاید ہم پہناوے کے حوالے سے اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ میرا یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد کسی فرد، گروہ یا معاشرے پر تنقید کرنا نہیں تھا بلکہ یہ بتلانا مقصود تھا کہ ہم اس ساری صورتحال میں جدید ترین زندگی کا دعویٰ کیونکر اور کیسے کرتے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

انسان اور چوہا

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبّت بھرا اسلام پہنچے۔

انسان اور چوہے بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بہت ہی قریب ہو کر ملتے ہیں۔

1) دونوں پھل کھاتے ہیں، اناج کھاتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں، مغز، انڈے، مچھلی کھاتے ہیں اور اگر کچھ نہ ملے تو ایک دوسرے کو کھاتے ہیں۔

2) دونوں پر ایک جیسی بیماریاں اثر انداز ہوتی ہیں کیونکہ دونوں کا نروس سسٹم اور غذائی نظام ایک جیسا ہے۔

3) دونوں سخت سے سخت موسم میں زندگی گزار سکتے ہیں۔ بحرِ منجمد شمالی میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں اور صحرائے کالا ہاری میں بھی۔ دوسرے جاندار ہر موسم میں زندہ نہیں رہ سکتے۔

4) دونوں موسیقی کے شوقین ہے۔ چوہے بھی موسیقی سُن کر دانت بجاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

5) چوہے بھی انسانوں کی طرح خوشیاں مناتے اور قلابازیاں لگاتے ہیں۔ موج میلہ کرتے ہیں۔

6) ایک بات میں چوہے انسانوں سے بہتر ہیں کہ نسل کشی میں بہت مہارت رکھتے ہیں۔ ماہرینِ حیوانیات کا دعویٰ ہے کہ اگر چوہوں کا ایک جوڑا باقاعدگی سے بچّے پیدا کرتا رہا اور چوہے اور چوہیا میں کوئی ذہنی، جسمانی اور جنسی اختلاف پیدا نہ ہو اور ان کے سیاسی اور خانگی حالات ٹھیک رہیں اور ان کے درمیان کوئی اور چوہیانہ آجائے تو ایک جوڑا پانچ سال کی مدّت میں نو کھرب چالیس ارب چھتیس کروڑ ننانوے لاکھ انہتر ہزار ایک سو بائیس بچّے پیدا کر سکتا ہے۔

7) سائنس کی دنیا میں اپنی ذات کی قربانی دے کر چوہے نے کمال کی دوائیں اور علاج دریافت کر کے دیئے ہیں۔

8) اب فرق یہ ہے کہ وہ صرف کھاتا ہے، پیتا ہے، بچّے پیدا کرتا ہے اور ساری زندگی بلّی سے کنی کترا کر گزارنے میں صرف کر دیتا ہے اور

چوہے دان سے پرے رہتا ہے۔

اس کو شاعری سے، مصوری سے، فلسفے سے، یا خلائی فزکس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ بِلوں میں، اینٹوں کے انبار میں، ٹرکوں کے پیچھے اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے۔

کسی چوہے نے نہ تو غالب کا نام سُنا ہے، نہ چغتائی کی تصویریں دیکھی ہیں، نہ آئن سٹائن پر بات کی ہے اور نہ کارل مارکس کی سوانح عمری سے معنی اٹھایا ہے۔

یعنی چوہے کی کوئی روحانی یا فکری زندگی نہیں ہوتی۔

اور دنیا میں آج تک کوئی چوہا ایسا پیدا نہیں ہوا جس کو کوئی اخلاقی پرابلم ہوئی ہو۔

ایک اچھا اور نیک چوہا وہ ہوتا ہے جو اپنی جبلتوں کے سہارے آرام کی زندگی بسر کرتا چلا جائے۔ چنانچہ ایک چوہے کے اندر کوئی اندرونی خلش نہیں ہوتی۔

اس کو کبھی یہ سوچنا نہیں پڑتا کہ ایک صوفی چوہا بن کر زندگی گزارے یا ایک دنیا دار چوہا بن کر موج اڑائے۔

اس کے مقابلے میں انسان کو ہزار انجمنیں اور لاکھوں Conflict ہوتے ہیں اور وہ ان کے درمیان اختیاری اور بے اختیاری کی کشتی پر سوار بڑھتا چلا جاتا ہے۔

انسان اسی صورت میں انسان ہے کہ اپنی بنیادی جبلّتوں پر کنٹرول کر کے انہیں ایک حساب کے ساتھ عمل میں لائے۔ ان جبلّتوں پر جو وہ دوسرے جانداروں کے ساتھ Share کرتا ہے۔

وہ چوہے کی طرح اپنی جبلّت کو اپنا قائد مان کر اس کے علم اور اشاروں پر نہیں چلتا۔

یہ بڑا مسئلہ جس کے ساتھ ہمارے اور دوسرے چھوٹے مسئلے بندھے ہیں، ابھی تک انسان کی گرفت میں نہیں آیا اور وہ اس پر حاوی نہیں ہو سکا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ابھی اس بڑے مسئلے کا کوئی حل نہیں ڈھونڈ سکا۔

نہ ہی یہ دکھائی دیتا ہے کہ کوئی آگے بڑھ کر ہمارا یہ مسئلہ حل کر دے گا اور ہمارا رہنما بن کر مستعدی کے ساتھ کھڑا ہو جائے گا اور ہم اس کی ہر بات کو تسلیم کرنے لگیں گے جیسا کہ چوہا اپنی جبلّت کی ہر بات مانتا ہے۔

کچھ یوں لگتا ہے کہ ہمارے اوپر کبھی بھی وہ وقت نہیں آئے گا جب ہم اخلاقی مسائل سے عہدہ برا ہو جائیں گے۔ اور یہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ انسانوں پر کبھی بھی ایسا وقت نہیں آئے گا جب وہ اندرونی خلفشار سے نکل کر آرام اطمینان سے باہر جائے گا۔ فرق ہے جو ہمارے اور چوہے کے درمیان باقی ہے۔ اس کو

کوئی فکر نہیں، کوئی الجھن نہیں لیکن ہم میں سے کوئی بھی چوہے کے ساتھ اپنی زندگی بدلنے کا خواہشمند نہیں ہو گا۔

یہ ایک ایسی بات ہے جو کوئی چوہا آج تک سمجھ نہیں سکا۔

اور یہی وجہ ہے جس کی بنا پر چوہا چوہا ہے۔

جب ہم کوئی جوانمردی کا کام کرتے ہیں تو اپنے آپ کو اور دوسروں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم وہ نہیں جو ہم کو سمجھا جا رہا ہے یا سمجھا جاتا رہا ہے۔ ہمارا اصل سیلف گندا، لالچی، منافقی، سنگدل، بدمعاش اور کانا ہے لیکن اب ہم نے موت سے بازی لگا کر ان ساری چیزوں کا بطلان کر دیا ہے۔

Nature (قدرت) تکمیل اور کمال حاصل کر لیتی ہے لیکن انسان نہیں۔ اس وقت آپ کو ایک مکمل شہد کی مکھی ملے گی۔ ایک اعلیٰ چیونٹی ملے گی۔ ایک مستند اور مکمل شیر لے گا۔ لیکن انسان ابھی تک تکمیل کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ وہ ابھی تواتر کے ساتھ نامکمل ہے۔ ایک نامکمل جانور ایک نامکمل انسان! بس یہ نا تکمیلی (Unfinishedness) کا روگ ہے جس نے انسان کو دوسری ساری مخلوق سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ اپنے آپ کو مکمل کرنے کے عمل نے انسان کو ایک تخلیق کار بنا دیا ہے۔ نامکمل کے روگ نے اس کو ناپختہ بھی بنا رکھا ہے اور

تسلسل کے ساتھ حاصل کرنے اور گرو (Grow) کرنے پر مجبور بھی بنا دیا ہے۔

انسان کی تخلیق کاری کا کمال اس کی کمیوں اور نارسائیوں میں ہے۔ وہ اپنے آپ کو مکمل کرنے کے لیے تخلیق کرتا رہتا ہے اور کرے جاتا ہے۔ وہ انسان سازندہ بنتا ہے تو ہتھیار اور اوزار بناتا ہے۔ انسان کچھ اور بنتا ہے تو ایک کھلاڑی ایک بت تراش اور ایک بازی گر بن جاتا ہے جو جو کمی اس کو نیچر کے دوسرے مظاہر کے مقابلے میں نظر آتی ہے اس کی مکافات فوراً کر لیتا ہے۔ اس میں ٹیلی پیتھی اور کشف کا کمال نہیں تھا۔ جس سے جانور ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھا دیتے ہیں۔ اس طرح انسان نے بھی فوراً زبان ایجاد کر لی اور گِٹ مِٹ، گِٹ مِٹ بولنے لگا، سمجھنے لگا اور سمجھانے لگا۔ جہاں جہاں اس کی جبلت کمزور پڑتی تھی اس نے وہاں سوچ اور تفکّر کی آبیاری کر کے کام چلا لیا۔

انسان اپنے انسان ہونے کا کمال اس وقت دکھاتا ہے جب اس کو کوئی اڑچن پڑتی ہے اور وہ اس کا حل ڈھونڈ کر وہ رکھ دیتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ جانور بھی سیکھ سکتے ہیں اور وہ سیکھتے بھی ہیں لیکن کتّا، بلّی، بندر، گھوڑا کسی سکھشا کی وجہ سے کتّا، بلّی، بندر، گھوڑا نہیں کہلاتے لیکن انسان صرف سیکھنے کی بنا پر انسان کہلاتا ہے۔ اور چوہا نا سمجھی اور بے فکری کے باعث چوہا کہلاتا

ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

روح کی سرگوشی

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔

جھوٹ میں اپنی کوئی ذاتی اور موروثی (Inherent) طاقت نہیں ہوتی۔ جھوٹ کو تو اپنی (Existence) کے لیے بھی سچ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جن سے اس کی طاقت ادھار لینی پڑتی ہے۔ اس طرح روحانیت کی بنیادی بھی سچ پر ہے۔ آپ مجھ سے کئی بار سوال کرتے ہیں کہ اشفاق صاحب یہ روحانیت کیا ہوتی ہے۔ اس میں کیسے داخل ہوا جاسکتا ہے۔

روحانی کردار کا مطلب ہے قدرتی، نیچرل کردار، نیچرل کردار کا مطلب ہے سچّا اور راست کردار۔ اس روحانی کردار اور روحانیت کے خواص حاصل کرنے کے لیے مراقبے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مراقبہ کئی قسم کا ہوتا ہے لیکن یہ چھ قسمیں زیادہ توجّہ طلب ہیں۔

1) اپنی ذات کا مشاہدہ باطن اور اس کا تجزیہ۔

2) خدا کی ذات اور اس کی صفات پر تفکّر۔

3) تسلسل کے ساتھ اور حقیقت کی تفہیم۔

4) اسمائے حسنیٰ کا درد۔

5) اس کائنات میں اللہ کے رچائے ہوئے کھیل کا تفصیلی جائزہ۔

6) پاکیزہ زندگیوں کا قریب سے مطالعہ۔

انا کا اور خود پسندی کا ان نو ستونوں پر محل استوار ہے (لیکن جلد ہی یہ محل کھنڈر میں تبدیل ہو جاتا ہے) ستون یہ ہیں۔

(1) طاقت کا گھمنڈ۔ (2) حسنِ وجود کا گھمنڈ۔ (3) خاندانی برتری کا تکبّر۔ (4) علم کا گھمنڈ۔ (5) تجربے کا گھمنڈ (بابائے ثقافت، بابائے سیاست وغیرہ)۔ (6) ذہانت اور (7) Ability کا غرور۔ اپنے اعلیٰ کردار کا گھمنڈ لیکن ان سب میں سے خطرناک ترین گھمنڈ اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ سے ڈر کر کہتا ہوں مجھ میں غرور تکبّر کا نام ہیں۔ مزہ تو تب ہے کہ وجود اور ذہین سے جب سے پوچھا جائے کہ وہ کہاں رہنا چاہتا ہے تو مکالمہ اس انداز کا ہو۔

”اچھا میاں! کہاں رہنا چاہتے ہو؟“

"کہیں بھی سرکار۔"

"ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔"

"حضور میں نیکو کاروں، بھگتوں اور انعام یافتہ لوگوں کی کمپنی میں رہنا چاہتا ہوں۔"

"ایک دفعہ اور غور کرلو۔"

"حضور میں روح کی گہرائیوں میں رہنا چاہتا ہوں۔"

اگر اپنی جائیداد، اپنی چیزوں اور اپنی آل اولاد کی دیکھ بھال پر ساری توجّہ، سارا وقت اور ساری طاقت لگ جائے تو یہ میرے باطن کو بے عزّت کرنے کا کامیاب ترین فیصلہ ہو گا۔

نیکی اور بدی کا تصوّر میرے اندر خرابی پیدا کرتا ہے اور وہی اس کی رغبت پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں کیا کریں اور کس طرح سے کریں۔

صلاحیت، نالائقی اور نااہلی سے بہتر ہے لیکن سارے دعوؤں سے دلکش ہو جانا صلاحیت سے بھی برتر ہے۔

اخلاق کا تقاضا اتنا ہے کہ آدمی خواب میں بھی ہوشیار اور چوکس ہو اور اس سے

کوئی بھول نہ ہونے پائے۔

ابدی نیند بھی بڑی ضروری، بڑی سہانی ہوتی ہے اس شخص کے لیے جس نے زندگی بھر شدید محنت کی ہو۔ دیکھا جائے تو موت بھی خدا کا ایک مدھم سا روپ ہے۔

مغرب کی نماز اور اس کے بعد کا مراقبہ اور ذکر اذکار بھی ایک طرح سے موت سے پہلے خدا کی یاد کا سماں ہوتا ہے۔

ارفع خیالات اور روحانی اذکار کا مسخ شدہ بیان بھی بڑا نقصان دہ عمل ہے جس طرح اچھا پھل صحت بخش ہوتا ہے وہی پھل گل سڑ جائے تو نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اور کھانے والے کو بیمار کر دیتا ہے۔

اگر پرانا اصول یہ ہے کہ خیرات صرف حقدار کو دینی چاہیے اور خاص مقام پر خاص وقت میں دینی چاہیے تو پھر اپنی ذات کو بھی اسی طرح سے، اسی جماعت میں شامل سمجھیں۔

قربانی، کمزور آدمیوں کا فعل نہیں ہوتا۔ صرف بہادروں کا ہی شیوہ ہو سکتا ہے۔

طاقت، فراوانی اور عظمت اور شان و شوکت، خدا کی صفات ہیں۔ بندے کو ان

کے حصول کی تمنّا نہیں کرنی چاہیے۔

کسی شخص سے اُس کا غلّہ بندوق کی نوک پر حاصل کرنا اور وہی غلّہ اسے رقم دے کر حاصل کرنا دو ایسے عمل ہیں جن میں بعض اوقات تفریق کرنا (بعض آدمیوں سے) بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

مذہب ایک ایسا پُل ہے جو دنیاوی بندھنوں سے بچا کر مطلوبہ عافیت اور کی طرف لے جاتا ہے۔ اس پُل کا ایک سرا دنیا کے اندر قائم ہوتا ہے اور دوسرا مکتی کے اندر۔

زندگی کے اندر اور زندہ رہنے کی خواہش کے اندر موت کا بیج موجود ہوتا ہے۔ جونہی زندہ رہنے کی خواہش ختم ہو جاتی ہے، موت کا بیج تباہ ہو جاتا ہے۔

خدمت قریب قریب کی۔ ادب دور کا۔ اور علم اندر کا۔

گنگا کا پانی کبھی گدلا کبھی صاف کبھی چمکدار۔ لیکن ہر حال میں متبرّک اور پاک۔ یہی حال روح کا ہوتا ہے۔ اس کی تقدیس بھی اس کی ہر دم بدلتی حالت کے اُوپر موجود رہتی ہے۔

بابا لوگ اور سَنت فقیر مخلوق خدا کی خدمت پر اس قدر کیوں مائل ہو جاتے ہیں؟

وجہ یہ ہے کہ جب ان کو ہر ذی روح میں خدا کا وجود نظر آنے لگتا ہے، وہ اس کی خدمت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ماں بچّے کو کوئی دینی یا روحانی کتاب پڑھ کر دودھ پلانے کافی نہیں سیکھتی۔ یہ کام اُسے آتا ہی ہوتا ہے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ روح کی دولت ہر شخص کو ملی ہے لیکن روح کا علم کسی کسی کا مقدر بنتا ہے۔

مصوّر اپنی ہی بنائی ہوئی تصویر کا جائزہ اس کے قریب کھڑے ہو کر نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنی تصویر کے خدوخال ملاحظہ کرنے کے لیے دُور سے دیکھنا پڑتا ہے۔ قدرت کے راز سمجھنے کے لیے بھی ان سے علیحدہ اور منقطع ہو کر رہنا پڑتا ہے۔

ڈوبتے ہوئے کے ساتھ ہمدردی کرنے کا یہ طریق نہیں کہ خود بھی اس کے ساتھ لگ کر ڈوب جائیں۔ ہمدردی کے لیے تیرنا آنا چاہیے اور ڈوبتے کو بچانا چاہیے۔

تنفّس پر کنٹرول حاصل کرنے سے اور اس کی شکست سے واقفیت حاصل کر کے ایک خوفزدہ ذہن سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

شیر کو ایک خونی درندہ Killer کی حیثیت سے رُک رُک کر اور پھونک پھونک

کر چلنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیر جب بھی چلتا ہے مُڑ مُڑ کر پیچھے دیکھتا جاتا ہے۔ جنہوں نے کسی جان دار پر کوئی تصرّف نہیں رکھا ہوتا وہ پر سکون رہتے ہیں اور بِلا خوف وتردد اپنا سفر طے کرتے ہیں۔

کسی خوراک کے ساتھ فریفتگی کے ساتھ وابستہ ہونا بھی تندی، سختی اور خشونت درستی(Violence)کے ذیل میں آتا ہے۔

شاستروں میں لکھا ہے کہ ایک صاحبِ علم کو ایسا ہو کر رہنا چاہیے جیسے کہ وہ ایک احمق شخص ہو۔ احمق اور بھوندو بن کر رہنے سے آدمی اپنے کام میں پورے کا پورا شریک ہو جاتا اور اس کی توجّہ کسی اور طرف نہیں ہوتی۔ دیئے گئے کام میں جُتنے کا یہی طریق ہے۔ سادگی بھی انسان کو اس کے وجود اور خُدا سے قریب کر دیتی ہے اور آدمی کئی مشقتوں سے بچ جاتا ہے۔

سادگی اور سادہ روی کے تین فائدے ہیں:

(1)زبان کی پاکیزگی(2) تخلیقی قوت اور(3)روحانی علوم کا حصول۔

اگر سادہ روی کے دوران پچھلی دو چیزوں سے وابستگی نہ بھی ہو تو بھی یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ مل جاتی ہیں۔

بابے کہتے ہیں کہ خدمت ایک ایسی چیز ہے جو انا کی دیواریں گرا دیتی ہے اور انسان کو اس کے باطن سے ہم کلام کر دیتی ہے۔ ہماری دُعا ہونی چاہیے کہ اے اللہ میں نہ تو دنیاوی لذّتیں حاصل کرنے کا آرزو مند ہوں اور نہ ہی روحانی سربلندیوں کو پانے کا خواہشمند ہوں۔ مجھے ان دونوں کے بجائے سپردگی اور عبدیت کی دولت چاہیے۔

اس طرح نہ تو مجھے مافوق الفطرت طاقت درکار ہے نہ ہی مراقبے اور مکاشفے کی دولت کی خواہش ہے۔ دینی ہے تو مجھے ناداروں اور بے چاروں کی خدمت کی طاقت دے دے تیری مہربانی!

خواتین و حضرات! جو کچھ میں نے اپنے شاگردوں سے سیکھا ہے اس کے بدلے میں مَیں نے انہیں کچھ بھی عطا نہیں کیا۔ میری سروس اُن کی عطا کے مقابلے میں بہت ہی مختصر ہے۔ اس زندگی میں کوئی ''نہیں'' نہیں ہونی چاہیے۔

وحدانیت کے بارے میں کسی مباحثے میں گرمجوشی دکھانا دوئی کی نشانی اور دوئی کی ترجمانی ہے۔

کچھ لوگ سوال کرتے ہیں کہ روحانی حالت حاصل کرنے کے لیے کب تک کوشش کرنی چاہیے؟

”جب تک یہ آپ کی فطرت اور طبیعت کا حصّہ نہ بن جائے اور کوشش کی ضرورت ختم نہ ہو جائے۔“

روحانیت کے لیے انسان درکار ہوتا ہے کوئی جانور یا درخت روحانیت حاصل نہیں کر سکتا۔ کچھ لوگ ”انسان“ کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ ”انسان ایک ایسا جانور ہے جو اوزار استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔“

میں کہتا ہوں کہ انسان وہ جانور ہے جو اپنے وجود کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر کے روحانی سربلندیوں پر پہنچ سکتا ہے۔

زبان جب سچ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے تو ”حق“ کی آواز بن جاتی ہے۔

خدا ایک ڈرامہ نگار ہے جو ایک ڈرامہ لکھنے کے بعد خود بھی اس کے کرداروں میں شریک ہو جاتا ہے۔ خدا نے اس کائنات کا اوپرا (Opera) خود تیار کیا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی۔

عبادت کے وقت آنکھیں بند کر لینے سے آدمی نیند میں اتر جاتا ہے۔ آنکھیں کھلی رکھنے سے توجّہ قائم نہیں رکھ سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ آنکھیں نیم وا رکھے۔ آدھی کھلی اور آدھی بند (بڑے روحانی بزرگوں کی تصویروں میں اسی طرح سے دیکھا ہے)۔

ہر وقت بیدار رہنے سے آدمی تھک کر سو جاتا ہے۔ سوئے رہنے سے تھک کر بیدار ہو جاتا اور ہے۔ قوّت اور چستی اور جمود اور کاہلی کا ردِّ عمل ایک سا ہوتا ہے۔

اگر میرے سامنے دو راستے ہوں کہ اصول کی پاسداری کر یا بھگت لوگوں کی سنگت میں رہو تو میں نیک لوگوں اور انعام یافتہ لوگوں کی معیّت میں رہنا پسند کروں گا۔

عمل، علم کے لیے ایندھن کا کام دیتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ علم کا الاؤ روشن رہے تو اس میں عمل کا تیل ڈالتے رہیں۔ ایسا نہ ہو تو اس کی روشنی ماند پڑ جائے گی۔

بیکار اور فضول چیزوں کا علم حاصل کرتے رہنا، اپنے آپ کو پریشان کرنا اور ارفع درجات کے حصول سے محروم رکھنا ہے۔

سائنس نے غضب کے حساس آلے ایجاد کیے ہیں جو دور دراز کے ستاروں کی حرارت تک ناپ لیتے ہیں، لیکن افسوس سائنس کے پاس ایسا کوئی آلہ نہیں جو روح کے اندر کی سرگوشی سے روشناس ہو سکے۔

نیکی اور بدی کبھی بھی اکیلی نہیں آتیں۔ دونوں اپنے ساتھ اپنا ڈھیر سارا ساز و

سامان اور اسباب لے کر آتی ہیں اور ہماری ساری زندگی پر چھا جاتی ہیں۔

خواتین و حضرات! میں دُعا کی بابت پہلے بھی کئی بار عرض کر چکا ہوں۔ دُعا انسان اور اس کے پروردگار میں ایک خوبصورت رشتہ ہے جو ازل سے ابد تک رہے گا۔ دُعا ان ہی کی ایک بہت ہی طاقتور قسم ہے جو ایک عام شخص آسانی سے خود میں پیدا کر سکتا ہے۔ دُعا کا انسانی زبان اور انسانی جسم پر ایسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے غدودوں کے عمل کا ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلسل دُعا کے بعد بدن میں ایک طرح کی لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ ذہنی قوّت عُود کر آتی ہے۔ سکون پیدا ہو جاتا ہے اور انسانی رشتوں کے گہرے اور دور رَس عوامل سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ سچّی عبادت دِلی دُعا اصل میں زندگی کا چلنا ہے۔ سچّی اور راست باز زندگی دُعا سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔

دُعا انسان اور اللہ میاں کے درمیان عاجزی پر مبنی سرگوشیوں کا نام ہے۔ ایک انسان جو دُکھ اور کرب یا خوشی میں آسمان کی طرف دیکھ کر دُعا کرتا ہے اس خوبصورت روحانی سرگوشی کو ماپنے یا جاننے کے لیے کوئی آلہ ایجاد ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ انسان اور اللہ تعالیٰ کے مابین ایک خفیہ معاملہ ہوتا ہے۔ روح کی اس سرگوشی کا نام دعا ہے جس میں ایک معمولی سا بندہ اپنے خالق سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔

ہم کو اپنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی مشکلات کے لیے بھی دُعا کرنی چاہیے اور بڑی افتادوں کے لیے خدا سے درخواست کرنی چاہیے۔ ایک مرتبہ ہم کراچی جارہے تھے اور میرے بڑے بھائی کو سمہ سٹہ کے بعد زکام کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ اس کا چھینکیں مار مار کر بُرا حال ہو گیا۔ اس کی ناک جھرنے کی طرح بہہ رہی تھی اور میں خدا سے دُعا کر رہا تھا یا اللہ کہیں سے ایک رومال مِل جائے یا ایک چھوٹا تولیہ عنایت ہو جائے کیونکہ اس نے تو زکام کی وجہ سے اپنا سارا دامن بھگو لیا ہے۔ میرا بھائی مشکل میں تو تھا ہی لیکن ساتھ ساتھ ہنستا بھی جاتا تھا کہ بیوقوف ایسی معمولی دُعاؤں کی شنوائی نہیں ہوا کرتی۔

اگلے اسٹیشن پر میٹھی گولیاں بیچنے والا ایک شخص اندر داخل ہوا اور میرے بھائی کو دو چھوٹے تولیے دے کر کہنے لگا یہ آپ کے لیے ہیں اور گولیاں گاہکوں کے لیے پھر اس نے اپنی میٹھی گولیوں کی تعریف میں شعر او کلمات سُنا کر لوگوں کو اپنا سودا بیچا اور ہم سے رومالوں کی قیمت لیے بغیر اگلے اسٹیشن پر اتر گیا۔

میری مصروفیت کا عالم یہ ہے اور مجھے اس قدر کام ہیں کہ نماز کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ میں کیا کروں؟ خدا سے دُعا کروں کہ یا اللہ میرے وقت نہ ملنے کے گناہ کو معاف کر اور مجھے عبادت کے لیے وقت عنایت فرما۔ وقت مِل جائے گا۔

اصل میں بات یہ ہے کہ شیطان ہم پر اتنے کاموں کا بوجھ ڈال دیتا ہے اور ہر

وقت ڈالتا رہتا ہے تا کہ ہمیں خدا کی عبادت کا وقت نہ مِل سکے۔ وہ اپنے پُر کشش فلسفے سے انسان کو ورغلاتا ہے اور بسا اوقات کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔

شیطان کا ایک باقاعدہ ضابطہ اخلاق ہے اور ایک پورا فلسفہ ہے جس کو وہ ہر اس شخص پر بڑی وضاحت اور صداقت کے ساتھ کھولتا ہے جو اس کے قریب آتا ہے، ابلیس 'فرماتا' ہے کہ یہ ساری تخلیق بدی ہے۔ انسان برائی اور بدی کا پابند ہے اور برائی بھی خدا ہی کی پیدا کردہ ہے اور اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) یہ چاہتا ہے کہ انسان بدی میں مبتلا ہو۔ ذلیل و خوار ہو۔ پگ پگ ٹھوکریں کھائے۔

جو لوگ ان باتوں کو سنتے ہیں اور ان پر غور کرتے ہیں وہ بڑے مزے لے لے کر گناہ کے تصور۔۔۔ دکھ، تکلیف، مسلسل آزار (Suffering) سزا و جزا اور خدا کے انصاف کا تذکرہ کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو اس میں مبتلا سمجھتے ہیں۔

شیطان بھی کمال کی چیز ہے۔ وہ گناہ کے خلاف وعظ کر کے بہت سوں کو اپنا چیلا بنا لیتا ہے۔ وہ کچھ اس طرح سے قائل کرتا ہے کہ گناہ اور بدی کا تصور لوگوں کے ذہن میں ایک جذباتی ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ وہ یقین دلا دیتا ہے کہ خدا تمہارے گناہ تو معاف کر دے گا لیکن تمہارے اردگرد پھیلے ہوئے بدکردار لوگوں اور بد اصل انسانوں کو نہیں بخشے گا۔

شیطان کا یہ اخلاقی فلسفے کچھ اس طرح سے شروع ہوتا ہے کہ "لذّت گناہ ہے" یا "حصولِ لذّت بدی ہے۔" پھر وہ بڑی ہوشیاری اور چابکدستی سے اس قول کو اُلٹاتا ہے کہ "ہر گناہ لذیذ ہوتا ہے۔"

یا پھر وہ کہتا ہے، لذّت، راحت، فرحت اور عیش ناقابلِ ترک ہے۔ حصولِ لذّت فطری اور جذباتی چیز ہے۔ انسان راحت کی طرف جاتا ہے۔ تکلیف سے اجتناب کرتا ہے۔ وہ کام کرتا ہے جس سے اس کو خوشی حاصل ہو۔ جب انسان کی فطرت ٹھہری کے وہ لذّت اور راحت کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اس کی فطرت بدی کی طرف مائل ہوئی کیونکہ ہر لذّت گناہ ہے۔۔۔ شیطان کا فلسفہ ہے کہ گناہ کو چھوڑنا ناممکن ہے، اس لیے کہ لذّت کو چھوڑنا ممکن ہے۔ لذّت فطرتِ ثانیہ ہے۔ حصولِ لذّت فطرتِ انسانی ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ جو چیز فطرت پر مبنی ہے، جبلّت کا حصّہ ہے، وہ گناہ نہیں ہو سکتی۔ چلو جی مزے ہو گئے۔ گناہ کا تصوّر ہی ختم کر دیا۔

جو لوگ گناہ کے خلاف اور بدی کے خلاف وعظ کرتے ہیں اور بدی کے خلاف مورچہ لگاتے ہیں وہ مخلوقِ خدا سے نفرت کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر ان کو گندا اور بدبودار سمجھتے ہیں۔ جن کا خیال ہوتا ہے کہ چونکہ لوگ اُن کو اچھا نہیں سمجھتے اس لیے اُن کے مقابل پورا اُترنے کا یہی طریق ہے کہ اُن کو

گندا سمجھا جائے۔

شیطان، خدائی احکام کو عام کرنے میں ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتا بشرطیکہ اس کو یقین ہو کہ وہ ان احکام کی تشریح اپنے ضابطۂ اخلاق کے مطابق کرے گا۔ مثلاً اس کے دلائل اس طرح کے ہوتے ہیں:

"خدا چاہتا ہے کہ آپ حق پر رہیں، راستی کا دامن تھامیں۔"

آپ کا اندر آپ کو بتاتا ہے کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا ناٹھیک ہے۔ آپ کو ضمیر کی روشنی اور اندر کی بو گائیڈ کرتی ہے۔

اگر تمہارے لگتے اور تمہارے بڑے تم کو ایسی بات کہیں جو تمہارا اندر نہ مانے جو تمہارا ضمیر تسلیم نہ کرے تو ان سے کہہ دو کہ پیچھے ہٹ جاؤ جی بزرگو! میرا اندر نہیں مانتا۔

پھر اُن کو بتاؤ کہ میں خدا کا حکم ماننے پر مجبور ہوں تمہارا نہیں۔ ان کو ایک طرف کر کے اس راہ پر گامزن ہو جاؤ جو اندر لطافت پیدا کرے اور تم کو طمانیت کے ساتھ بھر دے۔

سچائی بالکل سیدھی اور سادہ ہوتی ہے لیکن اس میں بلا کی گہرائی ہوتی ہے۔

پیچیدگیاں یا تو ہماری طرف سے آتی ہیں یا شیطان کی طرف سے۔

خواتین و حضرات ! اگر خوش رہنا ہے تو نکتہ چینی کو چھوڑ دیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایک روز ہم کو اسی معیار سے جانچا جائے گا جو معیار ہمارے لیے طے کر دیا گیا ہے۔ دوسروں پر انگلیاں اٹھانے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ جب آپ کسی کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں تو آپ کی تین انگلیاں خود بخود آپ کی اپنی جانب اُٹھ جاتی ہیں۔ پھر فائدہ! آپ کو کسی دوسرے کے نوکر پر نکتہ چینی کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ جب کہ وہ "کوئی دوسرا" خدا کی ذات ہو۔ اگر نوکر اپنے مالک کے حکام کی بجا آوری کر رہا ہے اور اس کے ارشاد پر چل رہا ہے تو وہ جانے اور اس کا مالک، ہم کون ہوتے ہیں۔

ہمیں "چاچا خوامخواہ" بننے زیادہ میٹنگیں کرنے پر، محفلیں سجانے پر اور ڈائیلاگ کرنے پر زور نہیں دینا چاہیے۔ آپ اور میں اصل میں وہ ہوتے ہیں جب ہم تنہائی میں ہوتے ہیں اپنے آپ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہی وقت قیمتی ہوتا ہے اسی میں ہم اپنے خدا سے باتیں کر سکتے ہیں اور اسی وقفے میں اسے پکار کر اپنی خرابیاں دُور کروا سکتے ہیں۔ اللہ ایسا کاریگر ہے کہ وہ آپ کی ساری خرابیاں آن واحد میں درست کر سکتا ہے۔

اللہ سے یہ دُعا کرنی چاہیے کہ اے اللہ ہمیں علم و عرفان سے کُلی واقفیت حاصل

نہ کر سکنے کے غم میں مبتلا نہ رکھ۔ ہمیں تیری ذات پر ایمان لانے کے کسی بڑی دانش کی ضرورت نہیں۔

ہم آسمانوں سے زمین تک کے سفر کے امین ہیں۔ ہم زمین پر اُترنے والے آسمانوں کے نمائندے ہیں اور خلا نورد چاند پر جانے کے لیے زمین کے نمائندے ہیں۔ جب تک ہم زمینی احکامات کے تابع رہتے ہیں ہمارا آسمانوں کا سفر کامیاب رہتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میرا زمین کا سفری بھی کامیاب رہ سکتا ہے جب ہم آسمانی احکامات کے تابع رہیں گے اگر خدانخواستہ ان Signals کے ماننے میں کوئی چوک ہوئی تو ہمارا یہاں کا قیام مشکل میں پڑ جائے گا۔

ایک خلانورد چاند کی پر اُترا ہوا چاند کے وجود میں برمہ چلا کر نیچے کا "بورا" نکال رہا تھا۔ جس قدر وہ کوشش کرتا تھا اسی قدر مشکل پڑتی تھی۔ پھر اس نے نیچے سگنل دے کر کہا "یہ کام خاصا مشکل ہے اور ناممکن نظر آتا ہے میں برمہ چلانا بند نہ کر دوں؟" زمین سے کنٹرولنگ انجنیئر نے کہا "ہر گز نہیں، مسلسل کوشش کیے جاؤ اور نتیجے کا انتظار کرو۔"

خلانورد نے حکم کی پابندی کی اور تھوڑی ہی دیر میں چاند کی سطح کے نیچے سے مطلوبہ مواد نکال لیا۔ اسی طرح خدا سے یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ جناب اب میں آپ کا بتلایا ہوا کام بند نہ کر دوں یہاں کوئی فائدہ تو نہیں رہا۔

زمین سے اُٹھ کر جب میں شٹل کا نظام دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ خلانورد نہ آپس میں جھگڑتے ہیں نہ مباحثہ کرتے ہیں نہ اپنی غیر ضروری اہمیت جتاتے ہیں۔ چھوٹا کام چھوٹا سمجھا جاتا ہے۔ بڑا کام بڑا۔ ہر شخص کو اپنے لیڈر پر پورا یقین ہوتا ہے۔ اس کے احکام پر، اس کے آرڈر پر۔

بہت سے مسلمان اسلام کو اختیار کرنے سے گھبراتے اور ہچکچاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کو اپنانے سے انہیں اس گناہ کو چھوڑنا پڑے گا جس کے وہ عادی ہو چکے ہیں اور جو ان کا جزوِ زندگی بن گیا ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ وہ بہت ہی کمزور ہیں اور ان سے بے راہ روی ترک نہ ہو سکے گی۔ وہ بالکل ٹھیک سوچتے ہیں لیکن اگر وہ اپنی زندگی ساری کی ساری خدا کو سونپ دیں، شیطانی فلسفے کو مسترد کر دیں اور اس سے امداد مانگیں تو وہ ضرور اُن کی مدد کرے گا۔ بڑے گناہ ہی خطرناک نہیں ہوتے، چھوٹے گناہوں کے لیے بھی اس سے مدد طلب کرنی چاہیے۔ اس وقت تک ہم بامراد نہیں ہو سکتے جب تک ہم سچائی کے دامن کو مضبوطی سے نہ پکڑ لیں۔ ہمارے مراقبے اسی وقت ہمیں خیر عطا کر سکتے ہیں جب تک ہم اپنی ذات کو نہ پہچان لیں، اپنے پروردگار کے ہونے کا یقین حاصل نہ کر لیں۔ اپنی ذات کو گھمنڈ و انا سے باہر نکال کر اپنے شفاف وجود کو ہتھیلی پر رکھنے کا کام انسانیت اور روحانیت ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

مرکزِ دُعا

(یہ زاویہ کا آخری پروگرام تھا جو نشر ہوا)

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

جس طرح قرب اور وصال اہم ہے اسی طرح جدائی اور ہجر بھی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جب حضرت یوسف کنعان سے چلتے ہیں اور اپنے باپ کو ہجر کی آگ میں چھوڑ کر آتے ہیں تو مصر کی بادشاہی انہیں ملتی ہے۔

جب ہمارے حضور نبی اکرم ﷺ مکّہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لاتے ہیں تو پھر اسلام کے لیے تقویت کی بڑی ہی نئی راہیں ملتی ہیں۔

جب بادل کا ایک ٹکڑا ایک جگہ پر پوری تنومندی کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور بادل کا دوسرا ٹکڑا جو دوسرے چارج کا ہے لیکن ایک نیگیٹو چارج کا ہے اور دوسرا پازیٹو چارج کا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر تقویت حاصل کرتے ہیں اور جب وہ ملتے ہیں تو بہت زور کی گھن گرج ہوتی ہے۔ اگر وہ الگ الگ رہ کر جُدا جُدا رہ کر اس

حیثیت کو پہنچیں اور اس چارج کو توانائی کو پہنچیں تو وہ کسی کام کے نہیں ہوتے۔ نہ گھن گرج پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی بارش برسانے کے قابل ہوتے ہیں۔ بس بانجھ ہی رہتے ہیں۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے کہ ایٹم جو نہ نظر آنے والی چیز ہے۔ جب مرکزے کے گرد گھومنے والا الیکٹرون کو مرکزے سے جُدا کیا جاتا ہے تو اس سے کتنی بڑی طاقت پیدا ہوتی ہے اور اس طاقت سے کیسے کیسے کام لیے جاتے ہیں۔

وصال اور قربت ہی اہم اور اور طاقتور نہیں ہے۔ جدائی اور ہجر بھی بہت زیادہ تقویت عطا کرتا ہے۔ ذرّے سے لے کر حیوان تک، حیوان سے لے کر انسان تک، اس میں بڑی خوبیاں پنہاں ہیں۔ بہت اچھا ہوا آج خواتین ہی تشریف لے آئیں اور آج مردوں میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے بہت پہلے درخواست کی تھی لیکن میری درخواست کو شرفِ قبولیت مشکل سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے لوگ بڑے محبّت والے ہیں۔ ان سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ لوگ مجھ سے بڑے خلوص کے ساتھ ملتے بھی ہیں لیکن انسان میں ایک تجسس ایسا ہوتا ہے اور وہ مزید سے مزید کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔

میں نے ایک دفعہ آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ اپنی دُعا کو مضبوط اور مقبول بنانے کے لیے ایک ایسا طریق اختیار کریں جو میں نے اپنے طور پر بنایا ہے۔ وہ یہ

کہ آپ اپنی دُعا عرضی کی صورت میں لکھ لیا کریں کہ میرے پیارے اللہ میاں جی! مجھے یہ مشکلات ہیں۔ مہربانی فرمائی جائے۔ اس کاغذ پر دستخط کر کے نہایت احتیاط سے رکھ لیا کریں۔ جب اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ کرنی ہو تو اس میں مزید لکھ لیا کریں اور اس دُعا پر پکار رہیں۔ اس عرضی کو آپ کسی بھی کاغذ پر اور کسی بھی سیاہی اور قلم سے لکھ سکتے ہیں۔ کسی بہانے میں پڑے بغیر بس مدُعا لکھنے بیٹھ جایا کریں۔

آج آپ خواتین تشریف لے آئی ہیں اور آپ سے ایک بڑی ہی ضروری بات کرنی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب پروگرام میں کچھ بیبیاں ہوں تو ان سے کیا بات کی جائے۔

ہم معاشی دباؤ اور مشکلات سے نبرد آزما رہتے ہیں اور انسان ہونے کے باعث ہماری خواہشیں بھی بہت ساری ہیں۔ ہماری آرزوئیں بھی ہیں۔ ہم انہیں پورا بھی کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اللہ سے یہ درخواست بھی کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں پورا کیا جائے۔

جب عرضی لکھیں یا دُعا کریں تو یہ ضرور کیا کریں کہ ”اے اللہ میاں! ہماری خواہشوں کو ایسے پورا کر کہ یہ آپ کو ناگوار بھی نہ گزریں اور اس فریم ورک کے اندر بھی رہیں جو آپ نے بنایا ہوا ہے۔“ میں ایک بار پھر اس بات کو دہراتا

ہوں کہ اچھا ہوا آپ تشریف لے آئیں۔ آپ عملی طور پر کچھ کریں بجائے اس کے اخباروں میں Letter to the Editor لکھیں کہ ہمیں یہ یہ مشکلات ہیں، انہیں دُور کیا جانا چاہیے۔

میں آپ سے پہلے بھی کہا کرتا ہوں کہ حکومتوں کو معاف ہی رکھیں۔ انہیں اپنے کام کرنے دیا کریں اور معاف ہی رکھیں۔

ہمارے پاس اپنی بھی تو ایک طاقت ہوتی ہے جو بڑی مستحکم اور روحانی انداز کی ہوتی ہے اور بڑی تنومند ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایسا ہو سکے اور ایسا ضرور ہونا چاہیے کہ آپ لوگ اپنے گلی محلّے میں کوئی ایک ایسا گھر جن کے جہاں ذرا بیٹھنے کی آسانی ہو ایک چھوٹا سا فرش دُعا یا مقام دُعا بنائیں اور اس میں اپنے ساتھیوں کو جو اس محلّے کے قریب ترین ہوں اور وہاں رہنے والی ہوں، انہیں اس دُعا میں شامل ہونے کی دعوت دیں۔

آپ اس مقصد کے لیے کوئی ایک دن چُن لیں۔ چاہے بدھ رکھ لیں، منگل یا جمعرات۔ آپ وہاں شام کے وقت آئیں اور لوگوں کی مدد کرنے کے لیے اور انہیں تقویت عطا کرنے کے لیے ایک جگہ پر جمع ہوں اور جب وہاں جمع ہو چکیں تو آپ کے اس مرکز میں لوگوں کو پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں پر اجتماعی دُعا کرتے ہیں۔ دیکھئے ہم بزرگ یا بابے نہیں لیکن جب ہم مل جاتے ہیں

تو بڑی Powerfull چیز بن جاتے ہیں اور اس طرح اجتماعی دُعامیں برکت ہوتی ہے۔

اس دُعامیں آپ کے گلی محلّے کے لوگوں کی کچھ عرضیاں، کچھ خط موجود ہونے چاہئیں۔

ان دِنوں بچّیوں کی شادیوں میں بڑی دقتیں پیدا ہو رہی ہیں اور ماں باپ کو اس صورتحال میں بڑی تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب ان مرد حضرات کو کیا کہیں اللہ انہیں بہت ساری ہدایت دے یہ کچھ ایسے تقاضے کرتے ہیں اور اُن کی کچھ ایسی آرزوئیں بڑھ گئی ہیں اور ان کی خواہشات میں اضافہ ہو گیا ہے کہ اُن کی اِن بڑھتی ہوئی خواہشات کے باعث بچّیوں والے گھروں میں کچھ عجیب طرح کی مایوسی کا سماں پیدا ہو گیا ہے۔

اس مرکزِ دُعا یا فرشِ دُعا پر جمع ہو کر آپ کو تھوڑا سا وقت دینا ہے۔ اس کا آپ کی اپنی ذات کو بھی فائدہ پہنچے گا اور اجتماعی طور پر ارد گرد کے لوگوں کو بھی۔

جب آپ اکٹھی ہو کر بیٹھیں گی اور ایک مراقبے کی صورت میں، جیسے آدمی سر جھکا کر بیٹھتا ہے۔ اس مراقبے میں کچھ زیادہ لکھائی پڑھائی نہیں کرنی۔ لمبی لمبی آیات بھی اس میں نہیں پڑھنی۔ وہاں پر ایک بی بی لوگوں کے دُکھ، مسائل اور

مشکلات پر مبنی عرضیاں پڑھنے کی ذمّہ داری لے جیسے ٹی وی پر بیبیاں خطوں کے جواب دیتی ہیں۔ وہ بی بی ایک ایک خط پڑھے کہ فلاں بی بی صغریٰ نے لکھا ہے کہ میری بیٹی کی شادی نہیں ہو رہی۔"یا"نذر صاحب نے لکھا ہے کہ میرے بیٹے نے میٹرک کا امتحان دیا ہے اس کے پرچے اچھے نہیں ہوئے بجائے اس کے کہ وہ کچھ غلط رُخ اختیار کرے، آرزو یہ ہے کہ وہ دُعا کے ذریعے پاس ہو جائے۔ وہ خط، عرضیاں یا رقعے اللہ سے درخواست کے انداز میں پڑھ جائیں۔ میں بیبیوں کو اس لیے مخاطب کر رہا ہوں کہ اللہ نے ان کے دل اچھے بنائے ہیں اور ان میں رحمدلی کا جذبہ ذرا زیادہ ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہے نا نہ نرسیں جو ہوتی ہیں، یہ لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ ہماری ایئر ہوسٹس بھی بیبیاں ہوتی ہیں۔ اگر اُن کی جگہ بندے ہوں تو کسی کو پانی بھی نہ دیں اور لوگ بھوکے پیاسے ہی مر جائیں۔ اُن کے دل میں ہمدردی کا ایک خاص عنصر رکھا ہوتا ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہمارے ایک بہت اچھی فوک سونگ گانے والے دوست نیازی صاحب تھے۔ ہم انہیں پہلی دفعہ لے کر ڈھاکہ گئے۔ تب جہاز کے راستے سے وہاں ہو کر پہنچے تھے۔

اُن کے پاس ایئر ہوسٹس آئی۔ اس نے انہیں پہلے پانی دیا۔ پھر لا کر چائے دی۔

پھر وہاں کسی نے تکیہ مانگا، کسی نے پانی، وہ کافی دیر تو دیکھتے رہے پھر غصّے سے اسے مخاطب ہو کر کہنے لگے "تو نوکر لگی ہوئی ایں لوکاں دی۔ آپے جا کے پانی پین بھاویں نہ پیئین، تینوں کیہہ۔" (آپ کسی کی نوکر ہو۔ جس نے پانی پینا ہے خود ہی جا کر پی لے۔ آپ کو اس سے کیا۔)

وہ لڑکی اُن کی بات سُن کر اتنی خوش ہوئی کہ وہ پھولے نہ سما رہی تھی۔ اس نے اُن سے کہا کہ "باباجی یہ میری ڈیوٹی ہے۔"

لیکن وہ پھر کہنے لگے کہ "ایسی کیہڑی ڈیوٹی۔ کڑی نوں بھجا بھجا کے مار سٹیا اے۔"

(یہ خاک ڈیوٹی ہے کہ لڑکی کو بھگا بھگا کر مار ڈالا ہے)۔

خدا نے خواتین کو خاص جذبہ دیا ہوا ہے۔ اگر اس طرح کی اجتماعی دُعاؤں کا ایک مرکز ایک بی بی کے علاقے میں ہو، ایک کسی اور بی بی کے علاقے میں ہوا اور اُن مراکز میں سب انفرادی طور پر نہیں بلکہ مجتمع ہو کر اللہ میاں سے دُعا کریں کہ "یا اللہ! ہم تیری ہی مخلوق ہیں اور تیرے نبی کی اُمّت میں سے ہیں۔ تیرے پاس ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔ آپ ہماری فلاں عرض کو مان لیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

اس میں کئی قرض کی ادائیگی کی عرضیاں ہوں گی، کسی کی کوئی اور مشکلات ہو سکتی ہیں۔ اس کی طرف توجّہ ہم نے دی نہیں ہے اور ہر طرف سے کوششیں کی جارہی ہیں۔

سیاسی طور پر انتظامی طور پر ہم بھرپور کوششیں کر رہے ہیں لیکن انسان خالی سیاسی یا انتظامی جانور نہیں ہے۔ یہ خالی جسمانی جانور نہیں ہے۔ یہ روح بھی رکھتا ہے اور اس کی روح کے تقاضے بھی پورے ہونے چاہئیں۔ جب تک روح کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے یہ خالی خالی رہے گا یہ "تھوتھا" رہے گا اور اس کی کمی کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔

اب میری طرح سے آپ کی بھی اس طرح کے مرکز دُعا کے بنانے کی ایک خواہش بن جانی چاہیے۔

خالی مراقبہ اپنی جگہ پر بڑی اچھی چیز ہے لیکن جب آپ کسی کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں تو پھر وہ مدد کا رُخ آپ کو بھی تقویت عطا کرتا ہے اور اس شخص کو بھی جس نے مدد کی طلب گاری آپ سے کی ہوتی ہے۔ اس عمل سے ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آسکتے ہیں۔

ہمیں ایک دوسرے کے قریب رہنے کا بہت بڑا حکم ہے۔ ہمیں صلۂ رحمی سے

کام لینے کا حکم ہے۔ آپ یہاں بیٹھ کر روانڈا میں ظلم دیکھ کر جب افسوس کرتی ہیں تو یہ خالی خولی ہمدردی کی بات نہیں ہوتی۔ آپ ایک طرح سے صلۂ رحمی کے حکم کی پیروی بھی کر رہی ہوتی ہیں۔

ہم میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم دور دراز کے واقعات پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں لیکن ہماری ماسی کی بیٹی جو لاہور ہی میں رہتی ہے اور جس سے ملے ہوئے اڑھائی سال کا عرصہ گزر گیا ہے دوری کی وجہ یہ ہے کہ وہ غریب ہے اور بچّوں کے ساتھی غریب علاقے میں رہتی ہے اور میرے پاس اتنی مصروفیت ہے کہ میں اسے مل ہی نہیں سکتا۔

حکم یہ ہے کہ وہ ایک رحم (Womb) سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ بھی حوا کی بیٹی ہے، جیسا کہ ہم سب حضرت مائی حوا کے Womb سے پیدا ہوئے ہیں اور جو میری دادی ہے اس کی جو اولاد ہے وہ مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے پہلے اس کی خبر لینی چاہیے پھر دوسروں کی پھر اس سے آگے اور آگئے۔۔۔۔۔۔

میری جو ماسی (خالہ) کی بیٹی صغریٰ ہے، میں اس کی مالی طور پر کچھ مدد کر سکتی ہوں لیکن ایسا ہو نہیں پاتا ہے۔ جب آپ اللہ سے درخواست کرتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ آپ کوئی درخواست لے کر اللہ کے "کھیڑے" پڑ جائیں، اس کے پیچھے ہی پڑ جائیں، جس طرح بچّے اپنے والدین کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ بچّوں

کی طرح درخواست کریں، بلکیں اور اپنی بات منوا کر ہی چھوڑیں۔ جب آپ کسی بے یارومددگار اور اکیلے شخص کی مشکل کے لیے دُعا کریں گے تو اس شخص کو اُمّید اور تقویت عطا ہوئی کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے لیے کئی لوگوں نے بغیر کسی لالچ اور غرض کے دُعا کی ہے۔

آپ نے میری باتیں بڑی محبّت کے ساتھ سُنی ہیں اور بڑے خلوص کے ساتھ مانی ہیں۔ اس پروگرام (زاویہ) کو بہت تقویت جو عطا کی ہے وہ اس کے دیکھنے والوں اور اسے پسند کرنے والوں نے عطا کی ہے۔ ہم سے تو کوئی ایسی بات نہیں ہو سکی۔ بس ٹوٹی ہوئی عمارتیں اور دیواریں تعمیر کرتے رہے۔ کوئی بات یا کام یا عمارات مکمل کر پائے۔ بس کام درمیان میں ہی چھوڑ جاتے تھے لیکن ان کی تزئین و آرائش کرنے اور سجانے والے آپ تھے اور میری ٹوٹی عمارتوں کو اس طرح سے آپ لوگوں نے محبّت سے بتایا کہ میرا بھی مان رہ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کے لیے جو کیمرہ چلاتے رہے، لائٹیں دیتے رہے اور دوسرے تکنیکی امور سے وابستہ ہے اور بڑی محنت سے اور محبّت سے کام کرتے رہے اور دیکھنے والوں نے بھی ان کی محبّت کا بڑی محبّت سے جواب دیا ہے۔ ایسا عام طور پر بہت کم ہوا ہے۔ یہ ہمارے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔

اب مجھے آپ کو یہ یقین دلانا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اس پروگرام کو ہم لے کر چلتے

رہیں گے۔ یہ آپ کی امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق رہے گا لیکن میں نہایت دست بستہ انداز میں عرض کرتا ہوں کہ میں اب کچھ تھک گیا ہوں اور میں آپ سے تھوڑی سی چھٹی چاہ رہا ہوں اور فراق جس کا میں آغاز میں ذکر کر رہا تھا یہ بھی برداشت کرنا پڑے گا۔

(پروگرام میں ایک محترمہ گویا ہوتی ہیں)

یہ ہماری آج کی Life جو بڑی ہی Active ہو چکی ہے، اس میں اگر ہم تھوڑے سے لمحات نکال کر اپنے بارے میں سوچیں۔ اپنی ذات کو اگر Collect کریں تو شاید ہمارے کافی مسائل حل ہو جائیں گے۔

اشفاق احمد: بچّے، میں اسی لیے پہلے آپ پر ایک شرط لگا کر جا رہا ہوں کہ آپ اپنی ذات میں اور مرکزِ دُعا میں اس طرح مصروف ہو جائیں کہ مجھے آسانی کے ساتھ Replace کر سکیں۔

ایک تو میری اب عمر بھی اتنی نہیں رہی اور پھر کی نہ کسی کو تو آگے آنا ہی ہے نا۔ یہ آپ نوجوان لوگوں کا کام ہے۔ یہ اچھی رسم چلتی رہنی چاہیے۔ میں تو اس پروگرام میں گفتگو کرتا تھا۔ آپ انشاء اللہ لوگوں کو عملی طور پر مدد اور تقویت فراہم کریں گی جو کہ میں نہیں کر سکا۔ وہ زیادہ اچھی بات ہو گی۔

مجھے یقین ہے کہ لوگوں کو بھی اس بات کا یقین ہونے لگے گا کہ ہمارا بھی کوئی ہے۔ اس سے ان کے اندر اعتماد اور ایمان اور یقینِ محکم کی فضا پیدا ہو گی اور وہ زیادہ استقلال کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آ سکیں گے۔ ہماری سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکے ہیں۔ ہم نے پانچ سالہ منصوبے بنائے ہیں، کئی پروگرام بنائے ہیں لیکن قریب نہیں آ پائے ہیں۔ جس محلّے میں لوگوں کے لیے اجتماعی طور پر دُعا ہو گی وہ تو بڑا ہی خوش نصیب محلّہ اور ارفع کوچہ ہو گا۔

اب میں سب کچھ اور عمل کی راسیں آپ کے ہاتھ میں چھوڑ کر جا رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس کو بہتر انداز میں اور بڑی تقویت کے ساتھ اس وعدے کو نبھا پائیں گی۔

اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اللہ آپ کو بہت ساری آسانیاں عطا فرمائے۔ اللہ آپ کو بے شمار اور بے شمار آسانیاں تقسیم کرنے کے مواقع عطا فرمائے تاکہ آپ یہاں بھی خوش رہیں اور مابعد جب تشریف لے جائیں تو وہاں بھی آپ کے لیے انعامات کی لہریں "ٹھاٹیں" مار رہی ہوں۔ اب میں آپ سے رخصت چاہوں گا اور آپ کو پھر ایک مرتبہ دُعا دوں گا کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

''زاویہ سے زاویہ تک''

خاں صاحب کے پاس اُن کے بچپن، لڑکپن، جوانی کی چھوٹی چھوٹی شوخیاں۔ حرص بھری ادائیں، ننھی منی ضدیں تھیں جنہیں وہ لوریاں سُنا سُنا کر سلایا کرتے تھے اور یہ یادیں ان کے کالر کے کونوں سے کھیلتی رہتی تھیں اور یوں کھیلتے کھیلتے خاں صاحب اور یہ یادیں سو جاتی تھیں۔ پھر ''زاویہ'' پروگرام کہیں سے آ گیا اور ان یادوں نے چشمے کے سُتھرے پانیوں میں آنکھیں کھول کر خاں صاحب سے پھر توجّہ چاہی۔ زاویہ جاری رہا۔ سامعین، ناظرین اور خاں صاحب آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ پھر ''زاویہ'' کے آسانیاں تقسیم کرنے والے نے آنکھیں موند لیں اور میرے ارد گرد وہ کاغذات بکھر گئے جن پر اُن کی یاد دہانی کر یدنے والی سوچ اور ارتعاش پیدا کرنے والی یادیں تھیں۔ وہ اس بکھرے مواد کو کیسے ڈھالنے والے تھے، یہ تو اب پوچھا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس سارے مواد کو دیکھ کر میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ خاں صاحب نے ٹیلیویژن کے میڈیا کے توسط سے ایک خاص قسم کا audience تلاش کر لیا تھا۔ وہ ملک کے اشرافیہ سے غالباً

مخاطب نہ تھے جو اسراف پسند، عیش طلب، پیسے کے بل بوتے پر دنیا کو جنّت بنانے پر عموماً بضد نظر آتے ہیں۔ وہ اُن غریب مفلوک الحال، بے آسرا، بے سہارا لوگوں سے بھی گفتگو نہ کرتے تھے جنہیں نہ صرف عزّتِ نفس کے لالے پڑے رہتے ہیں بلکہ جو روٹی، کپڑا اور مکان کے مرحلوں سے بھی فارغ نہیں ہو پاتے۔

وہ تو ایسے لوگوں سے روادارانہ انداز میں باتیں کرتے جو سیلف میڈ ہونے کے چکر میں تھے۔ ایسی مڈل کلاس جو ماضی اور مستقبل کے درمیان کھینچی ہوئی رسّی کی طرح تناؤ زدہ تھی۔ جس کا ایک سِرا ماضی سے بندھا اور دوسرے سِرے کی گانٹھ مستقبل کی کھونٹی سے ٹنگی تھی۔ ہر وہ انشورنس جو اس نے کبھی ماضی میں کی تھی، صرف مستقبل میں ادا ہونے والی تھی۔ حال فقط ادائیگی کا لمحہ تھا۔ مستقبل کے تحفظ کی خاطر ماضی میں سوچتے ہوئے منصوبوں پر ذہنی، جسمانی، روحانی، نفسیاتی جو بھی لاگت آتی، اس کا بوجھ سلف میڈ آدمی کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ انسان جو کچھ سیکھتا ہے، تقابل سے یہ جانکاری حاصل کرتا ہے لیکن کبھی کبھی مسابقت اندر ہی اندر کُہرے کی طرح سرد بھی کر دیتی ہے۔ آدمی ترقّی

کے زینے پر چڑھنے کے لیے جن لوگوں کے پاؤں چل کر آگے جانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اُن کے مجروح چہرے اس کے کمپیوٹر کی یادداشت میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سیلف میڈ آدمی چونکہ نیچے سے اُوپر چڑھتا ہے، اس لیے نیچے کی یاد احساسِ جرم بن کر ساتھ رہتی ہے۔ جب بھی وہ اپنے غریب رشتہ دار، بھولے بسرے کم حال دوست، چپڑاسی، ملازم رکھتا ہے، ان سے بے اعتنائی برتتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو، اس روپ کو reject کرتا ہے جو ان لوگوں کی شکل میں اس کے روبرو آ جاتا ہے۔ گھر کے اندر محنت کے فانوس جگا کر اپنے اردگرد سمجھوتے کی فضا قائم کر کے سیلف میڈ انسان اپنے گلے میں کشمکش کا تعویذ، بازو پر دُکھ کا امام ضامن اور کلائی پر کسی ایک وقت میں مقید گھڑی باندھے رکھتا ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ خان صاحب ایسے لوگوں کے تسمے کھول، بوٹ اُتار، پسینے میں شرابور جرابیں پیروں سے جدا کر انہیں ہولے ہولے پنکھا جھلتے ہیں۔ یادوں کی لوریاں سُنا کر سلانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اپنی ذات میں گم، راہوں پر گم گشتہ آہستہ آہستہ اُن کے کالر سے کھیلنے لگتا ہے اور پھر دونوں کو نیند آ جاتی ہے۔ ایک ہمیشہ کے لیے سو جاتا ہے اور دوسرا چشمے جیسی شفاف آنکھیں کھول

کر پوچھتا ہے ”بھئی! زاویہ کی تیسری جلد کب آئے گی، آپ فون کر کے پوچھ تو لیں؟ سنگِ میل والوں کو!“

۷ اپریل ۲۰۰۶ء

بانو قدسیہ

داستان سرائے

۱۲۱ سی ماڈل ٹاؤن لاہور